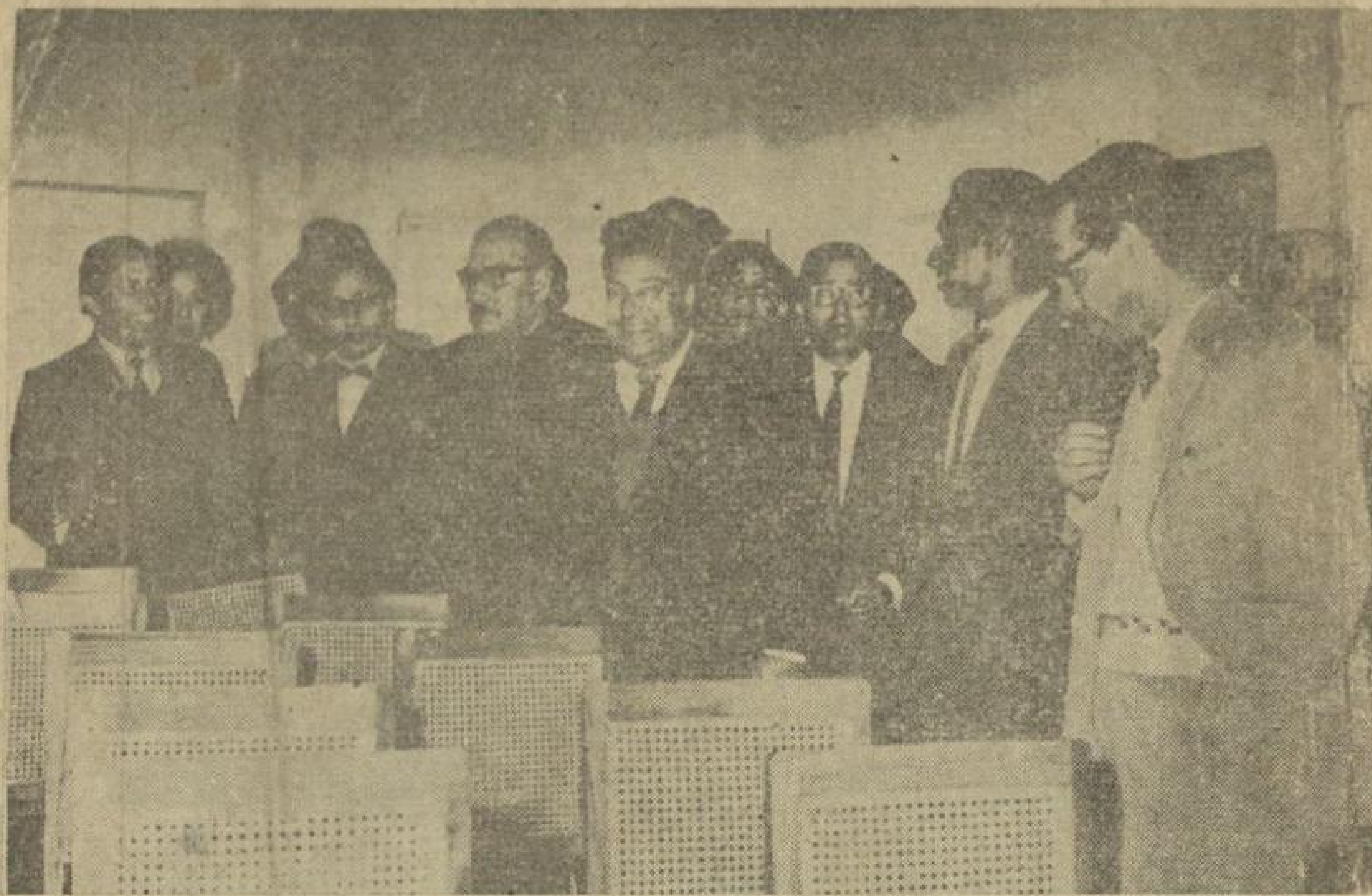
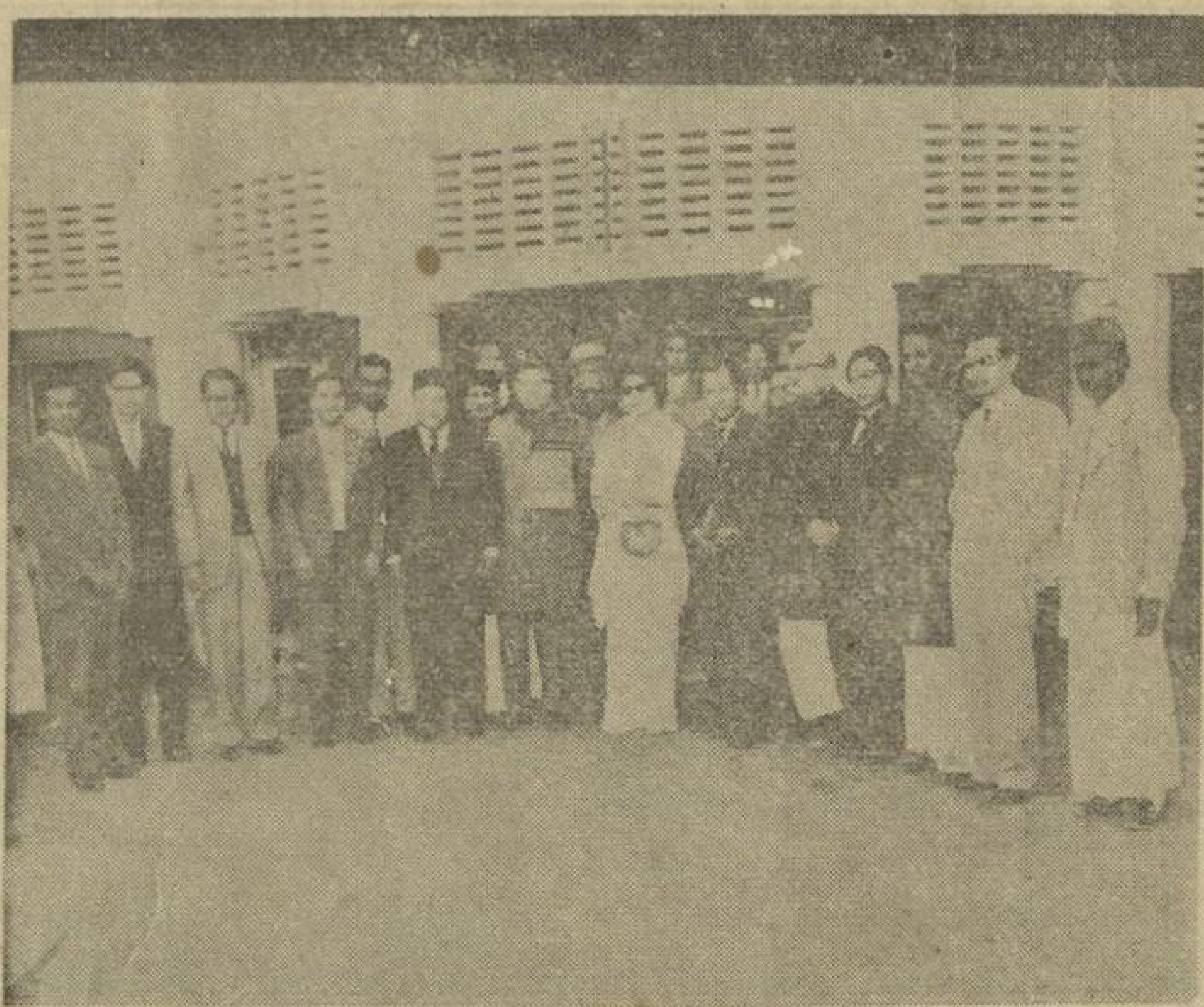
فکر و نظر

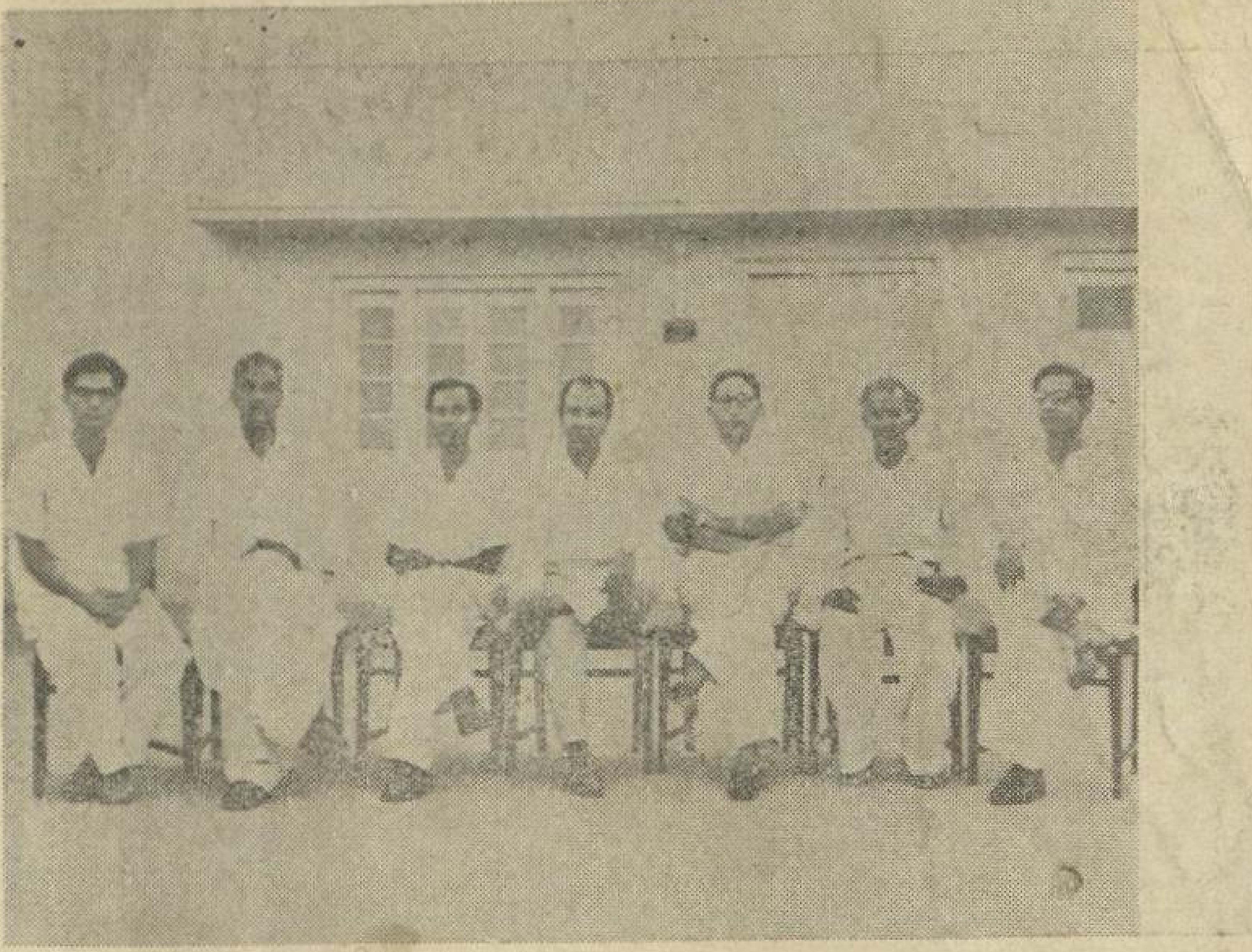
مقالات



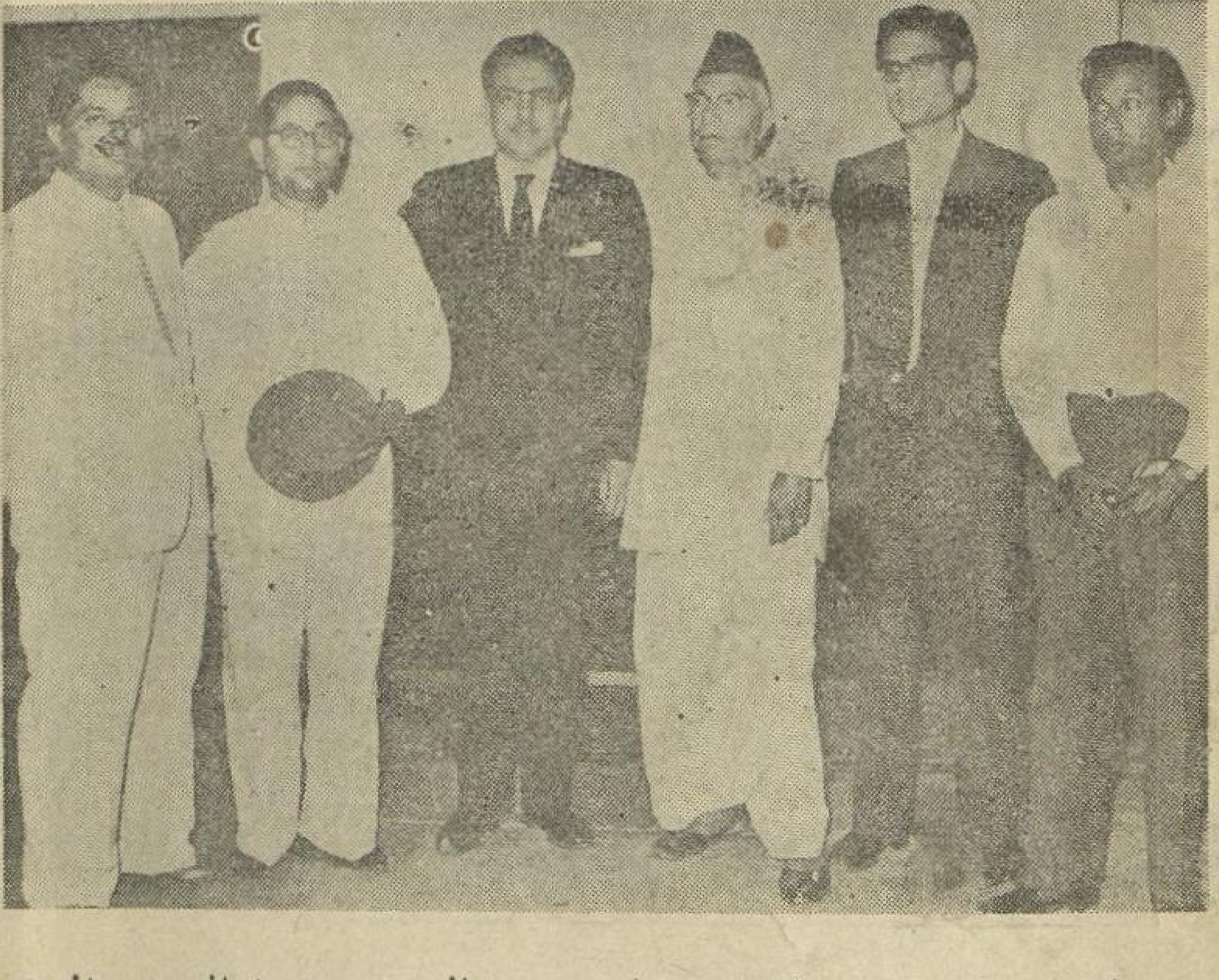
جوش صاحب گلڈ ہاؤس میں: شان الحق حقی - ریاض انور - ساغر صدیقی
ارشد ملتانی مبین الحق صدیقی - جوش صاحب - عرش صدیقی
ثریا زیبا - قتیل شفائی



ملتان کے ادبا و شعرا جوش صاحب (دائیں سے پانچویں) اور احمد ندیم قاسمی
(بائیں تیسرے) کے ساتھ



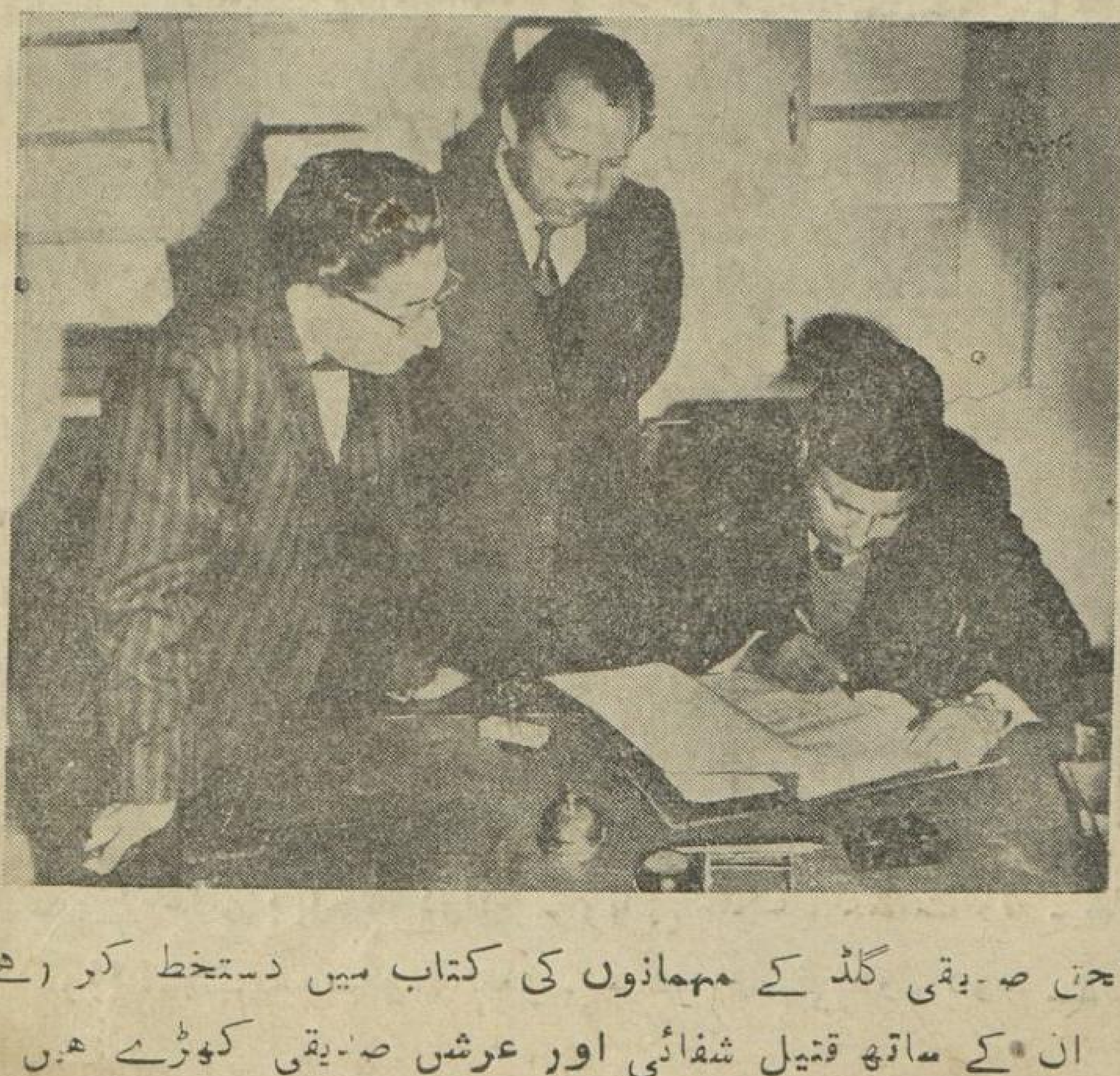
مجلس عاملہ ملتان گلڈ (دائیں سے بائیں) ارشد ملتانی ۔ کشفی ملتانی ۔ عرش
صدیقی سکرٹری قتیل شفائی (سکرٹری مغربی پاکستان) ریاض انور
مہر عبدالحق ۔ مسعود اشعر



ریاض انور ۔ مسعود اشعر ۔ حاجی حمیدالدین ۔ جمیل الدین عالی
(قائمقام سکرٹری جنرل) عرش صدیقی ۔ جمیل الزماں



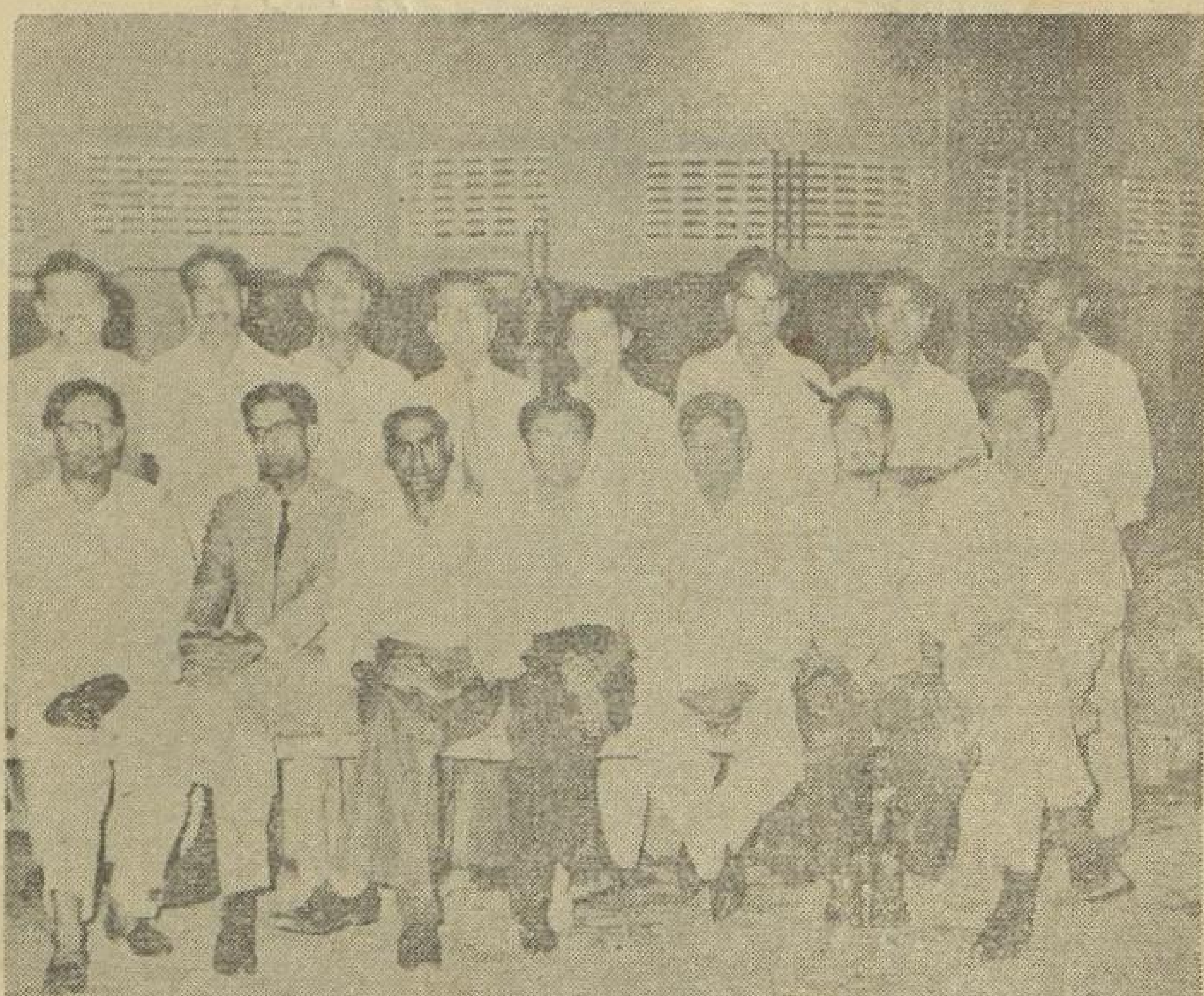
لبنان کے مشہور ادیب حسن الامین گلڈ کے ایک جلسے میں تقریر کر رہے ہیں
دائیں سے بائیں : صوفدار عبدالجبار (بیٹھے ہوئے) عرش صدیقی
ضیاءالحسن موسوی - حسن الامین



مبین الحق صدیقی گلڈ کے مہمانوں کی کتاب میں دستخط کر رہے ہیں
ان کے ساتھ قتیل شفائی اور عرش صدیقی کھڑے ہیں



ملتان ادبا و شعرا قدرت اللہ شہاب سکرٹری جنرل کے ساتھ ریلوے سٹیشن



مرزا ادیب کے ساتھ : احمد درانی - ربانی ملک - حشمت وفا - سلیم اختر
مرزا ادیب - مسعود اشعر - عرش صدیقی اور دوسرے

فکر و نظر

(مقالات)

ابن حنیف
افتخار حسین شاہ
عین الحق فرید کوٹی
قدرت نقوی سید

ابن حنیف

سیمی رامس

تاریخ کی پُراسرار ملکہ

”جہاں تک راقم کو معلوم ہے اس پُراسرار ملکہ کے چہرے سے تاریخ یا آثار کی روشنی میں اردو میں اب تک نقاب کشائی کی کوشش نہیں کی گئی۔ حالانکہ زمانہ قدیم کا یہ وہ مشرقی نسائی کردار ہے جو دنیا خصوصاً مغرب میں آج غالباً سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہے۔ اس حسین ملکہ کی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک سراسر افسانوی اور دوسرا تاریخی اور حقیقی۔ عام لوگوں کو اس کی حقیقی تصویر سے بہت کم واقفیت ہے۔ میں نے اس کے دونوں پہلو یہاں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جو کہانیوں میں نظر آتا ہے اور وہ بھی جو آثار سے ابتک جتنا کچھ بھی معلوم ہو سکا ہے۔“

کرۂ ارض کے معروف اور شاداب ہلالی خطّے یعنی عراق میں سومیری، اکادی، بابلی، کسدی، کلدانی، متانی اور اشوری سلطنتیں اور یہ نامور تہذیبیں ابھریں، پھولیں اور

بھر دم توڑ گئیں۔ اشوری قوم اپنے مسلسل عسکری کارناموں کے لحاظ سے یہاں کی پرانی اقوام میں سرفہرست ہے۔ اشوریہ (ASSYRIA) کے بادشاہوں نے اپنی طویل تاریخ میں قریباً ہمیشہ ہی تلوار نیام سے باہر کئے رکھی۔ چنانچہ مصر، شام، تاریخ اور ایران کی . . زبردست حریف حکومت کی رزم آرائیوں سے معمور ہے اور اس پر قتل و غارت کے مہیب طوفانوں کا سایہ پڑتا رہا ہے۔ لیکن خاک اور خون کے ان فتنہ خیز اور ہیبتناک جھگڑوں میں بھی اشوریوں کے ہاں ایک نرم و نازک اور شگفتہ پھول جھومتا مسکراتا نظر آتا ہے اور اس کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے اس دور کی مکدر واقعاتی فضا برائے چندے خوشگوار اور لطیف معلوم ہونے لگتی ہے۔ شکست اور ہزیمت سے آلودہ اس فضا کو فرحت بخش بنانے والا یہ تر و تازہ پھول ہے سمی رامس۔ افسانوں اور نغموں کی سمی رامس —— یہی رامس، جو اکاد، کلدانیہ، بابل اور اشوریہ کے نام آور اور کرخت فرمانرواؤں کی طویل آہنی زنجیر میں ایک سی جگمگاتی طلائی کڑی ہے کہ آنکھوں میں جوت جگاتی چلی جاتی ہے۔ مشرق کے قدیم شاعروں نے اس محبوب اور دلنواز ہستی کے گرد رومان انگیز کہانیوں کا ہالہ بنا دیا۔ کہانیوں اور گیتوں کے دوش پر سوار ہو کر یہ عراق سے نکلی، ایران پہنچی —— اور اس طرف یونان ہوتی ہوئی، فطرت کی یہ اچھوتی غزل —— یہی —— ایک عرصہ بعد سرزمین اطالیہ کی موسیقی نواز روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی اور پھر اطالیوں کے لبوں سے ایسا شیریں نغمہ بن کر پھوٹی کہ بس —— لیکن خود وہ ان ساری رومانی کہانیوں سے بڑھ کر رومان پرور اور ان سب دلکش نغموں سے زیادہ حسین اور من بھا جانے والی ہے۔ بابل کی یہ بادشاہزادی ان افسانوں، ان گیتوں کی فسوں ساز دنیا میں یوں گھری ہے جیسے دور کہیں ان جانی سی دنیا میں، کسی پُر اسرار لیکن دلفریب فردوسی جزیرے کے گرد جل پریاں منڈلا رہی ہوں —— اسے اپنے سہانے پردوں میں چھپائے ہوئی ——

کہانیوں کی سیمی

سیمی رامس اور اس کے روایتی شوہر ننس کے متعلق یونانیوں نے کیٹسیاس (CETSIAS) سے مواد لیا۔ ہیروڈوٹس کی کتاب اوّل کے ابواب ۱۸۵–۱۸۴ میں سیمی کا ذکر ملتا ہے لیکن ڈایوڈورس (DIODORUS) کی دوسری کتاب میں اس کے "حالات" بہت تفصیل سے آئے ہیں ——

وہ شام کے پرانے شہر عسقلان کی دیوی درکیتو[1] (اتار گیتیس) کی کوکھ سے پیدا ہوئی۔ اس کا باپ بابلی دیوتا اونس[2] (نابو؟) تھا۔ ماں تو نوزائیدہ بچی کو چھوڑ کر چلتی بنی مگر قمریاں اس پیاری پیاری ننھی سی جان کے گرد جھوم گئیں۔ اور یہ معصوم، قمریوں اور فاختاؤں کی سادہ سی دنیا میں پلنے اور بڑھنے لگی۔ وہی اسے کھلایا پلایا کرتیں۔ ایک روز یہ سندر کنیا شاہی چرواہے سماس کی نظروں میں آگئی۔ اب وہ اس گڈریے کے ہاں پروان چڑھی۔ جوانی آئی تو اشوریہ کے حکمران ننس کے جرنیل اونس[3] کے ساتھ بیاہ دی گئی۔ وہ نینوا کا گورنر تھا۔

اشوری سلطان ننس لڑنے بھڑنے کا رسیا تھا۔ ہر طرف تلواریں مارتا رہتا تھا۔ اس نے ملک بابل کو زیر کر کے آرمینیا پہ حملہ کیا۔ آرمینیا کا والی برزنس بڑا ہی کائیاں اور زیرک تھا۔ ننس سے ٹکر تو نہ لے سکتا تھا چنانچہ دو ہاتھ کیے بغیر ہی ہار مان لی اور ایسے شاندار تحفے پیش کیے کہ اشوری فاتح خوش خوش لوٹ گیا۔ اب اس نے میڈیہ کو زیر کر لیا۔ اور پھر سترہ برس کے عرصے میں اس نے قریباً سارا ایشیا اپنے قدموں میں جھکا لیا جس میں مصر بھی شامل تھا۔ اس کے بعد ننس نے نینوا آباد کیا، اور باختریہ کی طرف گھوڑوں کا رخ پھیر دیا۔ اس کی فوج ستر لاکھ پیدل، بیس لاکھ سواروں اور دو لاکھ جنگی رتھوں پر مشتمل تھی اور ان رتھوں کے دھروں میں دونوں جانب تلواریں لگی تھیں۔ سیمی بھی سپاہیوں کی آنکھوں کا تارا بنی اپنے شوہر کے پہلو میں گھوڑے پہ سوار

---

[1] درکیتو یا اتار گیتیس مچھلیوں کی دیوی تھی۔ پلینی (PLINY) نے درکیتو اور اتار گیتیس کو ایک ہی قرار دیا ہے۔

[2] ہو سکتا ہے کہ اہل یونان، بابلیوں کے دیوتا نابو کو ہی اودنس کہتے ہوں کیونکہ یونانیوں نے اونس کو دانائی کا دیوتا ٹھہرایا ہے اور نابو کو بابلی عقل و دانش کا دیوتا مانتے تھے۔ [3] بعض جگہ اس جرنیل کا نام منونز بھی آیا ہے۔

چلی سیمی نے اس مہم میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اپنی بے پناہ سندرتا سے سپاہیوں کے دلوں میں آگ بھڑکا دی اور شاہ ننس کو وہ راہیں سمجھائیں جن پر چل کر اس نے باختریہ پر قبضہ کر لیا۔ اشوریہ کا یہ خونخوار بادشاہ بزم کی دنیا کا آدمی نہ تھا مگر سیمی کی ذکاوت، خوبی صورت اور کارناموں سے وہ کچھ ایسا اثر لے بیٹھا کہ اس حسینہ سے اسے گہرا جذباتی لگاؤ ہو گیا۔ ڈایوڈورس اور سکولس (SICULUS) کے بیانوں کے مطابق اسی مہم میں پہلی بار ننس نے اپنے جرنیل کی خوشنما بیوی کو دیکھا اور اس نے اونس سے سیمی کا مطالبہ کر دیا۔ اونس اپنی سیمی کو اسے سونپنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مگر بعد میں جا کر خودکشی بھی کر لی۔ راستہ صاف تھا اور ننس نے حسین بیوہ کو اپنے تاج کی زینت بنا لیا۔ بہت جلد وہ شوہر کے مزاج میں دخیل ہو گئی۔ اتنی کہ باختریہ سے واپسی کے کچھ ہی دنوں بعد ملکہ نے بے چارے محب بادشاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ پانچ دن کے لئے اسے اشوریہ کی خود مختار ملکہ مشتہر کر دے۔ اس غیر معمولی اور انوکھے اعلان کے بعد وہ شاہی پوشاک زیب جسم کر کے تخت پر جلوہ نما ہوئی۔ پہلے دن تو اس نے سب کو شاہانہ ضیافت سے نوازا اور دوسرے روز ننس کو قید کر کے قتل کرا دیا۔ خود مختار ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ شوہر کو شاندار طریقے پر دفنایا اور اس کی قبر پر سوا میل اونچا اور اسی قدر چوڑا مٹی کا تودہ بنوایا۔ اپنے بیٹے ننیاس کی سرپرست بنی جو ننس سے تھا اور بیالیس سال تک حکومت کی باگیں تھامے رہی۔ بابل آباد کر کے میڈیہ پر کامیاب حملہ کیا۔ مصر پر چڑھ دوڑی اور ایریا کے بہت بڑے حصّہ سمیت ایتھوپیا پر قابض ہو گئی۔

پاکستان پر حملہ

وہ برابر مشاہدہ کر رہی تھی کہ مغربی پاکستان سے بیش قرار تجارتی اشیاء سے لدے ہوئے کارواں اٹھتے اور شہر اشوریہ، نینوا اور بابل وغیرہ کے بازاروں کی رونق چار چاند لگا جاتے۔ بار بار اسے خیال آتا کہ پاکستان کی حاصل خیز سرزمین پر بھرپور حملہ کیا جائے۔ مزید یہ کہ ترک وغیرہ کی

ص٢ ہیرو ڈوٹس کی رو سے نانی اور سیمی دونوں نے مل کر بابل آباد کیا تھا۔

اور بھارت کے علاوہ دنیا میں اور کوئی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی جو اس کے منہ آسکتی۔ اس پاکستانی مہم کی نزاکت اور اہمیت کو وہ خوب سمجھتی تھی پھر یہ کہ بوڑھی ہوگئی تھی۔ چنانچہ اب سپاہیوں پر اس کی خوب روئی کا جادو ویسے بھی نہ چل سکتا تھا کہ وہ قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے بھی ملک کے لئے کٹ مرنے کو جزوِ ایمان سمجھتے اس لئے خوب خوب تیاریاں کیں۔ اپنے جلوس میں تیس لاکھ پیدل، پانچ لاکھ سوار اور ایک لاکھ جنگی رتھ لے کر بڑھی۔ دریاؤں کو عبور کرنے اور دشمن کے ساتھ پانی میں پنجہ آزمائی کرنے کو اس نے شامی، قبرصی اور فینونیقی (PHEONICIAN) کاریگروں سے جنگی جہاز کچھ اس طرح بنوائے کہ بوقت ضرورت انہیں بڑی آسانی سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جانوروں پر لاد کر لے جایا جا سکتا تھا۔ پاکستانی حکمران سٹروبیتیس کے ساتھ اس نے پہلی آبی جنگ لڑی اور اس اوّلین مقابلے ہی میں اس کے ایک ہزار جہاز سپردِ آب کر کے آگے چل کھڑی ہوئی۔ دریائے سندھ پر پل بنوایا اور ملک کے قلب میں در آئی۔ اندرون پنجاب وہ پھر سامنے ہوا۔ یہاں سیمی ایک خطرناک چال چل گئی۔ اس کے پاس ہاتھی کم تھے اس لئے تین ہزار کالے بیلوں کی کھالوں میں اس حیا بکدستی سے بھس بھروایا کہ سٹروبیتیس کے ہاتھی بھی ان نقلی ہاتھیوں سے دھوکہ کھا گئے۔ شروع میں تو وہ پسپا ہوا مگر جلد ہی سیمی کی حرکت اس نے جان لی۔ ہولناک مقابلے کے بعد وہ اپنی فوج کا بڑا حصہ کٹوا کر میدان چھوڑ گئی۔ سیمی کی ساری معرکہ آرائیوں میں اس کی پاکستانی مہم بری طرح ناکام رہی اور پنجاب میں اسے سخت مات ہوئی۔ اس شکست کے جلد ہی بعد اپنے بیٹے نینا س کو حکومت سونپ دی، اور کچھ دن ٹھہر کر چل بسی۔ بعض روایتوں کی رو سے اس کے طالع آزما بیٹے نے ماں کو ختم کرا دیا۔ بعد میں قمری بن کر آسمانوں کو پرواز کر گئی۔

اس کی تعمیر و ترتیب وہ جہاں بھی گئی تعمیرات کی طرف بڑی توجہ دی۔ بیشمار سنگین عمارتیں، جھیلیں، تالاب، دیواریں، پشتے، قلعے کاریزیں، وسیع و عریض باغات، پہاڑوں سے گزرتی ہوئی زینے دار سڑکیں اور پل

تعمیر کرائے۔ ہیروڈوٹس کہتا ہے "سیمی رامس پانچ نسلوں تک صاحبِ اختیار رہی۔ اس نے دریائے فرات کے سیلابوں پر قابو پانے کے لئے بابل کے نزدیک میدانوں میں بہت سے قابلِ دید پشتے بنوائے۔ ان دنوں دریائے فرات چھلک کر سارے ملک میں تباہی پھیلا دیتا تھا ——— شہر بابل کے ایک دروازے کا نام سیمی کے نام پر رکھا گیا"

لوسین (LUCIAN) اسے عظیم الشان ایشیائی عمارتوں کا خالق قرار دے کر رقمطراز ہے "میڈیا کے متعدد مقاموں کو اسی کے نام سے پکارا جاتا۔ آرمینیا والوں کے خیال میں 'وان' کا شہر سیمی نے ہی آباد کیا جو پہلے کبھی "شمی رام جرد" کہلاتا تھا۔ بعض کے نزدیک اس نے شہر لبانس میں افرودیتی (زہرہ۔ عشتار) کا قدیم عالی شان مندر بنوایا مگر دوسرے کہتے ہیں کہ اس معبد کی تعمیر کا سہرا سنارس کے سر ہے" (وان ایک جھیل کا بھی نام تھا اور اس کے گرد کے علاقے کو کبھی شمیرام جرد کہتے تھے) ——— مختصر یہ کہ لوگوں نے مختلف ملکوں کی ساری اہم عمارتیں سیمی سے منسوب کر دیں۔ حد ہے کہ ڈایوڈورس نے تو بے ستون کے کتبہ کا خالق بھی اسے ہی قرار دیا حالانکہ یہ دارا نے کندہ کرایا تھا۔ سٹرابو (STRABO) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مغربی ایشیا میں متعدد ٹیلوں کا نام سیمی کے نام پر رکھ دیا جاتا تھا! ———

یہ تھے مختصر طور پر وہ حالات جو یونانیوں وغیرہ سے افسانوی اور دیومالائی رنگ میں ہم تک پہنچتے ہیں۔ اور اس رنگ میں مبالغہ آمیزی اور حاشیہ آرائی تو خیر قابلِ گرفت نہیں ہوا کرتی مگر ایک نکتہ یہاں بڑا ہی دلچسپ ہے اور وہ ہے محض پاکستان میں سیمی کی شکست۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات اصل میں یوں ہے کہ ان باتوں کے راوی ہیں یونانی۔ اور پاکستان وہ جگہ تھی جہاں ان کے ہم وطن اور یورپ کے اس اکلوتے مگر نامور فاتح سکندر کو لوہے کے چنے چبانا پڑے اور زندگی کے سخت ترین اور جان لیوا مقابلے پیش آئے زخمی بھی ہوا۔ اب اگر یونانی مورخین سیمی کو بھی، جو کم و بیش سکندر جتنا علاقہ جیت چکی تھی، پاکستان میں کامران قرار دیتے تو یہ مشرقی خاتون سکندر سے بڑھ کر نہیں تو اس کے ہم پلہ ضرور ہو جاتی۔ اور یہ ایسی بات تھی،

جو یونانی راویوں کا مغربی عورن کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے ایشیائی سیمی کو جس علاقہ میں شکست خوردہ بتایا ہو سکتا ہے کہ اشوری یا بابلی افسانہ طرازیوں کی رو سے وہ یہاں بھی کامیابی سے ہم کنار رہی ہو۔ مشکل یہ ہے کہ اشوریوں اور بابلیوں کا اس سلسلے میں تفصیلی لٹریچر تا حال نہیں ملا ہے۔

سیمی اور شکنتلا

سیمی اور شکنتلا کی جنم کہانیوں میں بہت مشابہت ہے۔ شکنتلا ایک انتہائی عابد اور زاہد رشی وسوامتر کی ناجائز بیٹی تھی۔ اس کی ماں کا نام مینا کا تھا جو المسپرا (آسمانی پری) تھی۔ شکنتلا مقدس دریا کے کنارے پیدا ہوئی۔ ماں بیٹی کو وہیں ڈال کر چلی گئی۔ جنگل میں شیروں اور چیتوں کی بھرمار تھی۔ آدمی کا نام نشان نہ تھا۔ کسی بھی مصیبت سے اسے بچانے کو بہت سے عقاب اس کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ پھر ایک اور رشی نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا اور پروان چڑھایا۔ چونکہ اس بچی کو شکنت (یعنی پرندے) گھیرے ہوئے تھے اس لئے رشی نے اس کا نام "شکنتلا" رکھ دیا۔ شکنتلا کے معنی ہیں "وہ جسے پرندوں نے بچایا ہو"۔ دونوں (سیمی اور شکنتلا) کا بدن نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ انتہائی متناسب اعضاء۔ ایسی ہی سہانی مسکراہٹیں، دلپذیر اور جاذب توجہ ادائیں۔ غرض دونوں ہی نسائیت کا شاہکار تھیں۔ دونوں جنگلوں میں آزاد اور معصوم ہرنیوں کی طرح رہا کرتیں۔ سیمی کی ماں بھی آسمانی تھی اور باپ ایک دیوتا۔ وہ بھی سیمی کو مناکا کی طرح چھوڑ کر چلی گئی تھی اور پھر اس کی پرورش قمریوں اور فاختاؤں نے کی۔ شکنتلا عظیم راجہ دشینت کو بھا گئی اور آریہ ورت (بعد کے بھارت ورش) کے زبردست راجہ بھرت کی ماں بنی۔ سیمی بھی افسانوی بادشاہ ننس کی ملکہ بنی اور نیناس اس کے بطن سے پیدا ہوا جس نے ملک کو بہت وسعت اور شہرت دی۔

سیمی راامس تاریخ کے آئینے میں

کہنے کو تو سیمی راامس کچھ ایسا پراسرار کردار نہیں ہے بلکہ اندھیارے کی

راتوں کی چمکتی دمکتی زہرہ کی مانند نمایاں اور تاباں ہے پہ جب حقیقت یوں افسانوں اور شعر و شاعری کی دنیا میں کھو سی جائے تو پھر اس کا پالینا کچھ ایسا آسان بھی نہیں رہتا ہے۔ اس کی نہ صرف ابتدائی بلکہ کافی حد تک پوری زندگی بھی ماضی کی تاریکیوں اور افسانوں میں روپوش ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ ننس اور نیناس کی شخصیتیں بالکل فرضی ہیں اور باقیات سے ان کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔

سنہ ۱۹۱۵ء سے پہلے متفقہ طور پر سیمی کو قطعی غیر حقیقی ہستی تصور کیا جاتا تھا۔ اور ڈایوڈورس اور قدیم مورخین کے کسی بھی بیان پہ علمائے تحقیق یقین نہ کرتے تھے۔ انیسویں کے آغاز میں اولڈ برائینٹ (OLD BRYANT) نے اپنی کتاب ـــــ "قدیم صنمیات" (ANCIENT MYTOLOGY) میں سیمی کو منہ رجہ ذیل الفاظ میں بے بنیاد خاتون قرار دیا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ اکثر قدیم تاریخ دانوں کی نظر میں سیمی حقیقی عورت تھی اور اس نے بابل میں بڑی شان بڑی شوکت سے حکومت کی۔ لیکن جو لوگ وہاں اپنی رہائش سکونت کی وجہ سے زیادہ صحیح معلومات بہم پہنچا سکتے تھے ان کا کہنا ہے کہ وہ ایک دیوی تھی۔ ایتھناگورس (ATHNAGORUS) کے بقول" اہل شام اسے پوجتے تھے" ہیراپولس (HIERAPOLIS) اور بابل کی طرح عسقلان میں بھی اس کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور تھیں اور یہ داستانیں ایسی تاریخ کا جزو تھیں جس میں فاختہ کو بہت اونچا مقام حاصل تھا۔ سیمی رامس کے متعلق لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے عسقلان میں آنکھ کھولی تھی کیونکہ اتارگیٹس وہاں ڈیگن کے نام سے پوجی جاتی تھی۔ سیمی قمری بن گئی۔ اور عوام ہمیشہ اسے قمری کے روپ میں پیش کرتے اور پوجتے تھے۔ ان افسانوں کی بنا پہ میرا خیال ہے کہ وہ ایک فرضی ہستی تھی اور لیں، لفظ سیمی رامس اصل میں "سمارمش" یا "سمارمش" کا مرکب ہے اس کا مطلب ہم یہ لے سکتے ہیں "سب سے اونچا جھنڈا"۔ اس

جھنڈے پر فاختہ کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اور وہ تمام لوگ جو اس علم کو اپنا قومی نشان مانتے یا اس کے نیچے جمع ہوتے اور اس کی تعظیم کرتے، وہ "سمیرم یا سموبرم" کہلاتے تھے۔"

اسی طرح برآئینٹ کے ہم خیال اور بھی بہت سے محققین تھے جو پچھلی دو صدیوں میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے کہ سمی کے جنم کی روایت' اس کا فاختہ بن جانا اور پانچ روز کے لئے ملکہ مشتہر کیا جانا اس کی بے پناہ فتوحات ——— محض دیو مالائی قصے ہیں، اس کے باوجود وہ کسی شاعر خوش بیان کے تخیل کا محض رنگین شعر ہی نہیں تھی بلکہ گوشت پوست کا چلتا پھرتا پیکر جمیل تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ غیر معمولی خصوصیات کی بنا پر اسے دیوی کا درجہ دے دیا گیا اور یہ کچھ واحد یائی مثال نہیں ہے۔ زمانہ قدیم کی متعدد ہستیوں کو الوہیت سونپ دی گئی تھی۔ حالانکہ مقدونیہ کا سکندر بھی اسی صف میں کھڑا نظر آتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں برلن یونیورسٹی کے پروفیسر لیہمن ہاپٹ (LEHMANN HAUPT) نے تحقیقات کر کے سمی کو تاریخ کی زندہ عورت ثابت کر دیا۔ اس کا اشوری نام سموّرمت تھا اور یونانی اس کو سمی رامس کہنے لگے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں ایک کتبہ ملا جس پر اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

"شمشی اداد کے محل کی بیگم ——— سمورمت ——— شمشی اداد، شاہ جہاں ——— چہار وانگ عالم کا فرمانروا ———"

اس کتنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سمی رامس یا سموّرمت، کا اثر اپنے شوہر پہ کس قدر گہرا تھا۔ شہر اشور میں ایک جگہ اشوری سلاطین اور شاہی حکام کے نام کندہ ملے ہیں۔ ان میں سمی رامس کا نام شمشی اداد پنجم ($\frac{۸۲۴}{۸۱۱}$ ق م) کی بیوی اور شالمانصر سوم ($\frac{۸۵۹}{۸۲۴}$ ق م) کی بہو کی حیثیت سے لکھا ہے۔ کتبوں سے تاریخ میں سمی رامس کا مخصوص مقام بھی متعین ہوتا ہے یعنی یہ کہ سیاسی لحاظ سے بھی وہ بہت اونچی پوزیشن کی مالک تھی۔ شوہر شمشی اداد پنجم کی موت کے بعد اپنے نابالغ بیٹے اداد نیراری سوم ($\frac{۸۱۱}{۷۸۲}$ ق م) کی

نگران اعلیٰ بنی اور مادر ملکہ (QUEEN MOTHER) کا خطاب پایا۔ ۸۱۱ سے ۸۰۸ ق۔م تک بیٹے کی سرپرست کی حیثیت سے امور سلطنت انجام دیتی رہی۔ اس کی توثیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ اداد نزری کے ابتدائی تین برس اس کے عرصۂ حکومت میں باقاعدہ شمار نہیں کئے جاتے تھے۔ ہاپرٹ کے خیال میں ملکہ نے میڈیا اور کلدانیہ کے خلاف جنگ آزمائی کی اور اس کا اثر ایک سے زائد نسلوں پر رہا۔ ایک اور کتبے میں نابو دیوتا کو بادشاہ اور ملکہ کی زندگی کا محافظ قرار دیا گیا ہے۔ اس کتبے کے الفاظ یہ ہیں:-

"سرزمین اشور کے بادشاہ اداد نزری کی زندگی.... اور سمورمت، اس کی بیگم...... خاتونِ محل ——"

یہ الفاظ کالخی یا کالخ شہر کے گورنر بعل ترمتی الو مانے کندہ کئے تھے۔ اس تحریر سے سمورمت، اداد نزری کی ماں نہیں بلکہ بظاہر بیوی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن قصہ یہ ہے کہ 'زمین کو دیوی' یا 'دھرتی ماتا' کے ماننے والوں میں یہ دستور رہا ہے کہ وہ ایک ہی دیوتا کو 'مادرارض' کا شوہر بھی مانتے تھے اور بیٹا بھی۔ چنانچہ اسی اساطیری رمز کی بنا پہ اداد نزری کے گورنر نے بھی ماں کو، بیٹے کی بیگم لکھ دیا ہوگا۔ اور اگر ہم اس کتبے کو اس وقت کا سمجھ لیں جب وہ نابالغ بیٹے کی طرف سے حکومت کر رہی تھی، تب بھی زمانہ قدیم کے رحجان کو پیش نظر رکھتے ہوئے لفظ 'بیگم' بالکل نہیں کھٹکتا۔

سمی نے بابل میں آنکھ کھولی[1] اور جوانی میں اشوری ایوان کی زینت بن گئی۔ فطرت نے حسن، نزاکت اور تناسب کو گوندھ کر اسے اچھوتا شاہکار بنا دیا تھا۔ وہ اشوری بادشاہوں کے وسطی دور میں ابھری اور نام آوری کی رفعتوں کو چھو گئی۔ چونکہ بابل کی شاہزادی تھی اس لئے شمشی اداد نے سیاسی اغراض کے تحت اسے اپنی ملکہ منتخب کیا تاکہ بابل کا آئینی اور جائز حکمران کہلائے۔ شمشی نے ملک بابل کو اشوریہ کا ایک صوبہ بنا دیا تھا۔ مگر اس سے پہلے اس نے بابلی بادشاہ سے ایک معاہدۂ امن کر لیا تھا اور بابلی شہزادی سے شادی کر کے اس معاہدے کو اور بھی تقویت دے دی۔ بعد میں اس اقدام نے

---

[1] سمی کے بابل کو آباد کرنے کی روایت کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ تاریخی لحاظ سے یہ ملکہ کے دور سے بہت ہی پہلے آباد ہو چکا تھا۔

کو بابل کے حکمران "باؤاخ اِدّین" نے توڑ دیا۔ اس لڑائی میں محلاتی خزانوں کے ساتھ ہی اسیر کرکے اشوریہ لے گئے) بات یوں ہے کہ جن ملکوں "مادر کائنات" کی پوجا ہوتی تھی وہاں ماں کے حقوق ہمیشہ برتر تسلیم کئے جاتے تھے اور جو کوئی کسی شہزادی سے بیاہ کر لیتا تو اس شہزادی کی رعایا اسے اپنا بادشاہ مان لیتی۔ مصر کے فرعونوں اور آرمینیا کے حطی بادشاہوں کے ہاں اس قسم کی کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ کئی لوگ اس لئے فرعون بن گئے کہ وہ یا تو شاہی خاندان کی لڑکیوں کے شوہر تھے یا پھر ان کی مائیں نسل شاہی سے تھیں۔ آرمینیا کے حطیوں کے ہاں بھی عورت کی طرف سے تخت نشینی کا ثبوت ملتا ہے۔ جب حطی بادشاہ حتوسل دوم نے اپنی بیٹی کی شادی اموری بادشاہ پتاخی سے کی تو اس نے معاہدہ اتحاد میں باقاعدہ یہ لکھوایا کہ آئندہ اموریوں کا بادشاہ ہمیشہ اس کی بیٹی کی اولاد میں سے ہوا کرے گا —— بہرکیف شمشی نے یمی سے اس لئے رشتہ مناکحت جوڑا کہ لوگ اسے بابل کا غاصب نہیں بلکہ آئینی فرمانروا تسلیم کر لیں۔ یمی کو بھی اس رشتے کی بدولت شمشی اور اپنے بیٹے اداد نرری پہ بالادستی حاصل رہی۔ یمی کے بابلی خانوادۂ شاہی سے ہونے کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ اداد نرری اشوریہ اور بابل دونوں ملکوں کا جائز اور آئینی حکمران ہونے کا مدعی تھا اور بابل کا صحیح وارث وہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا جبکہ اس کی ماں کا تعلق بابل کے شاہی خاندان سے رہا ہو۔ اداد نرری نے ایک جگہ خود کو اشوری سلطان شالمانصر اول اور بابل کے فرمانروا بعل کپ کپو کی نسل سے بتایا ہے۔ آثار سے اب تک بعل کپ کپو کے متعلق کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ مگر اداد نرری کے نزدیک بعل کپ کپو مشہور بابلی بادشاہ حمورابی (۲۰۶۷/۲۰۲۵ ق۔م) کے دادا سُمولا ایلم (۲۱۵۹/۲۱۲۴ ق۔م) سے بھی پہلے ہو گزرا ہے (سمولا ایلم کو اداد نرری نے شیلی لکھا ہے) اداد نرری سمولا ایلم کو اشوریہ کا "سرپرست مالک" بھی قرار دیتا ہے۔ بہرحال یہ بعل کپ کپو کوئی بھی ہو اس عبارت سے یہ ضرور واضح ہے کہ اداد نرری باپ کی طرف سے اشوری اور ماں کی طرف سے کسی پرانے بابلی شاہی خاندان سے تھا اور وراثت کے لحاظ سے بابل پہ اس کا ٹھوس حق تھا۔ اشوریہ کی پوری تاریخ میں وہ پہلی اور تنہا حاکم رہا

ملکہ ہے جس کا نام شوہر اور بیٹے کے ساتھ کتبوں پر موجود ہے۔ آخر کوئی بات تو تھی جس کی بنا پر اشوری تاریخ میں یہ نئی بات دیکھنے میں آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ حسب نسب کے لحاظ سے کوئی ایسی ویسی عورت نہ تھی بلکہ اس کی پشت پر کوئی ایسی طاقت تھی جس سے مجبور ہو کر شمسی اور اداد نزری نے اس کے نام کو اپنے برابر کتبوں میں جگہ دی۔ اور وہ طاقت یقیناً بابلی ملک اور بابلی شاہی خون کی تھی جو سمی کی رگوں میں موجزن تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بیالیس سال حکومت کے بعد بیٹے کو تخت سونپ دینے والی روایت میں تاریخی لحاظ سے بھی کچھ صداقت ہو اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ میڈیہ اور کلدانیہ والوں سے لڑتی بھڑتی رہی ہو۔ اداد نزری سوم ایک کامیاب جرنیل اور دلیر سپاہی تھا اس نے اپنے پیشروؤں سے بڑھ چڑھ کر اشوری سلطنت کی حدود میں اضافہ کیا۔ میڈیہ اور ادھر کے دوسرے قبائل اور ایرانی سطح مرتفع کا بیشتر حصہ زیر کر لیا۔ کلدانیوں کو بابل میں بڑھنے سے روکا اور بابل میں پوری طرح اپنا اقتدار قائم کیا۔ شمال میں اس نے نائریوں کی وسیع ریاست کو مطیع کیا۔ شام کے ارامی بادشاہ ماری کو اس کے دارالحکومت دمشق میں ٹھوکر کے فیصلہ کن شکست دی۔ ماری نے اداد نزری کو ۲۳۰۰ نقرئی، ۲۰ سنہری، ۳۰۰۰ تانبے اور ۵۰۰۰ لوہے کے ٹیلنٹ دیئے، ہاتھی دانت کے ڈھیروں زیور، فرنیچر اور دوسرا بہت سارا سامان ان کے سوا تھا۔ یہ ارامی اسرائیلیوں کو مارتے پیٹتے رہتے تھے۔ اداد نزری نے اسرائیلیوں کو ارامیوں کے دست ستم سے نجات دلائی اس کا اعتراف بائبل میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے وہ بنی اسرائیل کا نجات دہندہ تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ اداد نزری دمشق سے آگے بڑھا کہ نہیں البتہ جو ریاستیں ارامیوں سے دبتی تھیں اب وہ بلا تامل اشوریہ کی پناہ میں آگئیں چنانچہ صور (TYRE) صدون، سرزمین اومری (اسرائیل) ادوم وغیرہ اس کی حلقہ بگوش ہو گئیں۔

اشوریہ پر سمی کے اثرات

دیکھا جائے تو قدیم بابل اور اشوریہ کے درمیان سمی رامس ایک ایسا مضبوط اور مستحکم پل ہے جس پر سے ہو کر بابلی تہذیب و تمدن پوری طرح اشوریہ میں پہنچا۔ سمی کو اشوری تاریخ

میں وہی درجہ حاصل ہے جو مصر میں اس سے پہلے موحد فرعون اخناتون (۱۳۶۹ تا ۱۳۵۴ ق م) کی ماں ملکہ طیئی نے پا لیا تھا۔ طیئی کی طرح سمی بھی اپنے شوہر اور بیٹے کے بیالیس سالہ عہد میں سیاسی خصوصاً مذہبی تبدیلیوں کا بہت بڑا سبب بنی۔ اور اس کی شہرت اور عظمت کا راز بھی دراصل اس کی انہی سرگرمیوں میں مضمر ہے۔ کتبوں اور قدماء کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اشوریہ میں سوشل، پولیٹیکل اور خاص طور پہ ریلیجس رد و بدل خوب ہوا اور اسی کے باعث "مادر عظیم" کی پرستش بہت ہی مقبول ہو گئی۔ "مادر عظیم" بابلی والوں کی سب سے محبوب معبود تھی جس کا معروف ترین نام عشتار تھا۔ اداد نزری کے عہد میں بابلی دیوتا نابو بھی اشوریہ والوں کا من پسند "خدا" بن گیا۔ اسے وہاں تہذیب و تمدن اور عقل و دانش کا دیوتا، فن کاروں اور منشیوں کا مربی اور دیوتاؤں کا ذریک مشیر سمجھا جاتا تھا۔ کالخی کے مقام پہ نابو کا ایک عظیم الشان مندر بنایا گیا۔ اس میں اس کے چار بت نصب تھے۔ دو آجکل برٹش میوزیم میں ہیں۔ انہی میں ایک پہ وہ عبارت ہے جس میں اداد نزری اور سمورمت کا ایک ساتھ ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بابلیوں کے دیوتا شمش کو بھی اشوریہ کے معبود اعظم اشور کے برابر اہمیت دے دی گئی۔ اشوریوں اور اشوری بادشاہوں کا سب سے مرغوب مشغلہ مار دھاڑ رہا ہے۔ مگر سمی کے زمانے میں جب شمش اشوریہ میں پوجا جانے لگا تو حکمرانوں کی ذہنیت بھی اس سے کچھ نہ کچھ ضرور متاثر ہوئی ہو گی۔ اس لئے کہ شمش وہ دیوتا تھا جسے نظم و ضبط پسند تھا اور بادشاہوں کو عقل و دانائی عطا کرتا اور لوگوں کا مقسوم متعین کرتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ بابلی دیوتاؤں کی پوجا ہونے سے اشور دیوتا کے پروہت سخت نالاں رہے ہوں گے اداد نزری کے زیر سرپرستی اشوری دربار بابلی روایات اور تہذیبی رنگ میں خوب رنگا گیا اور اس انقلاب کا باعث سمی کی محبوب اور محب وطن ذات تھی۔ اس کے جذبہ قومیت کو کبھی گھن نہ لگ سکا اور جس طرح بن پڑا مرتے دم تک اپنی اصل قوم (بابلی) اور ملک کی خدمت کئے گئی۔ وہ اپنے ہم وطن بابلیوں، اپنے مذہب اور تہذیب و تمدن کو کبھی بھول نہ پائی۔ ایک بات کی اور وضاحت کرتے چلیں کہ دیکھے تو بابلی تہذیب اور مذہب کے اثرات اشوریہ پہ اداد نزری کے دادا سالمانصر سوم کے عہد میں ہی پڑنا شروع ہو گئے تھے اور شائد اسی وجہ سے

پجاریوں اور کارکنانِ سلطنت نے شالمانصر کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ شالمانصر نے کالخی میں ایک لائبریری قائم کی تھی جس میں بابلی لٹریچر جمع کیا گیا تھا۔ سمی کے زمانے میں اس بابلی لٹریچر میں بہت ہی اضافہ ہوا جو بعد کے حکمرانوں کے دور میں بھی جاری رہا۔ بہر حال اشوریہ پر نمایاں ترین اور ٹھوس اثرات سمی کی کوششوں سے ہی پڑے۔ تاہم سمی آخری یا واحد بابلی شہزادی نہ تھی جو اشوریوں کے ہاں آکر نام پا گئی ہو۔ کچھ عرصے بعد نقیا نامی بابل کی ایک اور شہزادی نے بھی اشوری حکومت میں شہرت و اقتدار پایا۔ نقیا کا شوہر اشور کا مشہور حکمران سناحرب تھا اور اس کا بیٹا اسرحدون (۶۸۰/۶۶۸ ق۔م) فاتح مصر تھا۔ بہت ممکن ہے کہ نقیا کے متعلق جو کہانیاں مشہور رہی ہوں وہ بھی سمی رامس سے منسوب کر دی گئی ہوں۔

سمی عشتار کے روپ میں

پروفیسر جیمز فریزر (JAMES FRAZER) اپنی مشہور عالم کتاب (GOLDEN BOUGH) میں لکھتے ہیں

"سمی کی اپنے شوہر سے پانچ دن کے لئے تخت مانگنے کی روایت اس رسم کی باقیات میں سے ہے جس (رسم) کی رو سے ایک مرد اور عورت کو نقلی بادشاہ اور ملکہ مقرر کر کے انہیں پانچ دن کے لئے "حکومت" دے دی جاتی تھی۔ اس روایت کے بموجب سمی کو ماتا دیوی کا کردار تفویض کیا گیا اور اس کا خاوند بادشاہ اسی تشدد کی موت مرا جس طرح ماتا دیوی کے عاشق کا خاتمہ ہوا تھا۔ کہانیوں کے مطابق سمی نے تمام مغربی ایشیا میں ٹیلے یا تودے بنوا دیئے تھے اور ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ اس کے عشاق کی قبریں ہیں جنہیں اس نے زندہ دفن کرا دیا تھا۔ یہ روایت اس امر کے چند پختہ ترین ثبوتوں میں سے ایک ہے کہ سمی رامس کو عشتار سے ملا دیا گیا تھا"

وہ قدرت سے کچھ ایسی ظاہری اور باطنی خوبیاں لے کر آئی تھی کہ لوگوں کے اذہان پر نہایت خوشگوار اور انمٹ نقوش چھوڑ گئی جس طرح عوام نے اکادی فرمانروا سارگن اول ـــــ ق۔م اور پھر سکندر کو دیوتا کا درجہ دے دیا تھا۔ اس طرح یہ بھی موت کے بعد دیوی بن گئی۔ اور دنیا

(عشتار) کی بہت سی خصوصیات اور روایتیں اس سے منسوب کر دی گئیں۔ نینا اصل میں درکیتو (اتارگیتس) کا پہلا روپ تھی۔ اور غالباً بابلی دیوتا ایا کی بیوی دمکینہ کی بھی ایک شکل تھی اور یہ نینا سومیری شہر نینا کے باشندوں کی مہادیوی تھی۔ نینا اور لاگاش نامی شہروں میں نینا دیوی کے حضور مچھلیوں کے نذرانے پیش کئے جاتے تھے۔ آخر مشہور دیوی عشتار نے نینا کو بھی اور دوسری بے شمار دیویوں کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لیا۔ یونانیوں نِنس (ربی کا شوہر) اصل میں نینا کے نام کی مذکر صورت خیال کی جاتی ہے۔ نینوا کو غالباً نینا یا لاگاش کے آبادکاروں نے آباد کیا ہوگا یا اگر یہ شہر پہلے سے بسا چلا آتا تھا تو موخر الذکر دو شہر والوں نے اس پر قبضہ کر کے اس کا نام اپنی دیوی نینا کی نسبت سے نینوا رکھ دیا ہوگا ——— ربی سے متعلقہ تمام کہانیوں کا شائد سب سے پرانا حصہ وہ ہے جس کی رو سے وہ آسمانوں میں اڑ گئی تھی۔ اس کی موت کے بعد اسے قمریوں کی دیوی کی حیثیت سے پوجا گیا۔ قبرص میں بھی قمریوں کی دیوی کی پرستش ہوتی تھی۔ ہیروڈوٹس نے کہا ہے کہ عسقلان کے فینیقی اسی دیوی کو "درختوں اور فاختاؤں کی ہماری دیوی" کہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ربی کا اشوری نام قدیم اشوری لفظ شمت سے نکلا ہو۔ شمت وہ فاختہ کو کہتے تھے اور شُورمت کا مطلب ہے "قمریوں کی دیوی اسے پیار کرتی ہے"۔ بعض محققین کے خیال میں اشوریہ والے فاختہ کو اس لئے تعظیم دیتے تھے کہ ربی نے اس پرندے کا روپ دھار لیا تھا اور اسی سبب سے وہ قمریوں کی دیوی مانی جاتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان علماء کی بات صحیح ہو لیکن یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ عشتار سے متعلق ہونے کی وجہ سے فاختہ ربی سے صدیوں پہلے تقدیس کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ ربی رامس کا تعلق "ربۃ ماہی" اتارگیتس یا درکیتو سے بھی جوڑا جاتا تھا اور پرانے ہراپولس (HIERAPOLIS) میں مچھلیوں اور فاختاؤں کی یہی باہمی قرابت موجود تھی۔ اس جگہ ربی کے مجسمے پر طلائی فاختہ دکھائی جاتی تھی ——— اہل شام سامی زبان میں ربی کو "شمی رام" کہتے تھے اور یہ اس کا اصل نہیں بلکہ وصفی نام ہے۔ کچھ سکالرز نے اس کا مطلب "انتہائی نامور" لیا ہے اور بعض نے رام دیوتا کا ظہور ———

سمی رامس کو جب عشتار کی خصوصیات سونپی گئیں تو ساتھ ہی اس کے بیلیے اور نریگا کو دیو مالا کا رکن قرار دے کر اساطیری تقاضوں کے تحت اپنی ماں سمی کا شوہر اور محبوب بھی بنا دیا ہوگا کیونکہ "مادر کائنات" یعنی عشتار کا طالب تموز بیک وقت عشتار کا بیٹا بھی تھا اور خاوند بھی، بھائی بھی تھا اور عاشق بھی۔ روایتوں میں جس طریقے پر سمی کے دلنشیں شباب، بے پناہ جنسی کشش، جذبۂ الفت اور دوسری جزئیات کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل سمی کو تخلیق، حسن و عشق، جنسیت اور جنگ و جدل کی دیوی عشتار کے بہت سارے اوصاف دے دیئے گئے تھے اور اس کا نشان فاختہ قرار پایا —— یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سمی رامس آخر دیوی بنی کیسے؟ پہلے یہ ذہن نشین کر لیا جائے کہ سمی کا دیوی اتار گیتس (جس کے متعلق ہم کہہ آئے ہیں اس کا پہلا روپ نینا یا عشتار تھی) کے ہاں جنم لینے، فاختاؤں کا اسے پالنے اور پھر خود بھی فاختہ بن جانے اور مبالغے کی حد تک اس سے منسوب دوسری روایتیں دراصل اس وقت وضع کی گئیں جب وہ مرنے کے بعد دیوی کا درجہ اختیار کر رہی تھی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ سمی کی وطن پرستی اور خدمت کے پیش نظر اس کے ہم وطن بابلی اسے درجہ الوہیت تک پہنچانے کے ذمہ دار تھے ورنہ اپنی مذہبی سرگرمیوں کی بنا پر وہ اشوریوں خصوصاً اشوری "پنڈتوں" میں تو کچھ ایسی مقبول نہ رہی ہوگی۔ چونکہ سمی نے اپنے وطن اور ہم وطنوں کی بے حد خدمت کی اور اشوری سرزمین میں بابل کی اس بیٹی نے اپنے ملک کے مذہب اور تہذیب و تمدن کو فروغ دیا اس لئے بابلیوں نے ان غیر معمولی صفات کی خاتون کو اگر دیوی بنا دیا تو تعجب کیسا؟ اور یہ سب کچھ اس کے عقیدت مندوں نے اس لئے کیا کہ ان کی پیاری ملکہ بھی عشتار کی طرح مقبولیت اور شہرت کی رفعتوں کو چھو لے اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی رہے۔ اس حد تک کامیاب کہ سمی کی اصل ہستی ہی ان کے اس جذب عقیدت اور عبودیت کا شکار ہو گئی حتیٰ کہ آج اس کی بیشتر حقیقی زندگی نظروں سے اوجھل پڑی ہے اور وہ خود دنیا کی عظیم اور مقبول ترین دیوی (عشتار) میں جا چھپی ہے۔

افتخار حسین شاہ

اسلوبِ نثر

ادب میں معاملات وواقعات کے بیان، خیالات کی ترجمانی، جذبات واحساسات کی عکاسی اور جملہ کیفیات وخیالات پر تبصرہ وتنقید کرنے کے لئے جو وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے، وہ زبان ہے۔ زبان ایک لشکر کے مصداق ہے، جس کے سپاہی الفاظ ہیں۔ ادیب ایک سپہ سالار کی طرح نہایت احتیاط وہنرمندی کے ساتھ، اپنی الفاظ پر مشتمل فوج کو اپنی ضرورت کے مطابق کام میں لاتا ہے۔ ادیب کا یہ عمل اصلاحی زبان میں ابلاغ کہلاتا ہے۔ یہ مفہوم ادا کرنے کے لیے ابلاغ کے علاوہ اظہار کا لفظ بھی مستعمل ہے، لیکن بیان، کا لفظ جسے بعض لوگ اسی عمل کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، اس سے مختلف مفہوم کا حامل ہے۔ بیان میں ہم جذبات واحساسات کو وضعی ناموں سے ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اظہار یا ابلاغ میں بعینہٖ ان جذبات واحساسات کو پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے، جن کا اظہار یا ابلاغ مقصود ہوتا ہے۔ ادب میں ابلاغ یا اظہار کی دو صورتیں ہیں، ایک نظم یا شعر کہلاتی ہے اور دوسری نثر۔ نظم اور نثر کی بالعموم یہ تعریف بیان کی جاتی ہے کہ نظم وہ کیفیت اظہار ہے جس میں وزن اور بحر کی باقاعدگی کا سختی سے خیال رکھا جاتا ہے اور نثر وہ صورت ابلاغ ہے جو وزن کی قیود سے آزاد ہے اور جس کی بحریں ہر ممکن حد تک متنوع ہوتی ہیں۔ لیکن نظم اور نثر میں یہ اختلاف قطعی نہیں ہے[۱] کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ وہ چند الفاظ جن کو

---

(1) ENGLISH PROSE STYLE BY H. READ, PP. IX, X.

قوافی، بحور اور اوزان کی پابندی کے ساتھ مصرعوں کی صورت دے دی جائے ان میں شعریت بھی ہو۔ اور پھر ایسی نثر کا وجود بھی عنقا نہیں جو قافیہ ردیف بحر۔۔۔ کی رعایت کے ساتھ نہ لکھی گئی ہو۔ عربی، فارسی اور اردو ادبیات میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ دریں صورت کسی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف نظم یا نثر میں نہیں بلکہ شعر اور نثر میں ہے۔ تو شعر اور نثر میں ہیت کے اعتبار سے سطحی اختلاف ہونے کے علاوہ مواد کے اعتبار سے اصل اور پائیدار اختلاف بھی ہے: شعر دماغی عمل کے ایک پہلو کا نام ہے اور نثر دوسرے پہلو کا، شعر تخلیقی اظہار سے عبارت ہے اور نثر تعمیری اظہار سے، تخلیقی اظہار وہ ہے، جس میں الفاظ دوران فکر ہی ذہن میں اُبھر آتے ہیں، یعنی کہ موضوع اور ہیت ساتھ ساتھ جنم لیتے ہیں ان میں سے کوئی ایک چیز پہلے سے موجود نہیں ہوتی اس کے برعکس تعمیری اظہار یہ ہے کہ الفاظ پہلے سے موجود ہوں اور نثر نگار ان کو اپنے مجوزہ ڈھانچہ کے مطابق کام میں لے آئے۔ بالفاظ دیگر "نثر نگار ایک ایسا معمار ہوتا ہے جس کے ارد گرد عمارت بنانے کا سامان موجود ہوتا ہے اور وہ اسے اپنی ضرورت کے مطابق استعمال میں لے آتا ہے"(1) الفاظ کو سہارا دونوں صورتوں میں لیا جاتا ہے مگر الفاظ کا استعمال مختلف النوع ہوتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں ان کے استعمال کی غرض وغایت اور صورت ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتی ہے۔ نثر میں الفاظ عام طور پر اپنے مروجہ مفہوم کے لئے ہی استعمال کئے جاتے ہیں مگر نظم میں ان کا مطلب اپنے مروجہ مفہوم سے قدرے مختلف بھی ہو سکتا ہے اور "نامانوس الفاظ نثر میں تو گراں گذرتے ہیں، لیکن شعر میں نہیں"(2) الفاظ کا یہی مختلف طرح سے استعمال نثر اور شعر کے اسالیب میں فرق پیدا کرتا ہے۔ نثر کے لئے اگر ایک اسلوب موزوں ہے تو شعر کے لئے دوسرا۔

نثر اور شعر میں کیفیت کا جو فرق ہوتا ہے، اس کی ایک خفیف سی جھلک اظہار میں نظر آتی ہے: نثر میں شعر کی نسبت اظہار زیادہ واضح اور روشن ہوتا ہے، "جہاں خیال

(1) ENGLISH PROSE STYLE BY H. READ, PP. X, XI.

(2) IBID., P. XII

غالب ہوتا ہے، نثر وجود میں آتی ہے اور جہاں جذبہ غالب ہوتا ہے وہاں شعر جنم لیتا ہے۔ (۱)"

اس مختصر تمہید سے جب یہ حقیقت واضح ہے کہ نثر کے لئے ایک مخصوص اسلوب لازمی ہے تو آئندہ سطور میں اسلوب نثر سے بحث کی جائے گی اور وہ نثر زیر بحث آئے گی، جو ادبی ہے، غیر ادبی نثر مطالعہ سے خارج ہوگی۔ اس مرحلہ پر ادبی اور غیر ادبی نثر کے امتیازی نشانات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ یہ امر مسلمی ہے کہ جو کچھ کہا جائے یا معرض تحریر میں آئے، ضروری نہیں کہ اس میں ادبی عناصر موجود ہوں۔ قتل کی ایک واردات کے متعلق ایک پولیس آفیسر اور افسانہ نویس کی تحریر (۱) میں فرق یقیناً ہوگا۔ اول الذکر کی تحریر بالعموم ادبی عناصر سے عاری ہوگی، اور مؤخر الذکر کی تحریر ان کی حامل ہوگی۔ ادبی عناصر سے مراد جذبہ اور اسلوب ہیں۔ ادبی نثر میں جذبہ شامل ہوتا ہے اور غیر ادبی میں نہیں۔ دریں صورت پولیس آفیسر کی رپورٹ میں صرف حقائق کا من و عن بیان ہوگا واقعات کا لکھنے والے یا دوسرے لوگوں پر جو اثر ہوا ہے اس کا ذکر رپورٹ میں شامل نہیں ہوگا۔ انتخاب و پسند کا عمل اس کی تحریر میں نظر نہیں آئے گا۔ اس کے برعکس افسانہ نویس کی تحریر میں اس کے اور دوسروں کے تاثرات کی ترجمانی بھی ہوگی اور واقعات میں سے انتخاب بھی کیا گیا ہوگا۔ اس حقیقت کی وضاحت دوسری صورت میں یوں کی جا سکتی ہے کہ ایک ہی پھول کے متعلق ایک انشاپرداز اور ماہر نباتات کے بیانات میں فرق ہوگا۔ انشاپرداز کے بیان میں جذبہ شامل ہوگا اور ماہر نباتات کے بیان میں نہیں، اسی جذبہ کی موجودگی اور عدم موجودگی کے سبب اسالیب بیان میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اظہار کو اسی لئے اپنی نوعیت کی بنا پر ادب میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ تحریر کے ادبی یا غیر ادبی اور پھر کسی حد تک شعر یا نثر ہونے کا انحصار اسی پر ہے۔

اپنی بات دوسروں کو سنانے اور پھر دوسروں کی بات خود سننے کا جذبہ چونکہ انسانی فطرت ہے۔ اس لئے ہر آن اور ہر لمحہ انسان کو کچھ سننے سنانے سے واسطہ پڑتا ہے

---

(1) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY: P. 71.

اور جب اس طرح سے کہنے سننے کی منزل آتی ہے، تو پھر بات کس طرح کہی گئی اور کیسے سنی گئی، تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی کہنے اور سننے کی سرزمین سے اسلوب کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

اسلوب بیان، طرز تحریر، اسلوب نگارش، سبک، پیرایہ بیان، انداز تحریر اور ان کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے لئے انگریزی ادبیات میں جو لفظ مستعمل ہے، وہ STYLE ہے۔ STYLE کے متعلق ENCYCLOPEDIA BRITANNICA اور دیگر متعلقہ کتب میں جو کچھ درج ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ "STYLE کا مادہ یونانی لفظ STILUS ہے نہ کہ STYLUS، جیسا کہ عام طور پہ خیال کیا جاتا ہے۔ STILUS دھات، لکڑی، یا ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک نوکدار آلہ ہوتا تھا، جس کے ساتھ قدیم یونان میں موم کی لوحوں پر حروف اور الفاظ کندہ کئے جاتے تھے۔ مرور ایام لفظ STILUS اوزار کا نام ہونے کے علاوہ اوزار سے پیدا شدہ نقوش یعنی جملوں اور عبارتوں کا مفہوم ادا کرنے کے لئے بھی استعمال ہونے لگا اور اس طرح سے ایک عمل جو شروع میں میکانکی تھا رفتہ رفتہ ذہنی یا تصوراتی بن گیا۔ STILUS سے پہلی مرتبہ جو نقوش بنائے جاتے تھے، وہ دھندلے اور ناہموار ہوتے تھے۔ دوسری مرتبہ STILUS کے کند حصہ کے ساتھ ان کو صاف اور ہموار کیا جاتا تھا"(۱) اسی رعایت سے ادب میں عبارتوں کی کانٹ چھانٹ STYLE کہلائی یا دوسرے الفاظ میں تحریروں کو بنانے سنوارنے کی عملی کوشش کو اسلوب بیان کا نام دیا گیا۔

اسلوب نثر سے کیا مراد ہے؟ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور مثالی اسلوب کیا ہے؟ یا اس سے متعلق جو دوسرے مباحث ہیں اُن کے بارے میں مغربی اور مشرقی زبانوں کے اکثر ادبا نے کس صورت میں اظہار خیال کیا ہے؟ ان سب مضامین سے آشنا ہونے کی واحد اور موزوں صورت یہ ہے کہ انگریزی تصورات کا تجزیہ کرنے سے قبل عربی اور فارسی مصنفین کی آرا کو پیش کر دیا جائے۔

علامہ ابن خلدون اپنی تاریخ کے دیباچہ میں اسلوب کے اجزائے لازمی

---

(1) ENCYCLOPEDIA BRITANNICA, PP. 488-9.

الفاظ اور معانی سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "معنی ہر شخص کے ذہن میں کچھ نہ کچھ موجود ہوتے ہیں، جن کو وہ نظم کر سکتا ہے، اس لئے ان کے سیکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی۔ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے "تالیف الفاظ اور ان کی نشست وبست کی، جو نظم ونثر کے قالب کہلاتے ہیں اور معانی کے ظروف۔ اور جیسے پانی بھرنے کے ظروف مختلف ہوتے ہیں، کوئی چاندی کا، کوئی سونے کا، کوئی تانبے کا، کوئی مٹی کا، اور سب میں پانی یکساں ہوتا ہے، اسی طرح یہ ظروف معنی ہیں کہ معانی ایک ہیں اور طریق ادا اور اسلوب بیان الگ الگ، جس کو جیسی زبان پہ قدرت ہوتی ہے، ویسا ہی اس کا اسلوب بیان ہوتا ہے۔ ایک بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر پہنچتا ہے تو دوسرا ادنیٰ درجہ پر ہی پڑا رہتا ہے، یعنی جو تالیف کلام اور اسلوب بیان کر جانتا اور اس پر قدرت رکھتا ہے اس کا کلام اونچے رتبہ کا ہوتا ہے اور جو ان باتوں کو نہیں جانتا وہ اپنا مطلب بھی نہایت ہی بھونڈے طریقے سے ادا کرتا ہے اور نظم و نثر بدمزہ اور پھیکی رہ جاتی ہے۔ (۱)

ابن خلدون کے ان خیالات سے دو باتیں ایسی ظاہر ہوتی ہیں جن کا اسلوب بیان کے ساتھ گہرا تعلق ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلوب کا لسانی عنصر اکتسابی ہے مگر معنوی عنصر اکتسابی نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ الفاظ ظروف کی مانند ہیں اور معانی پانی سے مشابہ۔ اس تشبیہ سے جو بدرجہ غایت معنی خیز ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ظاہری خوشنمائی، دلآویزی اور تنوع کا انحصار پہلے یعنی الفاظ پہ ہے اور الفاظ سے بحث کرنا چونکہ اسلوب سے بحث کرنا ہے، اس لئے کسی تحریر کے ظاہری حسن اور اس کے اسالیب کے متنوع ہونے کا دارومدار الفاظ پر ہے۔

ابن خلدون کے علاوہ عربی زبان کے دوسرے ادبا نے بھی اسلوب کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن ان سب کے ہاں بھی بحث کا وہی رنگ ہے جو ابن خلدون کے یہاں ملتا ہے۔ لفظ و معنی کے مباحث تک ہی ان کی آرا بھی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ صنائع لفظی

(۱) دیباچہ تاریخ ابن خلدون ــــــ اردو ترجمہ۔ مولوی عبد الرحمٰن ــــــ ص ۲۳۵

اور بدائع معنوی کا بیان ہی ان کے خیال میں اسلوب سے عبارت [1] ہے۔ ابن خلدون کے علاوہ جاحظ [2] اور ابن رشیق [3] کے نام اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں، لیکن ان کی آرا بھی چونکہ جامع اور مبسوط نہیں، اور منتشر خیالات کی صورت میں موجود ہیں۔ اس لئے صرف ابن خلدون کی رائے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

لفظ اور معنی کی تقسیم عربی سے فارسی میں داخل ہوئی اور امیر خسرو تک اس کا اثر گہرا رہا۔ نظامی عروضی، رشید الدین وطواط، امیر خسرو، ابو الفضل، خان آرزو اور قتیل کی آرا، فارسی ادبا میں سے قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی تحریروں میں لفظ اور معنی سے بحث کرتے ہوئے اسلوب کے متعلق اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ ان آرا کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں علم فصاحت اور علم بلاغت کے تمام مباحث لفظ اور معنی ہی کی تقسیم کا نتیجہ ہیں۔ فارسی مصنفین کی آرا سے مجموعی تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے معنی کی بجائے لفظ کو زیادہ اہمیت دی ہے اور اس طرح زبان کو جو محض اظہار خیال کا وسیلہ ہے، خیال سے زیادہ ضروری قرار دیا ہے۔ زبان کو غیر ضروری اہمیت دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لکھنے والے لفظی کھیل کھیلنے لگے۔

فارسی ادب میں لفظ اور معنی کی تقسیم کے باعث ہی مجاز اور حقیقی کا امتیاز قائم ہوا اور مطبوع اور مصنوع کے دبستان وجود میں آئے۔ باعتبار الفاظ اردو نثر کی چار قسمیں قرار دی گئیں: ۱۔ امرجز ۲۔ مقفیٰ ۳۔ مسجع ۴۔ عاری اور معانی کے لحاظ سے نثر کو سلیس سادہ، سلیس رنگین، دقیق سادہ اور دقیق رنگین کی صورت میں تقسیم کیا گیا۔ صنائع لفظی اور بدائع معنوی کے مباحث کو بھی اسی تقسیم نے جنم دیا۔ معانی کی بجائے

RHETORICS OF THE ARABS BY DR. ZOQI (1)

(یہ مقالہ صنائع لفظی اور بدائع معنوی سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان کے ادبا کے خیال میں اسلوب کی بحث صنائع لفظی اور بدائع معنوی تک محدود تھی)

(2) جاحظ نے اپنی تصنیف کتاب البیان میں جو تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی، اپنے نظریات بیان کئے ہیں

(3) ابن رشیق نے پانچویں صدی ہجری میں کتاب العمدہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

جب الفاظ کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی تو بعض مصنفین نے اس روش کے خلاف آواز بلند کی۔ نظامی عروضی ایسے مصنفین میں سے ایک ہے۔ اس نے اپنی تصنیف چہار مقالہ میں فن دبیری (۱) سے بحث کرتے ہوئے لفظ کی بجائے معنی کو زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ بعد از اں مشہور فارسی انشاپرداز اور اکبر کے درباری ابوالفضل نے بھی اپنے تیسرے دفتر میں معنی اور لفظ کے رشتہ کو جان و تن (۲) کا رشتہ قرار دیتے ہوئے معنی کی اولین حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور اپنی تحریر کے حدیث دل ہونے کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:۔

طلسم خویش را درہم شکستم | بہر حرفی طلسمی باز بستم
بداں تا ہر کہ دارد دیدہ دوست | ببیند مغز جانم ما دریں پوست
اگر من جان محبوبم، تن اینست | اگر یوسف شدم پیراہن اینست (۳)

ایران کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے فارسی ادبیات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اور معنی کی تقسیم اور پھر لفظ کو معنی کی بجائے زیادہ اہمیت دینے کا رجحان وہاں کی درباری زندگی کے سبب ہے۔ فارسی ادب درباری زندگی سے اس قدر متاثر نظر آتا ہے کہ بعض ادبا فارسی نثر کو درباری نثر تک ہی محدود رکھتے نظر آتے ہیں، نظامی عروضی کا فن دبیری کے متعلق مقالہ اس کی واضح مثال ہے۔ نثر کی اقسام کی تقسیم بلحاظ پیشہ جات بھی اسی نقطہ نظر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ امیر خسرو کی تصنیف اعجاز خسروی ہے، جس میں نثر کی قسمیں بلحاظ پیشہ جات (ص ۴) بیان کی گئی ہیں، ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ فارسی مصنفین کے برعکس مغربی مصنفین نے موضوع کے اعتبار سے نثر کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ درباری زندگی میں چونکہ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے علم و فضل

---

(۱) چہار مقالہ۔ نظامی عروضی۔ گب میموریل ایڈیشن (ص ۱۲)

(۲) دفتر ابوالفضل مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ (ص ۲۸۲)

(۳) دفتر ابوالفضل ۔۔۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ (ص ۳۵۹)

(۴) اعجاز خسروی ۔۔۔ امیر خسرو مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ (ص ۵۴)

کا مظاہرہ کیے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان کے ادبا نے زبان کا سہارا لے کر اپنی فضیلت کا سکہ منوانے اور دوسروں کو متاثر کرنے کے خیال سے صورت اظہار کی طرف زیادہ توجہ دینے پر مجبور تھے۔

اردو زبان چونکہ فارسی زبان کے زیر سایہ پروان چڑھی اس لئے جو نظریات فارسی ادب میں پیدا ہوئے، اردو ادب بھی ان سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جس طرح فارسی لکھنے والے اپنے علم و فضل کا مظاہرہ کرنے کے لئے عربی الفاظ بکثرت استعمال کرتے تھے، اسی طرح اردو لکھنے والے بھی بعض اوقات بلا ضرورت عربی اور فارسی الفاظ اپنی تحریروں میں لانے لگے۔

عربی، فارسی اور اردو ادبیات کا مجموعی طور پر جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اول جس طرح سے منظوم اور منثور کی تقسیم ان زبانوں میں موجود ہے۔ دوسری زبانوں میں نہیں۔ دوئم۔ معانی اور الفاظ کے متعلق اکثر نثریں پیچیدہ، طویل اور تقلیدی رنگ کی ہیں۔ سوئم لکھنے والوں کے پیش نظر اپنی ذات کی ترجمانی کی بجائے دوسروں کو متاثر کرنے کا خیال زیادہ رہا ہے اور مروجہ روش یا حکمران طبقہ کی پسند کے علاوہ اور زبان پر لانے کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔ چہارم۔ بالعموم تذکرہ نگاروں اور مورخوں کی توجہ نثر کے مقابلہ میں نظم کی طرف رہی ہے۔ عہد حاضر میں لکھی گئی چند کتابوں کو چھوڑ کر باقی سب تذکرے اور تاریخیں اس بات کی شاہد ہیں۔ اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ جب نثر کو نمایاں مقام ہی حاصل نہ تھا تو اس کے اسلوب کے متعلق واضح اور صحیح نظریات مشرقی ادب میں کہاں سے آجاتے۔ پنجم۔ شاعری چونکہ سب کی پسندیدہ صنف تھی اس لئے شعر کے متعلق جو نظریات قائم کئے گئے نثر کو بھی اکثر و بیشتر ان ہی کے پیش نظر جانچا گیا۔ ششم۔ زبان گو اکثر مصنفین نے جذباتی استعمال کی، لیکن جذبہ ان کی تحریروں میں قائم نہ رہ سکا۔ جذباتی زبان کے استعمال سے روایتی انداز بیان تو پیدا ہو گیا لیکن باشعور قاری سے ردعمل کے طور پر کسی قسم کے جذباتی ہیجان کی توقع باقی نہ رہی۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ مصنف کی ذات اور شخصیت کبھی اس

دور میں اہمیت حاصل نہ تھی، اسلوب کے ساتھ لکھنے والے کی شخصیت کا جو گہرا تعلق ہے، وہ اسی لئے ان کے مباحث میں ناپید ہے۔ اس دور میں لکھنے والا کسی نہ کسی دربار سے وابستہ ہوتا تھا اور وہ یا تو درباری ضرورت کے لئے لکھتا تھا اور یا پھر دوسرے لوگوں کی تفریح طبع کے لئے (دونوں صورتوں میں پیش نظر حکمران طبقہ ہی ہوتا تھا) بہر دو صورتیں میں اس کے سامنے قارئین یا سامعین کو متاثر کرنا ہوتا تھا اور اپنی فضیلت و علمیت کا اظہار مقصود ہوتا تھا، تاکہ مرتبہ و دولت حاصل ہو سکے۔ دونوں صورت لکھنے والا مجبور تھا کہ اپنے آپ کو بھول کر اپنے مخاطب و ممدوح کی پسند کے مطابق اپنی تحریر کو جنم دے۔ اسی طرز فکر نے اُس دور میں تبصرہ و تنقید کرنے والوں کو بھی اسلوب کے اسی پہلو کے متعلق غور کرنے پر اُکسایا جس کا تعلق سامعین و قارئین کے ساتھ تھا۔ فصاحت و بلاغت کی جملہ بحثیں اسی غرض سے وجود میں آئیں۔ ہفتم، زبان کی طرف غیر ضروری توجہ دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض صورتوں میں پہلے ہی سے موجود خیالات و رجحانات کی اشاعت ہونے لگی جدت وندرت کے مواقع بہت کم باقی رہ گئے اور مروجہ و منتخب الفاظ میں متداول و مقبول خیال پیش کئے جانے لگے۔ ہشتم، صرف و نحو کی طرف زیادہ توجہ دینے کا رجحان فارسی زبان میں اس قدر گہرا ہو گیا کہ عصر حاضر کے فارسی نقاد بھی اس سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ دور جدید کے مشہور فارسی شاعر، نقاد اور محقق ملک الشعرا بہار کی تصنیف "سبک شناسی" اس کی واضح مثال ہے۔ اس کتاب کے متعلق مصنف نے دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ یہ فارسی نثر کے اسلوب کی تاریخ ہے، مگر اس میں اسلوب کے لسانی پہلو کے علاوہ اس کے دوسرے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کم کی گئی ہے۔

۱۸۵۰ء کے سیاسی ہنگامہ کے بعد جب ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور علمی و ادبی ماحول میں تغیر رونما ہوا تو اردو ادب نے سر سید کی تحریک کے زیر اثر انگریزی ادب کے اثرات قبول کرنے شروع کئے۔ اس سے پیشتر فارسی اور عربی ادبیات کے زیر اثر ہی اردو ادب اپنی ارتقائی منازل طے کر رہا تھا۔ انگریزی ادب کے اثرات سے اردو نثر کے اسلوب میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس سے پہلے کی اردو نثر کے اسلوب

کی جو خصوصیات تھیں، اُن کے متعلق آئندہ ابواب میں بالتفصیل بحث کی جائے گی اس موقعہ پر صرف ان خیالات و نظریات کا اظہار مطلوب ہے جو انگریزی زبان میں اسلوب نثر کے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ ان آرا کے مطابق اردو نثر کے اسالیب بیان کا جائزہ بھی آئندہ ابواب میں ہی پیش کیا جائے گا۔

مڈلٹن مری[1]، اسلوب کو لفظ ابلاغ کا تقریباً ہم معنی قرار دیتے ہوئے، نثر اور نظم کے اسالیب میں امتیاز پیدا کرتے ہوئے لکھتا ہے "اسلوب زبان کی وہ کیفیت ہے جس کی مدد سے اختصار کے ساتھ جذبات یا خیالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ یا وہ اسلوب مصنف کے ساتھ مخصوص جذبات و خیالات کا ایک ڈھانچہ ہے۔ جہاں خیالات غالب ہوں، وہاں اظہار نثر میں ہوتا ہے اور جہاں جذبات بہت شدید ہوں، وہاں ان کی ترجمانی نظم میں ہوتی ہے۔ اسلوب اس صورت میں تکمیل پاتا ہے، جب جذبے یا خیال کا اظہار مکمل صورت میں ہو۔ اسلوب کا انحصار کلی طور پر ابلاغ یا اظہار کے اختصار پر ہے۔ اظہار میں اگر اختصار نہ ہوگا، تو اسلوب کا فقدان ہوگا..... (پھر) نظم ادب کی اولین صورت ہے اور نثر بعد کی ترقی یافتہ۔ اسلوب نثر کے لئے ضروری ہے کہ بیان میں اختصار ہو، دلائل منطقی انداز میں ہوں، اوزان و قوافی سے آزاد ہو، اور خیال تیزی کے ساتھ مگر دھیمے پن کی خوبی سے آراستہ پیش کیا جائے۔ انفرادی اسلوب کا معیار یہ ہے کہ ہم اس ادب کے متعلق یہ محسوس کریں کہ تحریر کے لئے وہ ناگزیر ہے۔ پھر جس تجربہ یا جذبہ کا بیان ہو، ہم اس کو محسوس کر سکیں۔[1]"

سر آرتھر کوئلر کاؤچ کے خیال میں اچھا اور مناسب اسلوب وہ ہے جو دل و دماغ کے فکری عمل کا نتیجہ ہو، یعنی جس میں جذبہ اور فکر شامل ہوں۔ والٹر پیٹر کے نزدیک بھی اسلوب دل و دماغ ہی کا عمل ہے۔ وہ اس عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"لکھتے رہنے سے جب آپ کو زبان پر قدرت حاصل ہو جائے، تو اس وقت آپ چاہیں یا نہ چاہیں، آپ اپنی تحریر میں اپنے آپ کو عیاں کر دیتے ہیں۔ ہر گناہ خواہ وہ کتنا ہی لاشعور

---

(1) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY, PP. 56-8, 71, 73.

(2) ON THE ART OF WRITING BY Q. COUCH. P. 293.

کے پردوں میں چھپا ہوا ہو اور ہر نیکی خواہ وہ ظاہر ہونے سے کتنی ہی شرمائے، یعنی آپ کے کردار کا ہر پست و بلند پہلو صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔"[1] بالفاظ دیگر انسان کے جذبات و خیالات اس کی تحریر میں یقیناً نمایاں ہو جاتے ہیں۔ تحریر کی اسی خوبی کو انگریزی زبان میں (SINCERITY) کا نام دیا گیا ہے۔ ابوالفضل اسے حدیث نفس[2] قرار دیتا ہے اور اردو میں اسے خلوص کے لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ہارڈلیس اوگریڈی تو خلوص ہی کو اسلوب قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے "اگر آپ (اپنی تحریر کا) اسلوب چاہتے ہیں، تو یہ آپ کا اپنا ہونا چاہیئے"[3] یعنی یہ آپ کے اپنے خیالات و جذبات کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ جب اسلوب اس طرح سے مصنف کے ذاتی خیالات و جذبات کا ترجمان بنتا ہے، تو پھر وہ اس کا اسلوب بیان ہوتا ہے، یعنی اس کی تحریروں کا خاص ادبی اسلوب قرار پاتا ہے عظیم مصنفین کے اسالیب بیان میں باعتبار سادگی، زور اور زیر و بم، بہت اختلاف ہوتا ہے۔ مگر اختلاف کے باوجود ان میں بعض صفات مشترک بھی ہوتی ہیں"[4]

ہنری بٹ کا خیال ہے کہ اسلوب کی بحث کا تعلق کسی تحریر کے موضوع کی بجائے اس کی ہیئت سے زیادہ ہے۔ ہر وہ شے جو ادا کیا جا سکتا ہے، بیان کرنے والے کی اپنی ملکیت بن سکتا ہے، اگر وہ اسے نہایت حسین پیرایہ میں بیان کر دے۔ بعض مصنفین کے ہاں قوت خیال زیادہ ہوتی ہے اور بعض کے ہاں قوت اظہار۔ ادب میں عظمت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب اچھا خیال زبان میں پیش کیا جائے۔ اسلوب سے بحث کرتے ہوئے، سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ لکھنے والا الفاظ کا انتخاب کیسے کرتا ہے اور پھر ان کی جملہ بندی کس طرح کرتا ہے۔ نثر میں بڑی مشکل غیر معمولی بات کا کہنا

---

(1) STYLE BY W. RALEIGH, P. 128.

(2) دفتر ابوالفضل۔ مطبوعہ نو لکشور پریس لکھنؤ۔ ص 259

(3) ON MATTER, FORM AND STYLE BY H. O. GRADY, P. 123

(4) THE SECRETS OF STYLE H. BETT, P. 111.

ہوتا ہے اور شعر میں معمولی بات کا"(1) محولہ بالا رائے سے ظاہر ہے کہ ہنری بٹ کے خیال میں اسلوب کا تعلق زیادہ تر زبان سے ہے۔

اس کے برعکس بی۔ ڈابری زبان کی بجائے موضوع اور مصنف کی شخصیت کو زیادہ اہم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے "مجھ سے یہ پوچھا جائے گا کہ ہمارا واسطہ مصنف کے ساتھ کیسے پڑے گا۔ جواب ہوگا، اس کی آواز کے زیر و بم سے، کیونکہ جب بھی کوئی کتاب پڑھی جاتی ہے، خواہ اسے اونچی آواز سے پڑھا جائے یا مدہم آواز سے اور ذہن میں الفاظ بناتے ہوئے ہم ایک آواز سے آشنا ہوتے ہیں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم دوسروں کے ساتھ بات چیت کر رہے ہوں، کوئی ہمیں کچھ بتا رہا ہو، ہمارے جذبات کو ابھار رہا ہو۔ ہر تحریر کی جداگانہ آواز ہے جسے اسلوب کہتے ہیں۔ مصنف اپنی شخصیت کو چھپانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، وہ اپنی آواز یعنی اسلوب کو نہیں بدل سکتا اور پھر بالآخر یہ اسلوب ہی ہوتا ہے، جس کی بنا پر ہم کسی مصنف کو عظیم قرار دیتے ہیں۔"(2)

محض زبان ہی کو اگر اسلوب کا معیار قرار دیا جائے تو مڈلٹن مرے کا خیال ہے کہ یہ ایسے ہی ہوگا، جیسے کسی شخص کی عظمت کا اندازہ اس کے لباس سے لگا لیا جائے "اسلوب" مرے کے خیال میں "مصنف کا لباس نہیں، بلکہ اس کا گوشت پوست ہے، اس کا خون ہے۔ اس کی ہڈی ہے"(3) مرے کی اس رائے سے پوپ کی اس رائے کی بھی تردید ہوتی ہے جس میں پوپ اسلوب کو محض لباس قرار دیتا ہے، کارلائل بھی اس سلسلہ میں مرے ہی کا ہم خیال ہے۔ اس مرحلہ پر مرے اور ابوالفضل کے نظریات میں جو حیرت انگیز مماثلت ہے، وہ قابل ذکر ہے۔ اس سے قبل ابوالفضل کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ لفظ و معانی کے رشتہ کو جسم و جان کا رشتہ قرار دیتا ہے۔

---

(1) LBID., PP. 18-9, 174.

(2) MODERN PROSE STYLE BY B. DOBREE, PP. 3, 4.

(3) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY, P. 134.

اب غور کیجئے کہ مغرب و مشرق کے دو فن کار کس حد تک اسلوب کے بارہ میں ایک دوسرے کے ہم خیال ہیں۔

فلابیر کے خیال میں اسلوب سے بحث کرتے ہوئے خیال اور ہیئت دونوں ہی اہم ہیں، وہ لکھتا ہے۔" نہ تو خوبصورت ہیئت کے بغیر خوبصورت خیال ہوتے ہیں اور نہ ہی خوبصورت خیال کے بغیر خوبصورت ہیئت ہوتی ہے۔ خیال کو ہیئت سے الگ کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ خیال کا وجود بھی ہیئت کے سہارے ہے، اسلوب، مصنف کے سوچنے اور دیکھنے کا ذاتی انداز ہے [1]"۔ جب ذاتی دید اور فکر کی منزل آجائے" تو پھر ذاتی غور و فکر کا انفرادی انداز مصنف کو زبان کے ذاتی استعمال پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح سے ایک حقیقی اسلوب بالضرور منفرد اسلوب کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے [2]"!

والٹر پیٹر کا خیال ہے کہ" اسلوب کی بحث اس مرحلے پر چھڑتی ہے، جب فن کار پہلے اپنے آپ کا محاسبہ کرتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے اور پھر سوچ بچار کے بعد اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ دوسرے اس سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں [3]" چیخوف نے بھی گورکی کو ایک خط میں اسلوب کے بارہ میں تقریباً یہی کچھ لکھا ہے۔ "جب آپ کسی چیز کا خاکہ اس طرح پیش کریں کہ اسے دیکھا اور چھوا جا سکے، تو تحریر کا اسلوب حقیقی ہوگا [4]" بالفاظ دیگر جب تحریر ایسی ہو کہ جس کے مطالعہ سے پیش کی گئی چیز ہو بہو آنکھوں کے سامنے آجائے، تو اس صورت میں تحریر کا اسلوب مثالی اسلوب ہوگا یعنی وہ ایسا اسلوب ہوگا، جس سے بہتر موضوع کے لئے ممکن نہیں۔ اسی بات کو استاندال ان الفاظ میں پیش کرتا ہے "خیال سے مکمل مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کے لئے متعلقہ خیال کا پورا ماحول بھی پیش کیا جاتا ہے [5]" یعنی کہ وہ تحریر جس سے ابلاغی مقصد کی تکمیل بحد کمال مطلوب

---

(1) APPRECIATION WITH AN ESSAY ON STYLE BY PATER. P. 30

(2) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY, P. 15.

(3). APPRECIATION WITH AN ESSAY ON STYLE BY PATER, P-34.

(4) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY, P. 83.

(5) IBID., P. 79.

ہو، اس کا اسلوب ایسا ہونا چاہیے کہ جو قابل ابلاغ خیال، جذبہ یا تجربہ کا مکمل ماحول بھی پیش کرے۔

اسلوب کے متعلق ٹیلنی سن کا یہ خیال ہے کہ اسلوب کا تعلق بات کہے جانے کی نوعیت سے ہے۔ وہ کہتا ہے "قابل توجہ یہ بات نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں"(۱) یہی کس طرح کہنا اسلوب کا اہم پہلو ہے۔ نیومین بھی زبان ہی کو زیادہ اہمیت دیتے ہوئے کہتا ہے "جس طرح کسی شخص کے تخیلات اور احساسات ذاتی ہوتے ہیں، اسی طرح اس کی زبان بھی اس کی ذاتی ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلوب، زبان کے ذاتی طریقہ استعمال کا نام ہے"(۲) مذکورہ آراء کے مقابلہ میں بفون BUFFON کے مشہور الفاظ "اسلوب ہی مصنف ہے"(۳) مختصر ہونے کے باوجود جامع اور پر معنی تعریف پیش کرتے ہیں۔ اسلوب کی بحث چونکہ مصنف کی ذات کے گرد ہی گھومتی ہے اور اسلوب کے تمام پہلوؤں پر حاوی لکھنے والے کی ذات ہی ہوتی ہے، اس لیے مصنف کی ذات سے واقف ہونا ہی دراصل اسلوب سے واقف ہونا ہے۔ کسی مصنف کی تحریر کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے ہمیں مصنف کے پیش کردہ خیالات و جذبات اور اس کی استعمال کردہ زبان کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں اس مطلب کو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ اسلوب مصنف ہی کی ذات کا ترجمان ہوتا ہے یا اسلوب ہی مصنف کے راز افشا کرتا ہے، یا مصنف کے دل و دماغ کا حیطہ تخلیقی عمل ہی اسلوب کا دوسرا نام ہے۔

مغربی مصنفین کی پیش کردہ جملہ آراء سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اکثریت ان مصنفین کی ہے جو اسلوب کے متعلق بحث کرتے ہوئے مصنف کی شخصیت کو نہیں بھولتے اور اسے اولین اہمیت دیتے ہیں، الفاظ یعنی زبان ان کے ہاں ثانوی حیثیت رکھتی ہے وہ ابلاغ کے ذریعہ یا وسیلہ کو زیادہ ضروری نہیں سمجھتے بلکہ قابل ابلاغ جذبہ، تجربہ یا خیال کو زیادہ

---

(۱) اردو کے اسالیب بیان ۔۔۔ ڈاکٹر زور ص ۱۴۹

(2) اردو کے اسالیب بیان ۔۔۔ ڈاکٹر زور ص ۱۵۰

(3) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY. P. 14.

اہمیت دیتے ہیں۔ پھر مشرقی مصنفین کے برعکس وہ نثر کو بلحاظ پیشہ جات تقسیم نہیں کرتے بلکہ موضوع کے مطابق اس کی مختلف اقسام کا جائزہ لیتے ہیں۔ گو مشرقی مصنفین کے طریقہ کے مطابق بھی بات آخر میں موضوع تک ہی پہنچ جاتی ہے، کیونکہ ہر پیشہ سے متعلق موضوع بھی دوسرے پیشہ کے موضوع سے مختلف ہوتا ہے، لیکن مشرقی مصنفین کے اس انداز فکر سے ان کے ہاں الجھن اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور بیان میں قطعیت نہیں آتی۔ موضوع جو قابل اعتنا ہوتا ہے وہ پس پردہ رہ جاتا ہے اور وسیلہ سامنے آجاتا ہے۔ گذشتہ مباحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مشرقی مصنفین کے مقابلہ میں مغربی مصنفین کی آرا اسلوب کے بارہ میں زیادہ سائنٹفک اور جامع ہیں۔ مغربی مصنفین اسلوب کے جملہ پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں اور پھر ساتھ ہی ساتھ اسلوب کے متعلق پیش کردہ نظریات کے مطابق انگریزی نثر کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ مشرقی مصنفین اس طریقہ سے کام کرتے ہوئے شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں اور پھر ان کے مباحث اسلوب کے جملہ پہلوؤں پر حاوی بھی نہیں ہوتے، وہ صرف اسلوب کے لسانی پہلو کی طرف ہی متوجہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ ہے کہ وہ چونکہ زبان کو قابل درس و تدریس خیال کرتے ہیں، اس لئے اپنی مساعی کا مرکز اسی کو بناتے ہیں اور تحریر سے بحث کرتے ہوئے زبان ہی کی طرف زیادہ زور دیتے ہیں۔

عربی، فارسی اور انگریزی میں اسلوب کے متعلق کہی گئی اہم باتوں کو احاطۂ تحریر میں لانے کے بعد اب یہ بیان کر دینا مناسب ہے کہ ان نظریات کو جو اردو زبان میں اسلوب کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ آئندہ ابواب میں جہاں اردو نثر نگاری کے اسالیب کا تجزیہ ہوگا وہاں ہی پیش کر دیا جائے گا، کیونکہ بصورت دیگر غیر ضروری تکرار کا امکان ہے۔

اسلوب کے متعلق بالعموم اور اسلوب نثر کے متعلق بالخصوص ضروری باتیں بیان کر کر دینے کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام عناصر یا پہلوؤں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے، جن کو اسلوب نثر کے متعلق بحث کرتے ہوئے زیر بحث لانا ناگزیر ہوتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر موضوع، اجتماعی اور شخصی ماحول، روایت، لفظ، تشبیہ، استعارہ، تکیہ کلام،

جملہ اور مثالی اسلوب وغیرہ مباحث کے متعلق اظہار خیال کر دیا جائے۔

موضوع۔ تقریباً سبھی ادیب اس بات پر متفق ہیں کہ تمام موضوعات کے لئے ایک ہی قسم کا اسلوب ناممکن ہے اور اگر ناممکن نہیں تو ناموزوں ضرور ہے۔ مختلف موضوعات کے لئے مختلف قسم کے اسالیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ بی۔ ڈابری[1] اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی نثر کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے نثر کو موضوعات کے اعتبار سے NARRATIVE (حکایاتی) DESCRIPTIVE (بیانیہ) EXPLANATORY (تشریحی) اور EMOTIONAL (جذباتی) میں تقسیم کرتا ہے۔ اسی تقسیم کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتا ہے "ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ایک ہی شخص مختلف اسالیب کا مالک ہو، جبکہ وہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھا رہا ہو۔ جب مصنف ہمیں کچھ بتانا چاہتے ہیں، کسی واقعہ کو ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، کسی چیز کا خاکہ ہمارے سامنے لانا چاہتے ہیں تو ان کی تحریر کا اسلوب DESCRIPTIVE ہوتا ہے۔ یا جب وہ کسی بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں (مثلاً سائنس کے مطالب و مضامین) یا تبصرہ و تنقید کرنا چاہتے ہیں، تو ان کا اختیار کردہ اسلوب EXPLANATORY ہوتا ہے یا جب وہ محض ہمارے جذبات کو ابھارنے مثلاً رنج، خوشی یا غصہ یا جذبہ پیدا کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، تو ان کی تحریر کا اسلوب EMOTIONAL ہوتا ہے۔" ہینری بٹ کے خیال میں تو "اسلوب کا راز ہی موضوع اور ہیئت کے باہمی تعلق میں مضمر ہے۔"[2] موضوع اگر شدید جذبہ ہو گا تو مصنف اکثر تیور حروف استعمال کرے گا، موضوع اگر منطقیانہ ہو گا تو بات طویل فقرات میں کہی جائے گی اور پھر بعض موضوعات بھی ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے لئے پیچیدہ اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً تخیل کی پیداوار پریشان خیالات کے اظہار کے لئے پیچیدہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ موضوع اگر مصنف کے ذہن میں صاف، نمایاں اور قطعی صورت میں ہو تو اسلوب پیچیدہ نہیں

---

(1) MODERN PROSE STYLE BY B. DOBREE, P. 10.

(2) THE SECRETS OF STYLE BY H. BETT, P. 271.

ہوتا، بلکہ صاف۔ سادہ اور رواں ہوتا ہے۔

شخصی اور اجتماعی ماحول۔ موضوعات کا تعلق چونکہ زندگی سے ہے، اس لئے اسلوب ہماری شخصی اور اجتماعی زندگی یعنی انفرادی اور اجتماعی ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات مصنف صرف روایت پرستی کی خاطر ہی ایک خاص اسلوب کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے اور بعض صورتوں میں وہ اپنے ذاتی میلانات و رجحانات کی بنا پر مجبور ہوتا ہے کہ روایت کے خلاف بغاوت کرتا ہوا موضوع اور اپنی رفتار طبع کے مطابق انفرادی اسلوب اختیار کرے، بہر صورت اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادبی روایات کا بھی اسلوب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ہربرٹ ریڈ اس بارہ میں لکھتا ہے: "روایت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اسے وراثت میں نہیں پایا جا سکتا، بلکہ اسے حاصل کرنے کے لئے سخت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، اس میں پہلی چیز جس کی ضرورت ہوتی ہے تاریخی شعور ہے۔ اور تاریخی شعور ایک ایسا تصور ہے، جس کے احساس اور کردار کے باہمی عمل سے ایک خاص اسلوب پیدا ہوتا ہے جسے روایتی اسلوب کہا جاتا ہے۔ (یعنی ادبی روایات کے احساس کے ساتھ ذاتی رجحانات کی کشمکش کے بعد جو اسلوب پیدا ہوتا ہے وہ روایتی کہلاتا ہے۔) اسلوب نثر میں روایت کا دخل اس وقت ہوتا ہے جب تنقیدی آرا زبان کی محاوراتی ساخت (یعنی محاورات) کے گرد گھومنے لگتی ہیں، کچھ عرصہ کے لئے ذاتی، ابتدائی اور سماجی و مذہبی اثرات زبان کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں اور پھر ایک مقام ایسا آجاتا ہے، جہاں یہ اچانک محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان اثرات کا نتیجہ ایک ایسی خاص اپنائیت کی صورت میں نکلا ہے جو آواز، احساس اور سہولت سے بالکل ہم آہنگ ہے روایت کا تعلق زیادہ تر اظہار کے لب و لہجے اور زمانے کے ساتھ ہے۔"[1]

انگریزی، عربی، فارسی اور اردو تقریباً سب زبانوں کی تاریخ میں ہمیں ان ادوار کا سراغ ملتا ہے، جب مصنفین نے روایت کو اپنایا اور مروجہ اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی، اکثر ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی موضوع کو دو مختلف اسالیب میں پیش کیا گیا اور

(1) ENGLISH PROSE STYLE BY H. READ. PP. 203 TO 211.

بعد کے آنے والے مصنفین نے ہر دو اسالیب کی تقلید میں کتب لکھیں، فارسی ادب میں اس کی واضح مثال اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری ہے اور اردو ادب میں اس کی دلکش مثال نو طرز مرصع اور باغ و بہار ہے۔ اجتماعی میلانات یا ماحول کا اثر لکھنے والے پہ یہاں تک ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کے انتخاب کے علاوہ موضوع کا انتخاب بھی عام رجحانات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ عصر حاضر کے اردو ادب میں افسانوں کی زبان اور ان کا موضوع مذکورہ طریق کے نمایاں شواہد ہیں۔

شخصی ماحول جو ادیب کے گھر، اشیائے خانہ اور افراد خانہ سے عبارت ہے اس سے بھی ادیب اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رات دن شخصی ماحول کے جن عناصر سے اس کا واسطہ پڑتا ہے وہ شعوری یا غیر شعوری حالت میں یقیناً اس کی تحریر میں اپنی جھلک دکھا دیتے ہیں۔ افسانہ نویس اگر ایک نیک خاندان کا چشم و چراغ ہے، تو وہ بالعموم اپنے افسانوں میں جس زندگی کو پیش کرے گا اور جس زبان کو وسیلۂ اظہار بنائے گا۔ اس سے امارت کا اظہار لازماً ہو گا۔ اردو میں قرۃ العین حیدر کے افسانے اس کی نمایاں مثال ہیں۔ الفاظ اور موضوع کے ساتھ بھی چونکہ اسلوب کا تعلق ہے اس لئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب شخصی اور اجتماعی ماحول سے بھی متاثر ہوتا ہے۔

لفظ

اجتماعی یا شخصی میلانات سے مجبور ہو کر یا دیگر محرکات کی بنا پہ موضوع منتخب کر لینے کے بعد اس کے اظہار کے لئے مصنف کے پاس جو خام مسالا موجود ہوتا ہے، وہ زبان ہے یعنی الفاظ کا انتخاب بھی موضوع کی طرح ہمارے سامنے مصنف کی پسند و ناپسند کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ جس طرح ایک جنسی مسائل کو پیش کرنے والے افسانہ کے مطالعہ سے ہم افسانہ نگار کے متعلق یہ اندازہ لگا لیتے ہیں کہ وہ جنسی مسائل سے بے حد متاثر ہے اسی طرح ہم کسی تحریر میں فلسفیانہ اصطلاحات دیکھ کر تحریر کے مصنف کے بارہ میں یہ فیصلہ صادر کر سکتے ہیں کہ وہ فلسفی ہے۔ شعروں کے انتخاب کی طرح لفظوں کا انتخاب بھی ان کے استعمال کرنے والے کے ذہن کی غمازی کرتا ہے۔ اس موقعہ پہ غالب مرحوم کا ایک مصرع ہماری رہبری کے لئے کافی ہے۔ کہتے ہیں:۔

ورنہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ !

جن میخانوں کی طرف غالب مرحوم نے مذکورہ مصرع میں اشارہ کیا ہے، فی الحقیقت ان میخانوں سے آگاہ ہونا ہی اسلوب کی بحث سے آشنا ہونا ہے۔

بعض مصنفین نے اسلوب کو محض لفظوں کا ہی کھیل بتایا ہے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ "موضوع کو ہم ہئیت یا الفاظ سے الگ نہیں کر سکتے ۱" لفظوں کے انتخاب کے متعلق کولر کا وِچ لکھتا ہے: "لفظوں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط کی عادت کا اکثر اوقات یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عبارت میں روانی باقی نہیں رہتی اور اس سے بھی بڑی خامی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ مصنوعی الفاظ استعمال کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے ۲"

الفاظ بھی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی اپنی ذات ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی، ان کی زندگی یا موت، چمک یا فرسودگی ان کے سیاق و سباق پر منحصر ہوتی ہے۔ بعض اوقات لفظ کے خوبصورت دکھائی دینے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ لفظ مدت سے جن الفاظ کے ساتھ استعمال ہو رہا ہوتا ہے۔ اب بھی ان کے ساتھ ہی استعمال کیا گیا ہوتا ہے۔ لفظ کا دیگر الفاظ کے ساتھ یہ رشتہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ماں کا اپنے بچوں کے ساتھ، جس طرح ماں اپنے بچوں کے ساتھ ہی اچھی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح ایک لفظ ان لفظوں کے ساتھ اچھا معلوم ہوتا ہے جن کے ساتھ وہ مدت سے استعمال ہو رہا ہوتا ہے۔ اور پھر (اس کے برعکس) بعض صورتوں میں لفظ کے اجنبی یا ناموزوں ہونے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ لفظ اجنبی یا غیر مانوس الفاظ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہوتا ہے ۳" محاوروں کی صورت میں یہ بات خاص طور پر قابل غور ہے۔

لفظ کے ساتھ خیال کا جو تعلق ہے۔ اس کے پیش نظر سپنسر لکھتا ہے، "جب

---

(1) APPRECIATION WITH AN ESSAY ON STYLE BY PATER, P 38.

(2) ON THE ART OF WRITING BY Q. COUCH, P. 241.

(3) MATTER, FORM AND STYLE BY H. O'GRADY, PP. 69, 121.

خیال کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا مناسب ہے۔ تو پھر الفاظ بھی کم حروف والے استعمال کرنے چاہئیں۔ زیادہ حروف والے الفاظ اور وہ الفاظ جن کو منہ بھر کر کہا جائے۔ ان سے خیال کے طویل اور زور دار ہونے کا پتہ ملتا ہے۱؎۔ اور پھر "تحریر میں مصنف کی شخصیت کا دخل جتنا بھی کم ہو، اتنی ہی زبان سادہ ہوتی ہے۔ حساب اور الجبرا کے مضامین میں ایسا ہی ہوتا ہے۲؎"

مڈلٹن مرے کا لفظ کے بارہ میں یہ خیال ہے کہ "تخلیقی فنکار ایک ڈاکٹر کی مانند زبان کے جسم میں نئے معانی اور تازہ تصورات داخل کرتا ہے۔ تاکہ زبان دوبارہ جوان ہو جائے اور اس کی رگوں میں خون دوڑنے لگے۔ صحافی بالعموم اوسط درجہ کے لوگوں کی زبان استعمال کرتا ہے اور تخلیقی فنکار نئے نئے محاورے بناتا ہے۔"

زبان کو اگر مصنف حیات نو بخشنے سے قاصر رہے، تو اسے زبان کو زندہ تو ضرور رکھنا چاہیئے۳؎۔ "زبان کو زندہ رکھنے سے یہ مراد ہے کہ لفظ استعمال ہوتے رہیں وہ متروک نہ ہو جائیں —— اور پھر لفظوں کے ساتھ کچھ روایات وابستہ ہوتی ہیں، انہی روایات اور لفظ کی اسی زندگی یا سرگزشت کو سامنے رکھ کر کسی خیال کو ادا کرنے کے لئے لفظ کا انتخاب عمل میں آتا ہے۴؎۔"

ہنری کابٹ اسی سلسلہ میں لکھتا ہے: "ہر لفظ کی ایک خاص آواز ہوتی ہے، اس کا خاص مفہوم ہوتا ہے اور فقرے میں دوسرے الفاظ کے ساتھ اس کا خاص تعلق ہوتا ہے اور پھر وہ تمام ادبی روایات ہوتی ہیں، جو بمرور ایام اس کے گرد جمع ہو چکی ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں لفظ کی آواز اور اس کے مفہوم میں گہرا اور واضح تعلق ہوتا ہے (مثلاً کھڑکھڑاہٹ)، لفظ کی آواز کا انحصار ایک حد تک ان الفاظ کی آواز پہ

(1) THE PHILOSOPHY OF STYLE BY SPENCER, P.9.

(2) STYLE BY W. WRIGHT, P. 52.

(3) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY, PP. 112-17.

(4) APPRECIATION WITH AN ESSAY ON STYLE BY PATER, P.17.

بھی ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ استعمال کیا جارہا ہو۔ یہی لفظ کے معنی کی نوعیت ہے۔ اس کے علاوہ آوازہ اور مفہوم کا انحصار الفاظ کی حرکت پر منحصر ہے۔ فقرے میں لفظ کا اثر بھی آوازہ اور مفہوم کے اعتبار سے اس کے محل استعمال پر مبنی ہوتا ہے ہر لفظ کی آوازہ کا انحصار اس کے حروف کی آوازوں پر ہوتا ہے اور پھر یہی حروف لفظ کے مفہوم کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ حروف کی ترتیب و تکرار سے نغمہ اور ترنم پیدا ہوتا ہے اور لفظ کی تکرار سے تکیہ کلام کا سراغ ملتا ہے۔ کسی مصنف کا تکیہ کلام معلوم ہو جانے کے بعد بآسانی اس کی تحریروں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ اور لکھنے والے کی افتادِ طبع کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض حروف ایک موضوع کے لئے مناسب ہوتے ہیں اور بعض ناموزوں۔ متحرک حروف کی تکرار لکھنے والے کے حرکت پسند ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ لکھنے والے کے سامنے لاتعداد الفاظ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان میں سے اپنی ضرورت کے مطابق کسی لفظ کو اس کے مفہوم، اس کی آواز اور اس کی ادبی سرگزشت کو مدنظر رکھتے ہوئے منتخب کر لیتا ہے۔ اچھا مصنف بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیشہ نہایت موزوں الفاظ سے کام لیا جائے۔ بالکل ہم معنی الفاظ وجود ہی نہیں رکھتے۔ تھوڑا بہت فرق ان میں ضرور ہوتا ہے۔ زبان کا کام چونکہ خیالات کا دوسروں تک پہنچانا ہے، اس لئے اسلوب اگر زبان کو اپنا ابلاغی فرض بآحسن طریق ادا کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو وہ اسلوب پسندیدہ نہیں۔ اگر کسی لفظ کا مفہوم اس کے تاریخی مفہوم (یعنی جو اس کا لغوی مفہوم تھا) سے مختلف لیا جانے لگے تو اسے قبول عام حاصل ہو جانے کی صورت میں صحیح تسلیم کر لینا چاہیئے یعنی غلط العام الفاظ کو درست خیال کر لینا چاہیئے۔ لیکن کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ یہ صورت پیدا نہ ہو۔"

الفاظ کی فرسودگی کے سلسلے میں یہ خیال ہونا چاہیئے کہ "الفاظ کثرت استعمال سے فرسودہ ہوتے ہیں لیکن اچھا مصنف اس سے بچنے کے لئے الفاظ کو فقرے میں اس طرح

(1) THE SECRETS OF STYLE BY H. BETT, P. 77

استعمال کرتا ہے کہ جیسے وہ خزانہ سے نکلے ہوئے نئے سکے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نئے الفاظ یا ایک بھی نیا لفظ نہیں بنا سکتا۔ لیکن وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ جملہ میں ان کی ترتیب کو بدل کر ان میں ایسی تازگی، جدت اور موزونیت پیدا کر دے کہ وہ نئے دکھائی دینے لگیں۔ بکمار کی صورت میں یہ بات ممکن نہیں ہوتی، کسی مصنف کی انفرادیت معلوم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ان الفاظ کا سراغ لگا لیا جائے۔ جو وہ بکثرت استعمال کرتا ہے۔ الفاظ کا تعلق چونکہ بہت بڑی حد تک دماغ کے ساتھ ہے اور دماغ شخصیت کا ایک حصہ ہے (۱) اس طرح اس لحاظ سے بھی الفاظ کا رشتہ مصنف کی ذات کے ساتھ نمایاں ہے۔ الفاظ تحریر میں پکار پکار کر کہتے ہیں کہ ہمارا خالق فلاں شخص ہے اس کی تعلیم اس درجہ کی ہے، اس کے مطالعہ میں فلاں فلاں کتب رہی ہیں اور اس نے فلاں فلاں اساتذہ فن سے اکتساب فیض کیا ہے۔ جس طرح ہم ریڈیو پر بولنے والے کو اس کی آواز سن کر پہچان لیتے ہیں، اسی طرح ہم کبھی مصنف کی تحریر کو دیکھ کر مصنف کا سراغ لگا لیتے ہیں۔

استعارہ

لفظ بعض اوقات صرف اپنے لغوی معنوں کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتا، بلکہ مجازی معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ امجد شیر ہے۔ تو شیر کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال نہیں ہو رہا ہوتا بلکہ بطور استعارہ مجازی مفہوم ادا کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی شیر کی ایک صفت جو کہ بہادری ہے، مذکورہ فقرہ میں شیر کا لفظ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔ استعارہ کی ضرورت تحریر میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب خیال کو سیدھے سادے طریقہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اسے محسوس اور معروف صورت دے کر پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا مثال میں جب ہم نے امجد کی بہادری کو واضح کرنا چاہا، تو ہم نے شیر کا نام لے دیا، جو بہادری کے لئے مشہور ہے۔

اگر کسی شخص میں استعارات پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو اس سے اس شخص کے شاعرانہ ذہن رکھنے کا پتہ چلتا ہے۔ استعاروں کا بکثرت استعمال ہمیشہ شاعرانہ

(1) ENGLISH PROSE STYLE BY B. DOBREE, PP. 10, 11.

انداز بیان میں ہوتا ہے، نثر میں استعارات کو اکثر اوقات اسی مرحلہ پر کام میں لایا جاتا ہے جب نثر اور شاعری کی حدود آپس میں مل رہی ہوتی ہیں۔[1] یعنی وہ نثر جسے انشا، ادب لطیف اور جذبہ آمیز نثر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس میں استعارات بالعموم استعمال ہوتے ہیں۔

'استعارے کسی تحریر میں ایسے ہی ہوتے ہیں، جیسے کپڑے پہ زر و جواہر، جس طرح کپڑے سے زر و جواہر اتار دینے سے اس کی افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اسی طرح استعاروں کو تحریر سے الگ کر دینے کی صورت میں تحریر کے افادی پہلو میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔'[2] یعنی وہ تحریر اپنے ابلاغی مقصد کو پورا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی۔ استعارہ کو جو مذکورہ رائے میں زر و جواہر کی حیثیت دی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس رائے کی تخلیق کا سبب اسلوب کے متعلق وہ تصور ہے، جس کے مطابق تشبیہات اور استعاروں کو محض آرائش کلام کا سامان قرار دیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت صورت حال اس سے مختلف ہے، کیونکہ اگر استعارے یا تشبیہات کسی خیال، جذبہ یا تجربہ کے ابلاغ میں ممد و معاون ثابت ہوں، تو پھر ان کی حیثیت زر و جواہر کی نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ اس طرح ابلاغی مقصد کی تکمیل میں شریک کار ہو کر وہ اپنی افادیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ابلاغی مقصد کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہونے سے قاصر نہیں تو پھر وہ واقعی محض آرائش کے سامان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تشبیہ تشبیہ اور استعارہ میں اسلوب کے اعتبار سے محض درجاتی فرق ہے۔ تشبیہ اولین صورت ہے اور استعارہ بعد کی ترقی یافتہ۔ تشبیہ میں دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت دینے کے علاوہ وجہ شبہ کو بھی ظاہر کر دیا جاتا ہے، یا علامات مشابہت مثل، مانند وغیرہ پیش کر دی جاتی ہیں، مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ "میرا محبوب آہو چشم ہے" تو چشم جو وجہ شبہ ہے اس کا ذکر موجود ہے،

---

(1) ENGLISH PROSE STYLE BY H. READ, P. 26.

(2) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY, P. 12.

لیکن استعارہ میں وجہ شبہ غائب ہوتی ہے۔ جیسا کہ استعارہ کے سلسلہ میں دی گئی مثال "امجد شیر ہے" سے ظاہر ہے۔ تشبیہ میں ذہن کو سوچ بچار سے بہت کم کام لینا پڑتا ہے، گو اس سے انداز بیان میں طوالت آ جاتی ہے، لیکن استعارہ میں ہمیں چونکہ کسی چیز کے فوراً اس کی متبادل صورت میں دیکھنا ہوتا ہے، اس لئے ذہن کو فوری جست لگانی پڑتی ہے (۱) اور بعض صورتوں میں اسے سمجھنے کے لئے کافی غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ تشبیہ کے برعکس استعارہ کے استعمال سے انداز بیان میں اختصار پیدا ہو جاتا ہے اور تحریر طوالت سے بچ جاتی ہے۔" لیکن استعارہ کے استعمال میں اس بات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ وہ سادہ ہو، تاکہ تفہیم میں دشواری اور تاخیر کا سامنا نہ کرنا پڑے (۲) اور کلام میں زور پیدا ہونے کے علاوہ تاثر میں شدت آ جائے۔

اسلوب سے بحث کرتے ہوئے تشبیہات اور استعاروں کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان سے ہمیں مصنف کے رجحانات کا سراغ ملتا ہے، ہر عظیم ادیب ایک خاص قسم کے استعارے اور ایک خاص نوع کی تشبیہات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دیتا ہے۔ علامہ اقبال اس بات کی زندہ جاوید مثال ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں جن تشبیہات اور استعاروں کو استعمال کیا ہے، ان سے ان کے نظریات و تصورات کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہین، جو، دریا اور انجم سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ قوت حرکت اور مسلسل جستجو کے دلدادہ ہیں۔

بعض صورتوں میں لفظ علامت یا اشارہ کی حیثیت بھی حاصل کر لیتا ہے، جیسے علامہ اقبال کے کلام میں لفظ "لالہ" ان کے ہاں ملت اسلامیہ سے عبارت ہے۔ لیکن علامت کی یہ حیثیتیں ایسی ہیں کہ جن کا تعلق زیادہ تر نظم یا شعر کے ساتھ ہے۔ نثر کا اپنے مزاج اور اپنی ساخت کے سبب ان سے شاذ و نادر ہی واسطہ پڑتا ہے۔

لفظ بے معنی بھی ہوتے ہیں اور با معنی بھی، ہمارے پیش نظر جملہ مباحث میں با معنی لفظ

---

(1) THE PHILOSOPHY OF STYLE BY SPENCER, P. 26

(2) LBID.

ہے جسے گرامر کی رو سے کلمہ کہا جاتا ہے۔

جملہ

ایک لفظ چونکہ مکمل خیال کو ظاہر کرنے سے معذور ہوتا ہے، اس لئے ادیب کو لاتعداد الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے، وہ اپنی ضرورت کے مطابق الفاظ کی سپاہ کو قطاروں اور گروہوں میں سہولت اور تقسیم کار کے لئے منقسم کر دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ الفاظ کو جملوں اور پیروں (PARAGRAPHS) کی صورت دے دیتا ہے۔ جملہ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور مختلف اکائیوں سے ایک پیرا بنتا ہے ہربرٹ ریڈ جملے کے متعلق لکھتا ہے "جملہ ایک منفرد چیخ و پکار اور اظہار کی ایک اکائی ہے۔ اس کی مختلف خصوصیتوں، لمبائی، بہاؤ اور ساخت کا تعین ان کے باہمی اتحاد کے صحیح شعور پر مبنی ہوتا ہے۔ فقرے میں اسماء اور افعال کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، بعض فقرے سادہ ہوتے ہیں، بعض مرکب اور بعض پیچیدہ۔ لیکن پیچیدگی یا سادگی کا انحصار طوالت پر نہیں ہوتا۔ ایک جملہ طویل ہونے کے باوجود سادہ ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیئے اگر اسے اپنا مقصد پورا کرنا ہے۔ مختصر فقرات سے رفتار کا اظہار ہوتا ہے اور اسی لئے وہ کسی عمل یا تاریخی واقعہ کے بیان کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ طویل فقرات سے تحریر میں سکون اور تدبر کا اظہار ہوتا ہے اور اسی لئے وہ فلسفیانہ مطالب کے لئے مناسب ہوتے ہیں۔ مرکب جملوں میں تنوع کے لئے وسیع مواقع میسر آتے ہیں، لیکن مختصر فقرات میں نہیں۔ طویل اور پیچیدہ جملوں میں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ شدید توازن قائم نہ رہے۔ اور پھر منطقیانہ طور پر مفہوم صاف اور رواں ہونے کے باوجود، پڑھنے والے کے لئے صبر آزما ہوتے ہیں۔[1] فقرے میں الفاظ کی ترتیب بہت زیادہ قابل توجہ ہوتی ہے۔ "ہر جملے میں الفاظ کی ترتیب کی ایک ایسی صورت ہوتی ہے، جو ترتیب کی دوسری صورتوں سے زیادہ مؤثر اور موزوں ہوتی ہے۔ جملے میں الفاظ کی ترتیب ایسی ہونی چاہیئے کہ خیال کے اجزا موزوں ترین صورت میں یکجا ہو جائیں، جو جوش میں آتے ہوئے لوگوں کی

---

(1) ENGLISH PROSE STYLE BY H. READ, PP. 35-7, 41-6.

(2) PHILOSOPHY OF STYLE BY SPENCER, P. 9.

زبان سے بلا واسطہ (DIRECT) جملے بے ساختہ نکل رہے ہیں۔"[1]

جملے میں الفاظ کی ترتیب اگر بدل دی جائے، تو اس کے مفہوم میں بھی تبدیلی آجاتی ہے، خواہ یہ تبدیلی کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ لفظوں کی ترتیب بدلنے کے ساتھ ہی چونکہ لہجہ بھی بدل جاتا ہے، اس نئے مطلب میں تغیر ناگزیر ہوتا ہے لکھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ جملے میں جو الفاظ استعمال کئے جائیں، ان سے مطلب پوری طرح واضح ہو، پیچیدگی یا الجھن اسلوب میں صرف اسی وقت ہونی چاہیئے، جب مقصد الجھن یا پیچیدگی پیدا کرنا ہو، خیال اگر ذہن میں صاف اور قطعی صورت میں موجود ہو، تو اسلوب میں بھی قطعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلوب میں قطعیت سے مراد یہ ہے کہ جب ہم کچھ کہنا چاہیں، تو وہ ان الفاظ میں کہیں، جن سے مطلب مکمل صورت میں دوسرے لوگوں کے ذہن میں منتقل ہو جائے۔ پیچیدہ نگاری سے لکھنے والے کی عظمت بڑھتی نہیں، بلکہ کم ہوتی ہے، کیونکہ دراصل صورت لکھنے والے سے کما حقہٗ واقف ہونا بہت دشوار ہوتا ہے اور نامکمل واقفیت کی صورت میں ظاہر ہے کہ کسی کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ شعوری طور پر پیچیدہ اسلوب بنانا بہت ہی معیوب ہے۔[2] کیونکہ اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں خود پیش کردہ موضوع صاف اور مکمل صورت میں موجود نہیں اور وہ اپنی ذہنی الجھن کو چھپانے کے لئے پیچیدہ فقروں میں دوسروں کو الجھا دینے کا خواہشمند ہے۔

پیرہ

پیرہ جملوں کے مجموعہ کا نام ہے اور اس میں موضوع کے ایک پہلو کا مکمل بیان ہوتا ہے۔ منطقیانہ انداز میں اس کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ پیرہ کسی ایک خیال کے مکمل اظہار کو ظاہر کرتا ہے، لیکن خیال چونکہ خود ایک ایسی اصطلاح ہے کہ جس کی معنوی وسعت اور تعریف کی قطعی حد بندی مشکل ہے، اس لئے پیرہ کی واضح اور قطعی حدود کا تعین بھی دشوار ہے۔[3] نتیجۃً پیرہ کی طوالت اور اختصار کی بحث بھی بے محل

(1) LBID., P. 42.

(2) THE SECRETS OF STYLE BY H. BETT, P. 173.

(3) ENGLISH PROSE STYLE BY H. READ, P. 58.

غیر ضروری اور پیچیدہ ہے۔

• جملہ اور پیراگراف دونوں کے شروع اور آخر کے الفاظ بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہر مصنف شروع میں لکھنے والے کے لئے دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر اور اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے خاص پرکشش الفاظ استعمال کرتا ہے اور پھر آخر میں پڑھنے والے کی دلچسپی کو قائم رکھنے کی خاطر الفاظ کی طرف غیر معمولی توجہ دیتا ہے۔ بعض صورتوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے طویل و عریض تمہید کے بغیر ہی اچانک نفس مضمون کا بیان شروع کر دیا جاتا ہے۔ آج کل یہ روش عام ہے۔ بعض اوقات مصنف جملہ یا پیراگراف کا آغاز اور خاتمہ الفاظ کی تکرار کے ساتھ کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ تکرار موزوں ہے یا نامناسب۔ بعض صورتوں میں جملہ یا پیراگراف کو نامکمل بھی چھوڑ دیا جاتا ہے، تاکہ پڑھنے والا تخیل سے کام لے سکے۔ مصنف کے اسلوب بیان سے آگاہ ہونے کے لئے فقرے میں لفظوں کی تعداد اور پیرے میں جملوں کی تعداد بھی قابل غور ہوتی ہے[1]۔ کیونکہ عام طور پہ ہر مصنف ایک ہی قسم کے جملے یا پیرے بنانے کا عادی ہوتا ہے۔ اگر ہمیں کسی مصنف کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ بالعموم جملہ میں آٹھ یا نو الفاظ لاتا ہے اور پندرہ یا سولہ جملوں سے پیراگراف بناتا ہے تو ہم اس کی تحریروں کو دوسروں کی تحریروں سے فوراً الگ کر سکتے ہیں۔

مثالی اسلوب

اپنی پسند یا ضرورت کے مطابق موضوع منتخب کر لینے کے بعد زبان پر قدرت رکھنے والا مصنف جب کسی تحریر کو جنم دیتا ہے تو پھر اس کی تحریر کے اسلوب کے متعلق بحث کرتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا زیر بحث تحریر کا اسلوب ایسا ہے کہ جسے مثالی اسلوب قرار دیا جا سکے یا وہ اسلوب ایسا ہے کہ جس کی تقلید کی جا سکے یا بعض دوسرے مصنفین کا اسلوب بھی اس کی مانند ہے، دوسرے الفاظ میں مصنف کے صاحب اسلوب ہونے کا سوال سامنے آتا ہے۔

مثالی اسلوب کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مثالی اسلوب اور منفرد اسلوب

---

(1) THE SECRETS OF STYLE BY H. BETT. P. 124.

میں قدرے فرق ہے، کیونکہ ایک مصنف کا اسلوب منفرد ہوتے ہوئے بھی مثالی نہیں ہو سکتا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ قلمبند کرتے ہوئے زبان سادہ، صاف، رواں اور تشبیہات و استعارات سے پاک استعمال کرنی چاہیئے۔ تو درحقیقت تاریخ کے موضوع کے لیے مثالی اسلوب کا تصور پیش کیا جا رہا ہوتا ہے دریں صورت محمد حسین آزاد کی تصنیف "آب حیات" کا اسلوب منفرد تو قرار پا سکتا ہے، لیکن اسے مثالی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب بہت سے مصنف ایک ہی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، تو ان کا موضوع ایک ہی ہونے کے باوجود ان کے اسالیب منفرد اور مختلف ہوتے ہیں، کیونکہ اسلوب ایک شخص کے ذاتی تاثرات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسالیب کے مختلف ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان اسالیب میں کوئی ایک عنصر بھی مشترک نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک اسلوب کا کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جو دوسرے اسلوب میں موجود نہیں ہوتا۔ ایک ہی جیسے اسالیب سے یہ مراد ہے کہ ان کے اکثر یعنی غالب پہلو ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔

مثالی اسلوب کے متعلق ڈبلیو رائٹ کا یہ خیال ہے کہ "ہر حالت میں الفاظ کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور، بالضرور ایسی ہوتی ہے۔ جو ہر اعتبار سے موزوں ترین قرار پاتی ہے"۔[2] یعنی ایک موضوع کے لئے ایک مثالی اسلوب ضرور ہوتا ہے۔

منفرد اور مثالی اسالیب سے بحث کرتے ہوئے تقلیدی یا روایتی اسلوب کا بھی خیال ذہن میں ابھرتا ہے، روایتی اسلوب کو مشخص کرنے کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا اسلوب ہے۔ جس میں مصنف نے اپنی شخصیت کو کم سے کم داخل کیا ہوتا ہے۔ اور اس کے بیشتر پہلوؤں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے دوسرے مصنفین کی تقلید کی ہے۔ یعنی خیالات کی ترتیب اور فقرات کی ساخت سے مصنف کے مقلد ہونے کی غمازی ہوتی ہے۔

---

(1) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY; P. 15

(2) STYLE BY W. WRIGHT; P. 49

فنکار اگر اپنے آپ کا محاسبہ کرنے اور سوچ بچار کے بعد اپنے مشاہدات اور خیالات وجذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ جس سے دوسرے کلی طور پہ آگاہ ہو جائیں، تو اس صورت میں اس کا اسلوب یقیناً منفرد ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ دوسروں کے احساسات وخیالات کا ترجمان بنتا ہے، تو یقیناً اس کا اسلوب بھی روایتی بن کر رہ جاتا ہے۔

شخصیت

مصنف کی شخصیت کو اسلوب کے جملہ مباحث میں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ بعض محققین نے شخصیت کی بنا پر ہی اسلوب کو شخصی اور غیر شخصی، اسالیب میں تقسیم کر دیا ہے۔ "شخصی اسلوب (ان کے خیال میں) وہ ہے جس میں مصنف کی شخصیت کی جھلکیاں جا بجا دکھائی پڑتی ہوں اور غیر شخصی اسلوب وہ ہے، جس میں مصنف اپنی شخصیت کو کم سے کم داخل ہونے دے۔(1) یعنی موضوعات اور زبان دونوں کے برتنے میں اپنی پسند اور ناپسند کو داخل نہ ہونے دے۔ "شخصی اسلوب بالعموم واضح اور صاف ہوتا ہے، گو اس میں باقاعدگی نہیں ہوتی۔ تصویریں اس میں صاف ہونے کے باوجود بے ڈھب ہوتی ہیں(2)" اس کے مقابل غیر شخصی اسلوب سیدھا سادا اسلوب بیان ہوتا ہے۔ جس میں مصنف ایک مشین کی طرح سے کام کرتا ہے۔ وہ اپنی بیان کردہ چیز میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا اور نہ ہی اس کا مقصد کسی قسم کا تاثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر صرف ایک بات ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جس طرح سے کوئی چیز موجود ہے اس کو ہو بہو اسی طرح سے پیش کر دے، یعنی انتخاب اور پسند سے بالکل کام نہ لے۔

"حقیقت یہ ہے کہ اسلوب میں شخصی اور غیر شخصی کی قطعی تمیز ممکن ہی نہیں(3) کیونکہ مصنف کی تمام تر کوشش کے باوجود اس کی پسند کا اظہار اور اس کے انتخاب کا عمل

---

(1) MODERN PROSE STYLE BY B. DOBREE, PP. 4-7.

(2) ENGLISH PROSE STYLE BY H. READ, P. 178.

(3) THE PROBLEM OF STYLE BY M. MURRAY, P. 41.

اگر موضوع میں ممکن نہیں، تو زبان کے معاملہ میں ضرور اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ " جب ہم حواس خمسہ کے ذریعے اثرات قبول کرتے ہیں تو ہمارے جسم سے خود بخود ان کے ردعمل کا اظہار ہو جاتا ہے!"

بی۔ ڈوبری شخصی اسلوب کے متعلق لکھتا ہے کہ "ہم جب ایک کتاب کو پسند کرتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کتاب میں جس شخصیت کی تصویر پیش کی گئی ہوتی ہے، وہ شخصیت ہمیں پسند ہوتی ہے" اس کا خیال ہے کہ ہر لکھنے والا وہی کتاب پسند کرتا ہے، جس میں لکھنے والے نے اپنی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا ہو۔ اگرچہ بڑا فنکار اپنی شخصیت کی جھلک صاف نہیں دکھاتا، بلکہ اسے پس پردہ رکھتا ہے"۔ بہرکیف اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصنف کی شخصیت اس کی ہر ادبی تحریر میں کسی نہ کسی حد تک موجود کارفرما ہوتی ہے۔

انفرادی اسلوب کا تو انحصار ہی مصنف کی شخصیت پر ہوتا ہے" کیونکہ انفرادیت خیال کی بجائے اظہار کی انفرادیت ہوتی ہے۔ "اور پھر کسی نئی چیز کا انکشاف نہیں کیا جاتا بلکہ کسی قدیم چیز کے ہی ایک نئے پہلو کو پیش کیا جاتا ہے"۔ مختصر یہ، اظہار کی انفرادیت کا انحصار ہی چونکہ انفرادی سوچ بچار اور احساس پر ہوتا ہے، اس لیے مصنف کی شخصیت سے گریز ناممکن ہے۔

اسلوب اور شخصیت کے تعلق کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ خیال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی مصنف کا اسلوب خلوص کا حامل ہے یا نہیں۔ بعض مصنف تو اس سلسلہ میں شخصیت کی عکاسی کو ہی مصنف کا خلوص قرار دیتے ہیں، یعنی ان کا خیال ہے کہ مصنف جو کچھ محسوس کرتا ہے، اگر بعینہ اس کو پیش کر دیتا ہے تو اس کے اسلوب میں خلوص ہے ورنہ نہیں۔ ہارڈریس اور گریڈی کے خیال میں تو "خلوص ہی اسلوب ہے"۔ لیکن

---

(1) ENGLISH PROSE STYLE BY H. READ, PP. 36-7.
(2) MODERN PROSE STYLE BY B. DOBREE, P. 4.
(3) STYLE BY W. RALEIGH, P. 4.
(4) STYLE BY W. WRIGHT, P: 59.

مڈلٹن مرے کی رائے کے مطابق "عظیم اسلوب وہ ہے جس میں شخصیت کی موجودگی اور عدم موجودگی انتہائی درجہ تک ہو"[1]۔ یعنی تحریر شخصی ہوتے ہوئے بھی غیر شخصی، اور غیر شخصی ہوتے ہوئے بھی شخصی ہو۔ ابوالفضل اسی چیز کو "حدیث نفس"[2] قرار دیتا ہوا شخصیت اور اسلوب کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتا ہے۔

قارئین یا سامعین

کسی تحریر کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے موضوع، زبان اور مصنف کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد یہ غور کرنا بھی ضروری ہے کہ مصنف نے تحریر لکھتے ہوئے کس قسم کے قارئین کو اپنے سامنے رکھا ہے اور اگر شعوری طور پر اس نے یہ کوشش نہیں کی تو غیر شعوری طور پر اس نے اپنی تحریر کے متوقع قارئین سے کس حد تک اثر قبول کیا ہے۔ یا اگر کیفیت ان دونوں صورتوں سے مختلف ہے تو قارئین پر اس تحریر کا کیا اثر ہوا ہے۔ ابلاغی عمل کا تعلق ہی چونکہ ایک طرف مصنف کی ذات کے ساتھ ہے اور دوسری طرف قارئین کے ساتھ۔ اس لئے تحریر کی صورت میں قارئین اور تقریر کی صورت میں سامعین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ والٹر ریلے کے خیال میں تو "ہر فن میں فنکار کے علاوہ جن دو چیزوں پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ اظہار کا ذریعہ اور سامعین (قارئین) ہیں"[3]۔ اسلوب کا تعلق قارئین کے ساتھ اس قدر گہرا ہے کہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ "قارئین بدل جانے کے ساتھ اسلوب بھی بدل جاتا ہے"[4] تو یہ نامناسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر زبان کے ادب کا مطالعہ کرنے سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اشرافی ادب اور عوامی ادب کی تقسیم ہی اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ اشرافی ادب میں چونکہ مصنف کے پیش نظر امراء، علماء و فضلا کا گروہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے موضوع اور زبان

---

(1) MATTER, FORM & STYLE BY H. O' GRADY, P. 121.

(2) دفتر ابوالفضل ـــ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ص ـــ ۲۵۹

(3) STYLE BY W. RALEIGH, P. 4.

(4) LBID., P. 71.

دونوں سے بالفاظ دیگر اسلوب سے امارت اور علمیت و فضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عوامی ادب میں عوام کی موجودگی کے سبب مصنف کی استعمال کردہ زبان بھی عوام کی ہوتی ہے اور اس کا پیش کیا ہوا موضوع بھی عوام کی زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات مد نظر رکھنے کے قابل ہے کہ اگر مصنف تحریر کو جنم دیتے ہوئے قارئین کو بھول جاتا ہے۔ تو وہ اپنے معیار سے نیچے نہیں گرتا۔ اس کے برعکس اگر وہ قارئین کو بھول کر تحریر کو وجود میں لاتا ہے، تو اس صورت میں اس کے اپنے آبگینہ دل کو ٹھیس لگتی ہے اور اسے اپنے معیار سے نیچے آنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح اس کی تحریر خلوص سے عاری ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اپنے قارئین کے نقطہ نظر کے مطابق ہی سوچتا ہے اور ان کی پسندیدہ زبان ہی استعمال کرتا ہے اس کوشش کے نتیجہ میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے، اس میں یہ خامی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پائداری اور دائمی زندگی سے عاری رہ جاتا ہے۔ کیونکہ قارئین کے بدلنے کے ساتھ ہی اس کی مقبولیت بھی ختم ہو جاتی ہے"۔ اسی طرح لکھنے سے پیشتر اگر مصنف اسلوب کے متعلق غور کرنا شروع کر دیتا ہے، تو وہ اپنی راہ سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا پہلا کام واضح، صاف اور قطعی فکر ہے[1] جس کا نتیجہ اسلوب ہے لیکن اس صورت حال کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مصنف کو قارئین کی دلچسپی لے لئے ان کو متاثر کرنے کے لئے اور ان میں خاص قسم کے جذبات اور خیالات پیدا کرنے کی خاطر ان کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہر دو مذکورہ صورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مصنف کے لئے جو سلامتی کی راہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ ان ہر دو صورتوں کا امتزاج ہے اور توازن و اعتدال کی کیفیت ہے۔ مصنف کی کامیابی کا راز اس کوشش میں مضمر ہے کہ وہ نہ ہی بالکل اپنی پسند کا خیال رکھے اور نہ ہی اپنے آپ کو کلی طور پر قارئین کے سپرد کر دے۔ یہ راہ دشوار، مشکل پسند اور ہمت آزما ضرور ہے۔ لیکن اس سے گریز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایک اعلیٰ درجہ کے ادب پارہ کی تخلیق خون جگر کے بغیر

(1) MODERN PROSE STYLE BY B. DOBREE, P. 218.

ممکن بھی نہیں۔ ایک اسلوب سے قارئین کس حد تک متاثر ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب وہ تمام ادبی تحریکات ہیں جو مختلف زبانوں کے ادب میں جنم لیتی رہی ہیں۔ ان تحریکوں کے پیش رو ایک دو مصنف ہی ہوا کرتے تھے۔ اردو ادب میں سجاد حیدر یلدرم اور منشی سجاد حسین ایسے ہی دو درخشندہ ستارے ہیں، جن کی روشنی میں بعض ادیب رومانیت اور مزاح نگاری کی منزلوں تک پہنچے ہیں۔

اسلوب نثر کے متعلق پیش کردہ مباحث سے یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں کہ گو نثر کے لئے نظم سے نہیں، بلکہ شعر سے الگ تھلگ ایک اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے لیکن شعر اور نثر کے اسالیب کے ڈانڈے بھی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ ان کی تمیز کے لئے کوئی قطعی حد بندی دشوار ہے۔ جس طرح سے دوسری تنقیدی اصطلاحات کا قطعی مفہوم متعین کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اسلوب کی اصطلاح کی معنوی وسعت کا تعین بھی مشکل ہے۔ ہم اسلوب سے بحث کرتے ہوئے صرف ان پہلوؤں اور عناصر کی نقاب کشائی کر سکتے ہیں۔ جن کا جائزہ لینا کسی تحریر کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے ناگزیر ہوتا ہے۔

تحریر کے تجزیہ سے دو اہم چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں، مضمون یعنی معانی اور زبان یعنی الفاظ اور ان کی ترکیب و ترتیب۔ اسلوب سے متعلق دیگر جملہ مباحث، اسلوب کی ان دو شاخوں کے ہی برگ و بار ہیں، گو شرقی مصنفین زیادہ اور مغربی مصنفین کم، زبان کی بحث کو ہی اسلوب کی بحث قرار دیتے رہے ہیں، لیکن موجودہ دور میں تحقیق و تنقید جن راہوں پر چل نکلی ہے ان کے پیش نظر اسلوب کی اصطلاح معانی اور زبان دونوں پہ حاوی ہے۔ اسلوب سے بحث کرتے ہوئے نہ تو موضوع ہی سے مفر ہے اور نہ زبان ہی سے گریز۔ جس طرح سے تندرست ہونے کے لئے ذہن کی سلامتی کے ساتھ جسم کے درست اور بے داغ ہونے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سے اسلوب کی عظمت اور اس کے حسن کے لئے معانی کا پر وقار اور ہیئت کا موزوں ہونا لازمی ہے :

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں، تماشائی بھی (حالی)

عین الحق فرید کوٹی

وادیٔ سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات

(اس مضمون کو اردو ترقی بورڈ کی طرف سے انعام ملا)

وادیٔ سندھ ایک ایسا جیتا جاگتا عجائب گھر ہے۔ جس میں آپ کو دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں کے افراد اب بھی اپنے اپنے رسم و رواج، رہن سہن اور لباس و زبان کو برقرار رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ آج بھی ان کو ان کے خدوخال اور رنگ کی بنا پر ایک دوسرے سے ممیز کر سکتے ہیں۔ بلوچستان کے براہوی، سرحد کے کافر، سندھ کے کٹوڈی اور پنجاب کے باوریے اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ یہاں کی عام آبادی کے رسم و رواج، بود و باش اور لباس و زبان کا مطالعہ ہے۔ یہاں ہمیں آریاؤں کی آمد سے لے کر یورپی قوموں کے ورود تک کے اثرات ایک دوسرے میں اسی طرح سے سموئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہ ان میں باہمی امتیاز کرنا مشکل ہے۔ آریہ۔ ہن۔ سیتھین یونانی، تورانی، ایرانی اور مغربی قومیں یکے بعد دیگرے یہاں آتی رہیں۔ اور اپنی اپنی انفرادی خصوصیات یہاں کی آبادی کو ودیعت کرتی رہیں۔

لیکن آج ہم ایک ایسی قوم کے نقشِ کفِ پا کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ جسے زمانے کی گرد نے ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اس قوم کے ساتھ ہمارے باہمی تعلقات کے بارے میں تاریخ کے صفحات بالکل خاموش ہیں۔ شاید کسی دن کسی صاحب بصیرت انسان نے ہڑپہ اور موہنجوداڑو سے دستیاب ہونے والی گونگی منقش مہروں کو زبان عطا

کر دی۔ تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں ان تعلقات کی روداد سنا سکیں۔ اس سے ہمارا اشارہ دراوڑی قوم کی طرف ہے۔ جو آج ہم سے کالے کوسوں دور دکن میں آباد ہے ہماری زبان میں دراوڑی عنصر کی موجودگی کسی بیتے ہوئے زمانے میں ایک دوسرے کے ساتھ گہرے رشتے کی غمازی کرتی ہے۔

عام طور پر شمالی ہند کی زبانوں کے سنسکرت الاصل ہونے کا نظریہ ایک مسلمہ امر کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے اور کسی متبادل نظریہ کے موجود نہ ہونے کی بنا پر کسی نے اس کے خلاف قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ اگر کسی نے اس کے برعکس کچھ لکھا ہے۔ تو اتنی دبی زبان سے کہ اسے کچھ وقعت حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ اس نظریہ کے حامی سوائے لغوی اشتراک کے کوئی اور اہم ثبوت بہم نہیں پہنچا سکے جب بھی ان زبانوں کے صرف ونحو کا پہلو سامنے آیا تو وہ ہمیشہ متذبذب نظر آئے اور انہوں نے ان زبانوں کی اصل بجائے سنسکرت کے اس سے ملتی جلتی کسی نامعلوم زبان کو قرار دیا جو لغوی طور پر سنسکرت کے قریب تھی۔ لیکن صرف ونحو کے لحاظ سے مختلف؛ لیکن وہ اس نامعلوم زبان کا کوئی نمونہ پیش نہ کر سکے۔

آنریبل ماؤنٹ سٹیورٹ الفنسٹن MOUNT STURAT ELPHINSTON نے "تاریخ ہند" مطبوعہ ۱۸۴۱ء میں مسٹر کول بروک COLE BROOK کی تحقیقات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "دہلی میں اسلامی حکومت کے قیام کے دوران میں مختلف قوموں کے باہمی تعلقات اور روزانہ گفت و شنید کی بدولت ایک ایسی زبان وجود میں آئی کہ جس کی لغوی بنیاد میں سنسکرت زبان سے مشابہ تھیں" مقصد یہ کہ صرف و نحو کے لحاظ سے یہ زبان سنسکرت سے مختلف تھی۔ ڈاکٹر آر۔ جی لیتھم RG LATAM ماہر علم النسلیات اپنی کتاب "ہندوستانی نسلیات" مطبوعہ ۱۸۵۹ء میں شمالی ہند کی زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "سنسکرت کے مقابلہ میں یہ تصریفی لحاظ سے بالکل مختلف ہیں اور اگر ان کا موازنہ دراوڑی زبانوں سے کیا جائے تو یہ لغوی طور پر سنسکرت الاصل الفاظ سے بھری پڑی ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کے تضاد کی بنا پر کتنے مختلف قسم کے نظریات

قائم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو انہیں سنسکرت الاصل قرار دیتا ہے۔ دوسرا گروہ دراوڑی کو ان زبانوں کا سرچشمہ بیان کرتا ہے۔ ہر ایک فریق اپنے دعوے کے حق میں ثبوت پیش کرتا ہے۔ کثرت رائے سنسکرت الاصل والے نظریہ کے حق میں ہے۔ لیکن دوسرے فریق کے پاس بھی بعض اعلیٰ دلائل موجود ہیں

سر ولیم ولسن ہنٹر W. W. HUNTER "تاریخ سلطنت ہند" مطبوعہ ۱۸۹۲ء میں شمالی ہند کی زبانوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کئی ماہرانِ شرقیات کی رائے بیان کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے "ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی مقامی زبانیں براہ راست سنسکرت سے نہیں نکلیں۔ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سنسکرت سے بھی قدیم غالباً ویدوں کے زمانے سے پیشتر ایک ایسی آریائی زبان موجود تھی کہ جس سے سنسکرت اور قدیم پراکرتیں یعنی مقامی بولیاں وجود میں آئیں۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان دونوں زبانوں میں اختلافات کی حدیں بڑھتی گئیں۔ آخر سنسکرت نے ایک مصنوعی زبان کی حیثیت سے وہ صورت اختیار کر لی۔ جو کہ پانینی PANINI کی گرامر (تقریباً سنہ ۳۵۰ ق م) میں نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس پراکرتوں کی قدیم صورت میں وررُوچی کی گرامر (تقریباً ایک صدی ق م) میں ملتی ہے۔"

مشہور ماہر لسانیات ہند سر جارج گریئرسن G.A. GRIERSON نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ" مطبوعہ سنہ ۱۹۱۹ء میں گو ہندوستانی (اردو) اور شمالی ہند کی زبانوں کو سنسکرت کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا کہ ہندوستانی ہندوستان کی دوسری آریائی زبانوں کی طرح ایک ایسی قدیم ہندوستانی زبان سے ماخوذ ہے کہ جو ویدوں کی زبان سنسکرت سے مشابہ تھی۔ یہ قدیم زبان ایک طویل عرصہ کے دوران میں بالکل تبدیل ہوگئی۔ سنہ ۲۵۰ ق م تا سنہ ۱۰۰۰ء کے درمیانی عرصہ میں اس تبدیلی کی مختلف منزلوں کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ موجودہ مقامی زبانوں کی حقیقی بنیادیں غالباً آخرالذکر تاریخ تک پختہ ہو چکی تھیں۔" اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ "خالص ہندوستانی الفاظ اس زبان (ہندوستانی یعنی اردو) کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے

یہ الفاظ کلاسیکی سنسکرت سے مشابہ قدیم ہندوستانی زبان سے مشتق ہیں۔ اس قدیم زبان نے کئی منزلوں سے گزرتے ہوئے آخر موجودہ ہندوستانی زبان کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم زبان اپنی اصلی صورت بدلنے کے بعد اور موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے ایک پراکرتی دَور سے گزری ہے"۔ آخر میں وہ صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ "صدہا سال سے کلاسیکی سنسکرت ہندوستانی زبان کو نہایت شد و مد سے متاثر کرنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن یہ صرف اس کا لغوی سرمایہ ہی ہے۔ جو اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ صرف و نحو کے لحاظ سے اس میں سنسکرت کے اثرات کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ اور موجودہ ہندوستانی زبان میں سنسکرت گرامر کا ایک بھی ترکیبی عنصر موجود نہیں"۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر محمد شہید اللہ (ترقی اردو بورڈ) دونوں اسی خیال کے حامی نظر آتے ہیں کہ شمالی ہند کی زبانیں براہ راست سنسکرت سے نہیں بلکہ قدیم پراکرتوں سے نکلی ہیں۔ اور یہ پراکرتیں مقامی بولیوں پر سنسکرت کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ اگرچہ ڈاکٹر عبدالحق کی تالیف "قواعد اردو" اور ڈاکٹر شہید اللہ کے مضمون "بنگالی اور اردو کا مشترکہ ماخذ" میں وادیٔ سندھ کی آریاؤں سے قبل کی زبانوں اور مقامی زبانوں کی تخلیق میں ان کی اہمیت کی طرف کچھ مبہم سے اشارے ضرور کئے گئے ہیں۔ لیکن کھل کر ان کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اور آخر میں ان کی آریائی الاصل ہونے کے مفروضہ پر ہی مہر تصدیق ثبت کر دی گئی ہے۔ میرے دوست آصف صاحب نے بھی اپنے مضمون "پنجابی زبان کے اجزائے ترکیبی" میں کچھ اسی قسم کا رویہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے پنجابی زبان میں دراوڑی عناصر کی کھوج لگانے کے لئے تحقیق و تدقیق کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ لیکن بقولیکہ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں"۔ نتیجہ یہی نکالا کہ پنجابی بھی ہندی اور سندھی کی طرح آریاؤں کی زبان سے مشتق ہے۔ اگرچہ اس بارے میں انہوں نے اپنی مجبوری کا اظہار ضرور کر دیا ہے۔ کہ "منڈا اور دراوڑی زبانوں کے متعلق ہمارا مطالعہ نفی کے برابر ہے۔ اس لئے ہم ان میں سے کسی کو بنیاد مان کر بات نہیں کر سکتے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ قدیم زبان یا زبانیں کون سی تھیں جن پر کہ قدیم

قائم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو انہیں سنسکرت الاصل قرار دیتا ہے۔ دوسرا گروہ دراوڑی کو ان زبانوں کا سرچشمہ بیان کرتا ہے۔ ہر ایک فریق اپنے دعوے کے حق میں ثبوت پیش کرتا ہے۔ کثرت رائے سنسکرت الاصل والے نظریہ کے حق میں ہے۔ لیکن دوسرے فریق کے پاس بھی بعض اعلیٰ دلائل موجود ہیں

سر ولیم ولسن ہنٹر W.W. HUNTER "تاریخ سلطنت ہند" مطبوعہ ۱۸۹۲ء میں شمالی ہند کی زبانوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کئی ماہرانِ شرقیات کی رائے بیان کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے "ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی مقامی زبانیں براہ راست سنسکرت سے نہیں نکلیں۔ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سنسکرت سے بھی قدیم غالباً ویدوں کے زمانے سے پیشتر ایک ایسی آریائی زبان موجود تھی کہ جس سے سنسکرت اور قدیم پراکرتیں یعنی مقامی بولیاں وجود میں آئیں۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان دونوں زبانوں میں اختلافات کی حدیں بڑھتی گئیں۔ آخر سنسکرت نے ایک مصنوعی زبان کی حیثیت سے وہ صورت اختیار کر لی۔ جو کہ پانینی PANINI کی گرامر (تقریباً سنہ ۳۵۰ ق م) میں نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس پراکرتوں کی قدیم صورت میں ورہروشی کی گرامر (تقریباً ایک صدی ق م) میں ملتی ہے"

مشہور ماہر لسانیات ہند سر جارج گریئرسن G.A. GRIERSON نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ" مطبوعہ سنہ ۱۹۱۹ء میں گو ہندوستانی (اردو) اور شمالی ہند کی زبانوں کو سنسکرت کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکا کہ "ہندوستانی ہندوستان کی دوسری آریائی زبانوں کی طرح ایک ایسی قدیم ہندوستانی زبان سے ماخوذ ہے کہ جو ویدوں کی زبان کی سنسکرت سے مشابہ تھی۔ یہ قدیم زبان ایک طویل عرصہ میں دوران میں بالکل تبدیل ہو گئی۔ سنہ ۲۵۰ ق م تا سنہ ۱۰۰۰ء کے درمیانی عرصہ میں اس تبدیلی کی مختلف منزلوں کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ موجودہ مقامی زبانوں کی حقیقی بنیادیں غالباً آخر الذکر تاریخ تک پختہ ہو چکی تھیں۔" اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ "خالص ہندوستانی الفاظ اس زبان (ہندوستانی یعنی اردو) کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے

یہ الفاظ کلاسیکی سنسکرت سے مشابہ قدیم ہندوستانی زبان سے مشتق ہیں۔ اس قدیم زبان نے کئی منزلوں سے گزرتے ہوئے آخر موجودہ ہندوستانی زبان کی شکل اختیار کر لی۔ قدیم زبان اپنی اصلی صورت بدلنے کے بعد اور موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے ایک پراکرتی دور سے گزری ہے"۔ آخر میں وہ صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ "صدہا سال سے کلاسیکی سنسکرت ہندوستانی زبان کو نہایت شد و مد سے متاثر کرنے کی کوشش میں ہے۔ لیکن یہ صرف اس کا لغوی سرمایہ ہی ہے۔ جو اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ صرف و نحو کے لحاظ سے اس میں سنسکرت کے اثرات کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ اور موجودہ ہندوستانی زبان میں سنسکرت گرامر کا ایک بھی ترکیبی عنصر موجود نہیں"۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر محمد شہید اللہ (ترقی اردو بورڈ) دونوں اسی خیال کے حامی نظر آتے ہیں کہ شمالی ہند کی زبانیں براہ راست سنسکرت سے نہیں بلکہ قدیم پراکرتوں سے نکلی ہیں۔ اور یہ پراکرتیں مقامی بولیوں پر سنسکرت کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ اگرچہ ڈاکٹر عبدالحق کی تالیف "قواعد اردو" اور ڈاکٹر شہید اللہ کے مضمون "بنگالی اور اردو کا مشترکہ ماخذ" میں وادیٔ سندھ کی آریاؤں سے قبل کی زبانوں اور مقامی زبانوں کی تخلیق میں ان کی اہمیت کی طرف کچھ مبہم سے اشارے ضرور کئے گئے ہیں۔ لیکن کھل کر ان کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اور آخر میں ان کے آریائی الاصل ہونے کے مفروضہ پر ہی مہر تصدیق ثبت کر دی گئی ہے۔ میرے دوست آصف صاحب نے بھی اپنے مضمون "پنجابی زبان کے اجزائے ترکیبی" میں کچھ اس قسم کا رویہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے پنجابی زبان میں دراوڑی عناصر کی کھوج لگانے کے لئے تحقیق و تدقیق کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ لیکن بقولیکہ "ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں"۔ نتیجہ یہی نکالا کہ پنجابی بھی ہندی اور سندھی کی طرح آریاؤں کی زبان سے مشتق ہے۔ اگرچہ اس بارے میں انہوں نے اپنی مجبوری کا اظہار ضرور کر دیا ہے۔ کہ "منڈا اور دراوڑی زبانوں کے متعلق ہمارا مطالعہ نفی کے برابر ہے۔ اس لئے ہم ان میں سے کسی کو بنیاد مان کر بات نہیں کر سکتے"۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ قدیم زبان یا زبانیں کون سی تھیں جن پر کہ قدیم

سنسکرت اثر انداز ہوئی؟ جبکہ کولبروک، الفنسٹن، لیتھم، ولیم ہنٹر اور جارج گریرسن وغیرہ تحقیقات میں مصروف تھے تو اس وقت شمالی ہند کی تاریخ آریاؤں کی آمد سے شروع ہوتی تھی اور اس سے پہلے ایک ایسا خلا تھا جس پر تاریکی کا گہرا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس لیے ان کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اس قدیم زبان کو سنسکرت سے مختلف لیکن آریائی الاصل زبان قرار دیں۔ لیکن اب یہ صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ آج محکمہ آثار قدیمہ کی کدال نے ایک قدیم تہذیب کے چہرے سے زمانہ کی مکڑی کے بُنے ہوئے جالوں کو اتار کر اس کے خد و خال کو کچھ اس حد تک اجاگر کر دیا ہے۔ اس لیے اب ہمیں اس قدیم زبان کو پہچاننے کے لیے مزید الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ قدیم زبان ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے باشندوں کی زبان تھی۔ جن سے کہ آنے والے آریائی قبائل کو دوچار ہونا پڑا۔ اور ان کی آمیزش سے کئی ایک بولیوں نے جنم لیا جو موجودہ زبانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ یہاں اس امر کا واضح کر دینا بھی ضروری ہے۔ کہ سنسکرت نے یہاں کی مقامی زبانوں کو محض متاثر کیا ہے۔ لیکن انہیں نیست و نابود کر کے کسی نئی بولی کی طرح نہیں ڈالی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہاں کی زبانوں کی مقبولیت کے زیر اثر خود ختم ہو گئی۔ مقصد یہ کہ کسی زبان کا کسی دوسری زبان سے متاثر ہونا اور بات ہے۔ چاہے وہ اثرات کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں۔ اور اس کا کسی دوسری زبان سے ماخوذ ہونا دوسری بات ہے۔ یوں تو فارسی اور ہسپانوی زبانیں بھی عربی سے متاثر ہوئی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے شمالی حصہ کی زبانوں کی جڑیں آریاؤں سے قبل کی سرزمین میں پیوست ہیں۔ ہاں! سنسکرت نے انہیں متاثر ضرور کیا ہے۔

ایک حل طلب مسئلہ یہ بھی ہے۔ کہ آخر ہڑپائی تہذیب کی زبان کس زمرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ بعض دوست اپنے مذہبی احساسات کی تسکین کی خاطر بغیر کوئی ثبوت بہم پہنچائے اسے عربی زبان یا اس کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ ان میں جناب جلال ندوی صاحب اور ہمارے شاعر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اگر کسی طریقہ سے اس نظریہ کو ثابت کیا جا سکتا تو واقعی یہ کچھ حد تک ہمارے لئے باعث فخر تھا لیکن یہ نظریہ حقائق کی

سے دگی بھی اسی امر کی واضح دلیل ہے حالانکہ

روشنی میں پنپتا نظر نہیں آتا۔ (اس سلسلہ میں میرا مراسلہ مطبوعہ ماہ نو ستمبر ۱۹۵۰ء ملاحظہ ہو) بہر حال میں یہی عرض کروں گا۔ کہ یہ حضرات جستجو جاری رکھیں کہ یہ کچھ نہ کچھ پھل ضرور لائے گی۔ جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ زبان غالباً دراوڑی ہے۔ اس کا ثبوت صرف بلوچستان میں دراوڑی زبان بولنے والے براہوی قبائل کا وجود ہی نہیں۔ باوجودیکہ آریائی حملہ آوروں کو یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین ہزار سال ہو چکے ہیں۔ لیکن شمالی ہند کی زبانوں میں ابھی تک دراوڑی عنصر موجود ہے جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ حالانکہ آریاؤں کی آمد کے بعد کسی دور میں بھی جنوبی ہند کے دراوڑی قبائل کا براہِ راست یہاں کے باشندوں کے ساتھ کسی قسم کے رابطے کا ثبوت نہیں ملتا۔ معلومہ تاریخ میں دراوڑی قبائل ہمیشہ کوہ بندھیاچل کے جنوب میں ہی نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ یہ مضمون حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ تحقیق کی راہیں کبھی مسدود نہیں ہوئیں۔ ہاں غالباً اس سلسلہ میں یہ حرفِ اول کی حیثیت ضرور رکھتا ہے

ایک وقت تھا کہ ماہرینِ سنسکرت دنیا کی تمام تر تہذیب و تمدن کا سرچشمہ صرف آریائی قوم کو ہی تسلیم کرتے تھے۔ اور ان کی زبانوں کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان تصور کرتے تھے گو ان کی تحقیقات کی بدولت انسانی معلومات میں ایک بیش بہا اضافہ ہوا۔ لیکن اپنے مخصوص مطالعہ اور یکطرفہ رجحانات کی بدولت انھوں نے غیر ارادی طور پر تاریخ اور زبان سے تعلق رکھنے والے کئی مسائل کے بارے میں اکثر غیر متوازن نظریات قائم کر لئے تھے۔ جو ان کے دیگر تحقیقی کارناموں کے ساتھ ایک امرِ مسلمہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ان نظریات کی مقبولیت کی بنا پر کسی کو ان کی تردید کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ برصغیر ہند و پاک کے شمالی حصے کی زبانوں کے سنسکرت الاصل ہونے کا نظریہ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ ان زبانوں اور سنسکرت کی صرف و نحو کے درمیان بنیادی طور پر اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہونے کے باوجود صرف کچھ لغوی مطابقت کی بنا پر اس نظریہ کی بنیادیں قائم کر دی گئیں۔ اور آج تک یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اسی قسم کے واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے "آریاؤں کی ابتدا" کے فاضل مصنف جناب آر۔ گ۔ ٹاکر

ہڑپائی تہذیب کے عہد میں یہاں کے باشندے دراوڑی اور منڈا

نے لکھا ہے کہ "خوش قسمتی سے ماہرانِ سنسکرت کے غاصبانہ اور وقتی نظریات کا زمانہ گزر چکا ہے اب یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ جلد بازی میں اخذ شدہ لسانیاتی نظریات کا آثارِ قدیمہ، علم الکائنات، علم الانسانیات، علم الطبقات الارض اور عقلِ سلیم کی روشنی میں نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔"

مسٹر آئزک ٹائلر نے سنسکرت اور دراوڑی زبانوں کے باہمی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سنسکرت کے علاوہ آریائی زمرہ کی تمام دیگر زبانیں تالو، زبان اور دانت و زبان کی مدد سے ادا کئے جانے والے حروف سے مبرا ہیں۔ جو خالصتاً دراوڑی صوتیات کی خصوصیات میں سے ہے۔ سنسکرت کی صوتیات میں اس خصوصیت کا پایا جانا اس پر دراوڑی اثرات کا ثبوت ہے۔" سنسکرت کا دراوڑی سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ بقول پروفیسر جسٹی JUSTI وادیٔ سندھ میں داخل ہونے والے آریائی قبائل مقامی آبادی کی نسبت قلیل تھے۔ اور ان کے ساتھ بہت کم عورتیں تھیں۔ یہاں آنے پر انہوں نے مقامی آبادی سے بیویاں حاصل کیں اور یہیں آباد ہو گئے۔" جس کے نتیجہ میں باہمی میل جول اور بات چیت کی بنا پر ان کی طرزِ معاشرت، رسم و رواج، مذہب اور زبان کا مقامی عناصر سے متاثر ہونا لازمی امر تھا۔

دراوڑی زبانوں کے عالم بشپ کاڈویل R. CALDWELL نے آریاؤں کی وادی سندھ میں مراجعت کا تذکرہ کرتے ہوئے دہرایا ہے کہ "یہاں آریاؤں کی مراجعت سے قبل بسنے والے قبائل غالباً تعداد کے لحاظ سے ان کی نسبت بہت زیادہ تھے۔ جن پر اگرچہ آریاؤں نے فتح ضرور حاصل کی لیکن وہ نیست و نابود نہیں ہوئے۔ آہستہ آہستہ وہ آریائی معاشرہ میں جذب ہو کر اسی قوم کا ایک حصہ بن گئے۔ اور فاتح قوم کے بہت سے رسم و رواج اور لغوی سرمایہ کا کچھ حصہ اپنا لیا۔" لیکن اکثریت میں ہونے کی بنا پر انہوں نے بھی آریائی تمدن، مذہب اور زبان پر گہرا اثر ڈالا ہوگا۔ عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ شمالی ہند کی زبانوں میں ملنے والے تمام تر الفاظ کی اصل کو سنسکرت سے ملایا جائے۔ لیکن کسی لفظ کا مقامی زبانوں اور سنسکرت دونوں میں پایا جانا اس کے آریائی اصل ہونے کی دلیل نہیں۔ تاوقتیکہ

ایسے الفاظ کا سراغ آریائی کنبہ کی دوسری زبانوں میں بھی مل جائے۔ خود ویدوں کی زبان بھی مقامی اثرات سے مبرا نہیں ہے۔ سنسکرت صرف و نحو پر بھی وادی سندھ کی مقامی زبان کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ مشہور ماہر سنسکرت ڈاکٹر میکڈانل کا قول ہے کہ "کلاسکی سنسکرت صوتیاتی لحاظ سے ویدوں کی زبان سے بعینہٖ مشابہت رکھتی ہے۔ لیکن صرف و نحو کے لحاظ سے یہ اس سے مختلف ہے۔ خاص طور پر اس میں صرف و نحو کی کئی ایسی شکلیں یکسر غائب ہیں۔ جو ویدوں کی زبان میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ لغت میں بھی نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں" صاف ظاہر ہے کہ وہ سنسکرت جو پانینی نے پیش کی تھی۔ مقامی اثرات کے تحت آریاؤں کی قدیم زبان سے مختلف شکل اختیار کر چکی تھی۔ بلکہ میکڈانل کے نظریہ کے مطابق خود ویدوں کی زبان بھی مقامی اثرات سے مبرا نہیں۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے بھی اس امر پر صاد کیا ہے کہ ویدوں کی زبان میں کئی دراوڑی الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً پھل، نیلا، دل (خوبصورت)، شام اور پوجا وغیرہ۔

برصغیر ہند و پاک کی آریائی الاصل کہلانے والی زبانوں میں تین قسم کے عناصر ملتے ہیں۔ ان کے لغوی سرمایہ کا ایک حصہ تو "تت سم" کہلاتا ہے۔ یہ ایسے الفاظ پر مشتمل ہے جو کہ ہوبہو اصلی صورت میں سنسکرت سے مستعار لے لئے گئے ہیں۔ دوسری قسم "تدبھو" الفاظ کی ہے۔ جو سنسکرت الفاظ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ تیسری قسم کے الفاظ "دیسا جا" یعنی دیسی کہلاتے ہیں۔ اور یہ غیر سنسکرتی عناصر پر مشتمل ہیں۔ ان زبانوں میں اول قسم کے الفاظ کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ سنسکرت اصل کے الفاظ زیادہ تر دوسری صورت میں موجود ہیں۔ لیکن ان زبانوں میں کافی عنصر تیسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ یہ زبانیں براہ راست آریائی نو آبادکاروں کی ویدک زبان سنسکرت سے مشتق قرار دی جاتی تھیں۔ لیکن موجودہ لسانیاتی تحقیقات نے اس نظریہ کے بے حقیقت ہونے کے بارے میں کئی ناقابل تردید ثبوت مہیا کر دیئے ہیں۔ اب اس نظریہ کے حامی ان زبانوں کو بجائے سنسکرت الاصل قرار دینے کے کسی سنسکرت سے "ملتی جلتی" زبان سے مشتق قرار دیتے ہیں۔ اور اس "ملتی جلتی" زبان کے وجود کے بارے میں کوئی ثبوت مہیا کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہند و پاک

کی موجودہ زبانیں سنسکرت پر مقامی زبانوں کے اثرات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس مقامی زبانوں پر سنسکرت کے لغوی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ یعنی ان کی بنیادی ساخت پر سنسکرت زبان کوئی اثر نہیں ڈال سکی۔

مقامی زبانوں کی صرف و نحو کے غیر سنسکرتی ہونے کا نظریہ تو اب ایک امر مسلمہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ماہرین ابھی تک اس امر پر متفق نہیں ہو سکے کہ ان زبانوں میں غیر آریائی عنصر کتنا ہے۔ علما کی ایک خاص جماعت جس میں برائن ہاجسن اور بشپ کالڈویل پیش پیش ہیں۔ اس نظریہ کے حامی ہیں کہ مقامی زبانوں میں غیر آریائی عنصر بہت کافی ہے۔ ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ کا خیال ہے۔ کہ سندھی زبان کے ان الفاظ کا جو کہ زبان اور تالو کی مدد سے پیدا ہونے والی آواز کے حامل ہیں۔ قریباً تین چوتھائی حصہ سیتھی یا تاتاری (دراوڑی اور منڈا) حلقہ کی زبانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاید ایک دن ایسا آجائے کہ ان غیر آریائی عناصر کا کھوج لگانا ممکن ہو جائے۔ کہ وہ کہاں سے ایک آریائی (سندھی) زبان میں داخل ہوا۔ بشپ کالڈویل کا بیان ہے کہ شمالی ہند کی زبانوں کا تقریباً دسواں حصہ غیر آریائی عناصر سے تعلق رکھتا ہے اور مرہٹی میں یہ عنصر پانچویں حصہ پر مشتمل ہے پنجابی زبان کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی دراوڑی اور منڈا زبانوں کا اتنا عنصر موجود ہے۔ کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس عنصر کا ٹھیک ٹھیک تناسب کیا ہے؟ فی الحال یہ بتانا مشکل ہے۔

برصغیر ہندو پاک کی موجودہ زبانوں کے تجزیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ آریاؤں سے قبل اس ملک میں تین مختلف زبانیں مروج تھیں۔ اول پہاڑی جسے عام طور پر تبتی و برمی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لداخ سے شروع ہو کر برصغیر کے شمالی سلسلہ ہائے کوہ کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی برما، سیام، آسام اور ہند چینی وغیرہ ممالک تک جا پہنچتی ہے۔ اس طرح برصغیر کے لداخ، کماؤں، نیپال، بھوٹان، سکم اور ناگا کے قبائل کے علاقے شامل ہیں۔ زبانوں کے اس گروہ نے شمالی ہند کی زیر غور زبانوں پر کوئی خاص

اثر نہیں ڈالا۔ گو ہمارے لغوی سرمایہ میں کوئی کوئی لفظ اس زمرہ کا بھی نظر آجاتا ہے۔ لیکن ہمارے لسانیاتی مطالعہ میں اس زمرہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی دوسری زبان منڈا گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ وسطی ہند کے جنگلات میں بسنے والے جھیل، کول، سنتھال وغیرہ قبائل کی زبان ہے۔ شمالی ہند کی زبانوں پر اس کے اثرات گو اتنے وسیع نہیں لیکن پھر بھی ان زبانوں کے مطالعہ کے دوران اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد دراوڑی زمرہ سے تعلق رکھنے والی زبانیں ہیں۔ جو کہ موجودہ دور میں زیادہ تر جنوبی ہند کے علاقہ میں بولی جاتی ہیں۔ بلوچستان میں براہوی زبان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے تامل، تلگو، ملیالم، کناری، گونڈی وغیرہ اس کی بڑی بڑی شاخیں ہیں۔ ابھی تک شمالی ہند کے لسانیاتی مطالعہ کے لیے دراوڑی زبانوں کو قابل التفات تصور نہیں کیا گیا۔ گو ان زبانوں پر اس زمرہ کے اثرات اتنے گہرے اور وسیع ہیں کہ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس سلسلہ میں دراوڑی زبانوں کی نسبت سنسکرت کو محض ایک ثانوی حیثیت حاصل ہے

پنجابی زبان کی ہی مثال لے لیجئے۔ یہ نہ صرف پھیلاؤ کے لحاظ سے وسیع ہے۔ بلکہ اس کی لغت بھی اپنے دامن میں بے شمار زبانوں کا سرمایہ سمیٹے ہوئے ہے۔ بیرونی زبانیں فارسی، عربی، ترکی، یونانی، ہسپانوی، پرتگیزی اور انگریزی وغیرہ تو ایک طرف۔ خود اس برصغیر کی مختلف زبانوں کے اثرات بھی مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مصدر "مارنا" یعنی زدوکوب کرنا کو ہی لے لیجئے۔ مارنا خود سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ انہی معنوں میں "پٹنا" کا لفظ گو آریائی الاصل ہے لیکن سنسکرت میں نہیں ملتا۔ شاید یہ انگریزی لفظ بیٹ BEAT کا ہم اصل ہے۔ انہی معنوں میں مندرجۂ ذیل دراوڑی الفاظ معمولی تبدیلی کے ساتھ عام بول چال میں ملتے ہیں۔

تلگو، کوٹو۔ پنجابی سٹینا اور کوہستانی۔ کٹنا، اردو۔ کوٹنا

براہوی = کھالد، پنجابی کھلنا

گونڈی = جم، پنجابی جھمنا

تامل = ملیالم: اڈی۔ پنجابی = اڈونا (جیسے مار مار کے اڈا دیٹا) بہم پہنچانا

میں منڈا گروہ کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔

سنتھالی، منڈاری : دل - پنجابی : دلنا۔

مطالعہ کے دوران ہمیں دراوڑی اور منڈا گروہوں کے کئی الفاظ روزمرہ کی پنجابی زبان میں ملیں گے۔ اگرچہ بعض صورتوں میں ان کے معنی بدل چکے ہیں یا ساخت بدل گئی ہے۔ مثال کے طور پر پنجاب کے دیہاتوں میں جب ماں ذرا ناراضگی سے بچوں کو کھانا کھانے کے لئے کہے گی تو "کھا نن لا" یا صرف "نن لا" کے الفاظ استعمال کرے گی۔ ننا بمعنی کھانا۔ تامل، ملیالم کناری اور تلگو وغیرہ زبانوں میں کھانے کو "تنو" کہتے ہیں۔ سندھی میں کھانا کھانے کو "جم" کہتے ہیں۔ جو کہ منڈا حلقہ کی زبانوں سادرا، سنتھالی، منڈاری وغیرہ میں انہی معنوں میں استعمال ہونے والے لفظ 'جام' یا 'جومے' کی ایک شکل ہے۔ ایسے ہی اگر بچے ماں کو کھانے کے لئے تنگ کر رہے ہوں تو وہ پنجابی میں کہے گی: "جرا ساہ لئو۔ ہنے توسا پکا دنی آں۔" یعنی تھوڑا صبر کرو ابھی 'توسا' پکا دیتی ہوں۔ اب یہ توسا روٹی کے معنی میں تامل، ملیالم "دوسا" بمعنی "پسے ہوئے چاولوں کی روٹی" کی ہی ایک شکل ہے۔ پنجابی اور دراوڑی میں گھر کے لئے بھی مشترک الفاظ ملتے ہیں جیسے کہ:-

تامل، کناری : کھولی - پنجابی : کھولی بمعنی کوٹھڑی، کھولا بمعنی مکان

تلگو : الو - بمعنی گھر - پنجابی : آلہ بمعنی گھروندا، آلنا بمعنی گھونسلہ

ملیالم : کڈی بمعنی گھر - پنجابی : کھڈی - بمعنی چھوٹی کوٹھڑی - کھڈا بمعنی مرغیوں کا ڈربہ۔

تامل : وڈو - برہی : آودا بمعنی گھر - پنجابی : ویہڑا بمعنی صحن۔ اڈا بمعنی ٹھہرنے کی جگہ (جیسے کبوتروں یا تانگوں وغیرہ کا اڈا) دور کیوں جایئے۔ یہی چندہ کا لفظ لے لیجیے۔ اخباروں، رسالوں کا سالانہ چندہ، مسجدوں، یتیم خانوں کے چندے اور چندہ خور وغیرہ۔ یہ لفظ جنوبی ہند میں استعمال ہونے والے لفظ "سندھ" بمعنی محصول - چنگی بھی انہی معنوں میں استعمال ہونے والے تلگو لفظ "سنکم" اور ملیالم "چنگم" سے ماخوذ ہے غرضیکہ پنجابی زندگی کے ہر شعبہ میں ہمیں دراوڑی زبان کا عنصر نظر آتا ہے۔ ہم یہ

تو نہیں کہہ سکتے کہ پنجابی میں دراوڑی عنصر کی بھرمار ہے۔ ہاں جو حصہ ملتا ہے۔ اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یاد رہے کہ کئی دراوڑی الاصل الفاظ بظاہر سنسکرت سے مشتق نظر آئیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر ایسے الفاظ خود سنسکرت نے مقامی زبانوں سے مستعار لئے ہیں۔ کیونکہ یہ الفاظ آریائی کنبہ کی دیگر زبانوں میں نہیں ملتے۔ منڈا حلقہ کی زبانیں اگرچہ دراوڑی زمرہ سے بالکل علیحدہ گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن قارئین کی دلچسپی کے لئے بعض مثالیں منڈا زبانوں کی بھی درج کر دی گئی ہیں۔ (اختصار کی غرض سے تفصیلی بحث سے گریز کیا گیا ہے۔ ضرورت کے وقت صرف مختصر اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ پورے الفاظ کی جگہ ذیل کے اختصارات استعمال کئے گئے ہیں :-)

(س : سنسکرت ، در : دراوڑی ، پ : پنجابی ، آر : آریائی ، مل : ملیالم ، ت : تامل ، تل : تلگو)

اعضائے جسمانی

جسم :- در : دیہہ - پ : دیہہ ، س : پنڈ ، پ : پنڈا

پیٹ :- در : پوٹا - پ ، اردو : پیٹ ، پرندوں کا پوٹا - س : جٹھر

کمر :- منڈا : کنڈ ، کناپ - پ : کنڈ

سر :- در (ت ، تل ، مل) : تالا - پ ، اردو تالو (چندیا)

ٹوڈا ، باڈگا ، کوہاتر : منڈی - پ : منڈی - س : سیس

بال :- در (گونڈی ، اڑاؤن) : چوٹی - پ : جت ، جھنڈ(۱) ، جنڈے

سندھی : چوٹی ، جھنڈا ، اردو : چوٹی

تامل ، ٹوڈا ، باڈگا : میر - پ : مینڈھی - (گندھے ہوئے بال) (۲)

س : کیش

آنکھ :- در : کن - غالباً پنجابی لفظ آنہ بمعنی آنکھ اسی لفظ سے مشتق ہے۔

ٹانگ :- در : جانگ - پ : جنگ (۳)

---

(۱) قب : جھنڈولا ۔ جھنڈ (یعنی بالوں کا) (۲) نیز اردو (۳) قب جانگھ

پاؤں :- منڈا (منڈاری، گوروا، ماورا)، کھری (۱)؛ پنجابی، کشمیری: پیری: کُھر- وائیگلی (کافر): کیور- در: کال- پ: کھلا (جوتی) غالباً اسی کال سے سے نسبت رکھتا ہے۔

سندھی: پاگو (سنسکرت پادہ، اور دراوڑی "کال" کا مجموعہ)

ایڑی :- در: اڈی- پ: اڈی

بغل :- بروہی: کچھ- پ: کچھ

پنڈلی :- بروہی: پنی- پ: پنی یا پنجنی

منہ :- بروہی، کناری: بیئی- تامل، ملیالم: ویئی- ملتانی، سندھی: وات۔

رشتہ جات

ماں :- در: اماں- پ: ماں، اماں، امبو- س: متر، ماتا۔

باپ :- در: اپا- پ: پیو- اردو: ابا- س: پتر- پتا۔

اگرچہ باپ کے لئے عربی میں ابت اور عبرانی میں اَب کے الفاظ بھی موجود ہیں لیکن ساخت کے لحاظ سے اردو اور پنجابی الفاظ دراوڑی سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں

گونڈی (در): بابن- پ: بابل، بابا، باپو- اردو: باپ

عورت :- در (ساورا): سیلو- (تریموگی): چالی- ملتانی: تحتی- زال اردو، پ: سالی (بیوی کی بہن) بھی غالباً اسی لفظ سے علاقہ رکھتا ہے۔

گونڈی (در): اسکنا بمعنی بیوی- اردو، پ: سوکن بمعنی دوسری بیوی۔

بڑا :- در: پیڈا، بوڈو- پ: وڈا

چھوٹا :- گونڈی (در): لوڈو- پ: لوڈا- اردو: لڑکا، لونڈا

کنبہ :- در: پریوارم- پ: پریوار- ملتانی: پروار

دوست :- در: مترم- پ: متر

---

(۱) قب- جانوروں کے کُھر۔ ادارہ

حیوانات

گائے :- ور : اوولا - پ : ویہڑ، وہڑ - بروہی : ڈھگی - پ : ڈھگی
س : دہینو

گلہ :- (گائے کا) ور : آیڑ - پ : راجڑ - بروہی : بگ - پ : وگ

گڈریا گلہ بان :- ور : ایرادی - پ : آجڑی

بیل :- ور : ایڈولو - پ : دھولا -

گناری ، باڈگا ، ٹوڈا (ور) ہور - پ ، اردو : ڈھور - ملتانی (منڈا) :
ڈنگر - پ ، اردو : ڈنگر ، ڈانگر -

بھینس :- ور : باریو - پ : بھوری (گائے اور بھینس کے لئے اکثر
بجارو کا لفظ بھی مستعمل ہے)

گھوڑا :- ور : گورم - پ ، اردو : گھوڑا - س : اشو

اونٹ :- ور : وتے - پ : بوتا - بروہی : ڈاچی - پ : ڈاچی

بکری :- ور : چیلی - پ : چھیلی - ملتانی : مذکر چھیلا (اس کے علاوہ بکریوں
کے گلہ کو اسی لفظ کی نسبت سے 'چھیڑ' کہتے ہیں) س : اج

(پشتو : چیلی بھی)

کچھوا :- ور : کوچھیو - پ : کچھوکما

گدھ :- ور : گد - پ : گرج

مور :- ور (مل) : مبیل - (ت) : موہرو - پ : مور

دیمک :- ور : ونکا - پ : سیونک

لید :- (گھوڑوں اور گدھوں کی) بروہی : لدھ - پ : لد

ضروریات خانہ داری

ریشم :- ور : پٹو - پ : پٹ -

دھاگے کی انٹی :- ور : اٹی - پ : اٹی (سوتی دھاگوں کا لچھا

دھاگہ :- ور : تنتو - پ : تند - (قب اردو : تانت)

آون :- در : ونی - پ : اون

رسا :- در : رچو - پ : رسا

چھاج :- در : چھاتلا - پ : چھج (مصدر چھٹنا سے)

کدال :- در : گڈالی - پ : کدالی

ہل :- در : پل - پ : ہل (زمین کھودنے کے لئے رہے کا حصہ پھل یا پھالا کہلاتا ہے)

ٹوکری :- در : ٹیک - پ : ٹوکرا

چاقو :- در (تل) : کاتو - (مل) : کادو - پ : کاچو

چارپائی :- در : منچم - پ : منجی

پتھر :- در : سِل - پ : سِل - اردو : سِل (جیسے سل بٹہ)

طشتری :- در : تالیکا - پ ، اردو : تھالی

ڈوئی :- در (براہی) : ڈو - پ : ڈوئی

ڈولی :- در : ڈولا - پ : ڈولی -

گھڑا :- در : چاٹی یا شاٹی - پ : چاٹی

تخت :- در : گدوگہ - پ ، اردو : گدی (جیسے گدی نشین)

دیوار :- در : گودا - پ : کندھ

چوکھٹ :- در : واگیٹ - پ : چوگاٹھ

کواڑ :- در : کواڑ - پ : کواڑ

پنڈال :- در (ت) : پنڈال (وسیع مکان) غالباً پنجابی پنڈ بمعنی گاؤں اس کا ہم اصل ہے۔

زیورات و لباس

جوتا :- در (تل) : سِل - پ ، اردو : چپل - براہی : لتر - پ : لتر (۱)

---

(۱) رقیب اردو : لیترڑے ،

منڈا :- (کولامی) : کیڈل - (ناہلی، کورکو) : کھاوڈے - پ : کھیڑی

کپڑا :- منڈا (کورکو، کول، منڈاری) : لیجا - پ : لیڑا (۱) (کوڑا) :

چیرا - پ : چیرا، چیڑا - (کھڑیا) : لتا - پ : لتا -

کنگن :- در : کنکنم - پ، اردو : کنگن

گانا :- در : انی کنکنم - (یعنی دھاگوں کا کنگن) - پ، اردو : گانا

چوڑی :- در : گجلا - پ، اردو : گجرا

بالا :- (کانوں کا زیور) در : والا - پ : والا

انگوٹھی :- در : موویرا - پ : منادری - بردہی : چھلا - پ : چھلا

موتی :- در : موتو - پ، اردو : موتی

ہیرا :- در : دہیرا یا وجیرا - پ، اردو : ہیرا

دھاتیں

سونا :- بردہی : خسن - گونڈی، کھونڈ : سونو، ٹوڈا، باڈگا : چنا - پ، اردو : سونا - س : سورنام (مقامی زبانوں سے مستعار) فارسی : زر - یونانی : کرسوس جرمینک : گولڈ -

چاندی :- در، گونڈی : چاندی (تل) : واندی - منڈا (ساورا، سنتالی) : چاندی پ، اردو : چاندی - س : چندریکا (مقامی زبانوں سے مستعار) فارسی : سیم، نقرہ یونانی : ارجاس - لاطینی : ارجنتم)

تانبا :- در : چیمبو - پ، اردو : تانبا - س : آیاس -

پیتل :- در : کانسو - پ : کانسی

لوہا :- در (کھونڈ) : لوہا - منڈا (ساورا) : لوان - پ، اردو : لوہا - س : لوہیتم (مقامی زبانوں سے مستعار - فارسی : آہن - گاتھی : آئرن - کیلٹی : آئسرنو)

---

(۱) اردو محاورہ "لیریاں لگ گئیں (کپڑے تار تار ہو گئے)" ادارہ

چونا :- در : چونم - پ ' اردو : چونا

اشیاءِ خورد و نوش

پانی :- در (براہوی) دیر (گونڈی ، کھونڈ) : ییئیر - (تل) نیل (ٹوڈا ، باڈگا ، کناری) نیر - پ : نیر - منڈا (باوری ، تریمیوکی ، ہوری ، بھٹوکی) : پانی - پ ' اردو : پانی - س : پانیم ، جلم ، اپس ، آدان ، واری (غالباً علاوہ آدان کے باقی سب مستعار - یونانی : اُغر - لاطینی : آنڈ - روسی : ووڈا) ملیالم : ویلم - س : جلم سمیری : اپسو - فارسی : آب - س : اپسو

اناج :- در : انم (اُبلے ہوئے چاول) - پ : اَن -

نمک :- در : نون - پ : نُون ، نون ،

پلاؤ :- در : پلاگم (دال اور چاول پکے ہوئے) - پ : پلاؤ

چاول :- در (قدیم تامل) : چور (جدید تامل) : سور - پ : چول - در : مچو - یعنی ٹوٹے ہوئے چاول - پ : منجی -

روٹی :- در (رٹ ، تل) : دوٹی - (باڈگا) : روٹی - پ ' اردو : روٹی نیز پ : دوڑ - پشتو : ڈوڈئی -

غلہ :- در : اُلا بمعنی غلہ - پ ' اردو : غلہ

کانجی :- در : کانجی (اُبلے ہوئے چاولوں کا پانی) پ : کانجی بمعنی اچار ڈالی ہوئی گاجروں کا ترش پانی - غالباً اسی دراوڑی لفظ سے نسبت رکھتا ہے۔

چاولوں کا گولہ :- در : پنڈا بمعنی پسے ہوئے چاولوں کا گولہ - پ : پنی -

مرچ :- در : مرایہ - پ : مرچ

ناریل :- در : ناریکلا

سونٹھ :- در : سونٹی - پ : سنڈھ

بینگن :- در : ونکیلا - پ : وینگن

پیاز :- در : الی گڈا - پ : گنڈھا -

نمک :- در : لون - پ : لون - یا نون (لون کی نسبت سے پنجابی میں سالن کو لاون یعنی نمکین کہتے ہیں :)

افعال

جانا :- در : (بروہی، گونڈی) : ہن - سندھی : ون - ملتانی : ونج (تل، مل، پڑوگاہ) : پو - شینا، دراس (دردی گروہ) بوٗپوشائی : پائی - خوارتی . بی ، پ : وہو یا دیہہ - س : گام

آنا :- در (بروہی، کھونڈ، باڈگا، کناری) : با - (تل، مل، ت، گونڈ طبی ٹوڈا) وا : پ، اردو : آ - منڈا (منڈاری، سنتھالی) : ہیجو - سندھی، پوٹھاری، پاشکلی، وائلا : آیمہ - س : آگم -

بولنا :- در : کو - پ : کونا - اردو : کہنا -

خفا ہونا :- در : کوپم - پ : کھپے ہونا - اردو : خفا ہونا -

علاوہ ازیں بروہی کے مندرجۂ ذیل مصادر بھی قابل غور ہیں :-

بھاگنگ بمعنی بیچنا - پ : اردو : بھاڈ کرنا -

پائینگ بمعنی کہنا یا بتلانا - پ : پانا مثلاً "نی بات پاؤنا" (کہانی سنانا)

ترنگ بمعنی کاتنا - پ : ترنجن بمعنی کاتنے کی جگہ -

چھنڈنگ بمعنی جھاڑنا - پ : چھنڈنا -

ہلن تنگ بمعنی مانگنا - پ : منگنا - ٹرکنگ بمعنی ابالنا - پ : تڑکنا

چھٹ خنگ بمعنی بکھرنا - پ : چھٹا دینا -

خننگ بمعنی کھودنا - پ : کھٹنا

زچ کننگ بمعنی تنگ کرنا - پ : زچ کرنا

متفرقات

چاند :- در (تل، کناری) : چندر - (ت، مل) : چندرن - منڈا، گروہ (منڈاری، سنتھالی) : چندو - (ساورا) : انا - پ : چن، چند - اردو : چاند

س : چندر (مقامی زبانوں سے مستعار) سوم (س : سوم اور قدیم فارسی : ہوم ، عبری لفظ ہومو بمعنی چاند سے مشتق) ماس (آریائی گروہ سے منسلک - فارسی : ماہ - یونانی : مینے . سویڈی : مانی)

سورج :- در (کھونڈ ، چنو) : بیلا - (ت) : پکون - پنجابی لفظ : "ویلا" بمعنی وقت غالباً سورج یا دن کی نسبت سے اسی لفظ بیلا سے مشتق ہے . در (بروہی) دے (گماری) : ہوتو سندھی (لار) : اوت - پ (دھنی ، تھلی ، لہندا) : دیہوں .

آگ :- در (مل) : تپا - (رادلر) : تو - پ : تاء - اردو : تپ (اڑاوں) : چیک - (راج محلی) : یک - پ : سیک

پرانا :- در : آدی - پ : آدی مثلاً آدی گرنتھ ، یعنی پرانی کتاب

کشتی :- در : واڑ اور پاری - پ : بیڑی - اردو : بیڑا بمعنی کشتیوں کا مجموعہ . س : نے ، نیکا ، ترنی - فارسی : ناؤ - یونانی ناؤس .

کنارہ :- در : پتم - پ : پتن - س : تٹ یا گھٹ

نالہ (پانی کا) :- در (ت) : کال - پ : کھال ، کھالہ ، کھالی

ڈر :- در : ڈاکو - پ : ڈاکی مثلاً " ڈاکی پوئے " (عورتوں کا کوسنا) بمعنی "دھاکا پہنچے" غالباً اردو لفظ ڈاکو بمعنی سینہ زور لٹیرا اسی لفظ سے مشتق ہے .

الغوزے :- در : نگو سرم (بنسری کی ایک قسم) پ : ملگوجے - ملتانی : الغوزا

گھنٹہ :- در : گھنٹال - پ ، اردو : گھنٹہ غول (وہ آواز جو رات کے بارہ بجے کے گھنٹے کے بعد ہلکی ہلکی چوٹوں سے پیدا کی جاتی ہے - در : گجل بمعنی گھنگرو یا چھوٹی گھنٹی

نیزہ :- در : بلم - پ : بلم - اردو : بلم ، بھالا -

ٹیلہ :- در : ٹھپہ بمعنی ڈھیر - پ : ٹبہ -

نقدی :- در : روکم - اردو : رقم - پ : روک بمعنی نقد ، روپیہ رکم بمعنی نقدی کا روکڑ ، بمعنی روپے پیسے کے حساب کی کتاب .

سفوف :- در : بسام - پ : بسمہ یا وسمہ

کل :- در : (براہوی) : پلکا۔ پ : ہلکا (آنے والی کل)

ناچ :- در (کورخ) : جھمر۔ پ : جھمر۔

پیشہ ور ذاتیں

کمہار :- در : کمبارہ بمعنی برتن بنانے والا۔ پ : کمبیار۔ اردو : کمہار

بڑھئی :- در : تکان بمعنی لکڑی کا کام کرنے والا۔ پ : تکھان یا ترکھان

درزی :- در : چھمبیگا۔ پ : چھیمبا چھینبا۔

جولاہا :- در : چالیاں۔ پ : جلاہا۔ اردو : جولاہا

دھنیا :- در : پنجاری بمعنی روئی دھننے والا۔ پ : پینجا (مصدر پنجنا سے)

حجام :- در : نائینده پ : نائی

چمار :- در : چمی بمعنی چمڑے کا کام کرنے والا۔ پ : موچی

گندھی :- در گندھ بمعنی صندل کی لئی (خوشبو) گاندھی یعنی گندھ فروخت کرنے والا یا تیار کرنے والا۔

ڈھولچی :- در : پرا بمعنی ڈھول پ : پھرائی بمعنی ڈھول والا۔ ملتانی : پراہیں

کباڑی :- در : کواڑی (جنوبی ہند کا ایک فرقہ جس کے فرد گاؤں گاؤں پھیری لگا کر انواع و اقسام کی اشیاء فروخت کرتے ہیں)

باوریا :- در : باوری۔ جنوبی ہند کی ایک جرائم پیشہ قوم۔ پ، اردو : باوریا

~~ملتانی : باورا~~

ڈوم :- در : ڈوم۔ جنوبی ہند کا ایک جرائم پیشہ فرقہ۔ پ۔ اردو : ڈوم

گنتی

اگرچہ برصغیر کے شمالی حصہ کی زبانوں کی گنتی اور اس کے متعلقات تمامتر سنسکرت سے مستعار ہیں۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں منڈا اور دراوڑی حلقہ کی زبانوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سنتھالی، منڈاری، ساورا (منڈا حلقہ) : بار بمعنی دو۔ سندھی : با بمعنی دو پنجابی اور اردو کے ہندسوں بارہ (دو اور دس) بیس (دو دس)، بائیس (دو اور بیس)

وغیرہ سے اس "بار" کا اثر ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی میں دو کے رہے "گنڈا" کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ "دس گنڈے کوڑیاں" یا "پانچ گنڈے گویاں" یعنی بیس کوڑیاں یا دس گویاں وغیرہ۔ اگرچہ یقین وائق سے نہیں کہا جا سکتا۔
لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گنڈا اصل میں دراوڑی (تل۔ت۔ مل) لفظ رنڈ بمعنی دو کی ہی ایک شکل ہے۔ علاوہ ازیں کوڑی بمعنی بیس بھی منڈا حلقہ کی زبانوں سے مستعار ہے۔ جیسے کہ کھڑیا جونگ، ساورا، ماہلی، کورکھ، مالتو اور کوئی وغیرہ زبانوں میں بیس کے لئے کودی یا کادی اور اس سے ملتے جلتے الفاظ مستعمل ہیں۔ یاد رہے کہ کوری غالباً گر (بمعنی ہاتھ، پاؤں) کی جمع ہے۔ یعنی چار حصے یعنی بیس۔

صرف و نحو

دراوڑی اور پنجابی صرف و نحو میں کافی مطابقت اور مشابہت موجود ہے۔ لیکن یہ ایک بالکل علیحدہ موضوع ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانا مزید طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لئے اسے کسی آئندہ وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ ہاں! یہاں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ سنسکرت اور دیگر آریائی زبانیں گرامر کے لحاظ سے تصریفی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی ان میں گردان کے الفاظ زبان کی سہل پسندی کی خاطر آپس میں ملا کر بولے جاتے ہیں۔ بعض اوقات کفایت لسانی کے نتیجہ میں الفاظ کا کچھ حصہ حذف کر دیا جاتا ہے۔ جیسے کہ فارسی میں "میں نے فروخت کیا" کیلئے صرف "فروختم" کہہ کر کام چلا لیں گے۔ اور سنسکرت میں "میں نے ایک گانا گایا" کو محض "اہم گیگو" میں ادا کر دیں گے۔ اس کے برعکس اردو، پنجابی، شمالی ہند کی دیگر زبانیں اور دراوڑی گروہ سے تعلق رکھنے والی زبانیں بنیادی طور پر غیر تصریفی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی ان کی گردان کیلئے مرکب الفاظ کی بجائے علیحدہ علیحدہ اور مستقل الفاظ مستعمل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پنجابی میں پہلے فقرہ کو "میں ویچیا" اور دوسرے فقرہ کو "میں اک گیت گایا" کے الفاظ میں ظاہر کریں گے۔ کنڑی میں "میں نے گیا" کے لئے "مادیا انیو" کے الفاظ استعمال کریں گے اور اس کی گردان اس طرح ہوگی:-

مادید	اینو	مادید	ایدو
گیا	میں نے	گیا	اس نے

ماو بید — ای   ماو بید — آرو

کیا تو نے   کیا انہوں نے

اسمائے ضمیر کے مندرجہ ذیل نقشوں سے بھی آریائی اور برصغیر کے شمالی حصہ کی زبانوں کے درمیان اختلافات کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے :-

نقشہ اسمائے ضمیر (۱)

دراوڑی گروہ				برصغیر کے شمالی حصہ کی زبانیں					مقامی زبانوں سے متاثرہ سنسکرت	
ملیالم	تامل	کنڑی	ٹوڈا	پراکرت	سندھی	ملتانی	پنجابی	اردو	بنگالی	سنسکرت *
نا	ناں	نانو	اَن	ہاں	اوں	ماں	ہیں	میں	امی	اہم
اینٹر	اینا ڈو	نانڈو	ینڈو	ماہاں، مہارُ	مجھو سندھی کے ذیل میں منہجو	مانڈا	میرا	میرا	امار	مدیاہ
نی	نی	نینو	نی	توں	توں	توں	توں	تو	تمی	تؤام
نینڈا	اوناڈو	نیناڈو	نندو	تجھو، تہارُ	توجو	تینڈا	تیرا	تیرا	تمار	تودیاہ
نینل	نیرو	نیوو	نبو	تمہیں	اوہیں	تساں	تسیں	تم	تمرا	یویام
نینانڈا	اَماڈو	نمانڈو	نندو	تمہارُ	اوہانجو	تسانڈا	تساندا	تمہارا	تماڈیر	یشمدیاہ
اوان	اواں	اوانو	او	سو	ہو	او	اوہ	وہ	آنی	ساہ
ندے	اوانڈو	اوان	اوان	تدو	ہنانجو	اونڈا	اوہدا	اس کا	ناں ہار	تدیاہ

نقشہ اسمائے ضمیر (ب)

آریائی گروہ کی زبانیں

سنسکرت	قدیم فارسی	جدید فارسی	قدیم یونانی	آئسلینڈی	اطالوی
اہم	اوم	من	ایگو	ایکا	آئیو
ماما	مائے	ام	موئے	میک	میو
توام	توام	تو	تو	تو	تو
توا	تائے	ات	یومیز	تھن	توا
یویام	یوزیم	شما	—	—	—
یشماکم	یشماک	اماں	-	-	-
ساہ	ادا	اد	سی	کن	ایسو
تسیہ	شے	اش	کینوس	کنس	سوا

مندرجہ بالا اسمائے ضمیر کے نقشوں سے دراوڑی اور برصغیر کے شمالی حصہ کی زبانوں خاص کر سندھی اور ملتانی کے ساتھ مطابقت اور ان کا سنسکرت کے ساتھ اختلاف بالکل واضح ہے اردو، بنگالی اور پراکرت میں 'دا' اور سندھی میں 'جو' کے لاحقات دراوڑی اور ملتانی ضمائر کے لاحقات 'دا' یا 'ڈا' کے مترادف ہیں۔ ان سے خود سنسکرت کے بعض ضمائر بھی متاثر ہوئے ہیں۔ جیسا کہ نقشہ اول میں خط کشیدہ ضمائر سے واضح ہے۔

دراوڑی اور وادئ سندھ کی موجودہ زبانوں میں لغوی مطابقت، پیشہ ورانہ فرقوں کے مشترک نام اور اسمائے ضمیر کی باہمی مماثلت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ایک وقت میں (آریاؤں سے قبل) وادی سندھ میں دراوڑی اور منڈا اقوام کا دور دورہ تھا۔ اور یہاں ان کی زبانیں رائج تھیں۔ جب آریا قبائل آئے تو جہاں خود انہوں نے یہاں کی مقامی زبانوں سے گہرا اثر قبول کیا وہاں کچھ حد تک مقامی زبانوں کو بھی متاثر کیا۔ لیکن ان کے اقلیت میں ہونے کی بنا پر وہ اثرات اتنے ہمہ گیر نہ تھے۔ اس سے زیادہ تر صرف لغوی پہلو ہی متاثر ہوا۔ یہاں کی صرف و نحو کے ڈھانچے نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ اور تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ آج تک

اسی طرح سے قائم ہے۔ اہل علم حضرات نے ان مقامی زبانوں کو قدیم پراکرت کا نام دیا ہے۔ اور اسی قدیم پراکرت سے وادیٔ سندھ کی موجودہ زبانوں نے جنم لیا ہے۔ یعنی ان کی مورث اعلیٰ سنسکرت نہیں بلکہ بالواسطہ دراوڑی زبانیں ہیں۔

قارئین کے تفنن طبع اور مزید ثبوت کے طور پر گونڈی (دراوڑی گروہ) زبان کی دیومالا سے ایک مقبول گیت پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ تاکہ ناظرین پر دراوڑی اور پنجابی کے درمیان باہمی مشابہت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ پنجابی ترجمہ میں بعض جگہ ایسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ جو اگرچہ روزمرہ میں مستعمل نہیں ہیں۔ لیکن عام طور پر آسانی سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور عام بول چال یا کلاسیکی ادب میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

سانڈ سوم جی ناساک کو پایت رو بابن

پ :۔ سانڈ سوم جی دا گیت سنو رے بابا

اردو:۔ سانڈ سوم جی کا گیت سنو اے بابا

سرک اسک کیمتور، سنگ بابن ہلے پتور

پ :۔ چھی سوکناں (بیوی) کیتیاں سنگ بابا نہیں جمیا

اردو :۔ چھ بیویاں اس نے کیں (پھر بھی)، سنگ بابا پیدا نہیں ہوا۔

یرون اسک کیتور، اوی تے سنگ بابن اوترے تور

پ :۔ ستویں تیویں (سوکن) کیتی اودھی سنگ بابا پیٹ پے گیا

اردو:۔ ساتویں بیوی (اس نے) کی۔ اس سے سنگ بابا پیٹ میں پڑ گیا۔

اولا رئیتاں بابن پن واکے

پ :۔ اوہدے حمل دا باپو نوں پتہ نہ دتا

اردو :۔ اس کے حمل کا باپ کو پتہ نہیں دیا گیا۔

تنکسی توں بابن تنوا پری سپتے کیالے

پ :۔ ٹرپیا بالپو (پردیس نوں) تن دا (اوھدا) پریوار اکٹھا ہویا۔

اردو:- چل دیا باپ (پردیس کو) اس کے اہل خاندان اکٹھے ہوئے

ورو اسکا سووتی ، ساروں مُتا

پ :- وڈی سوکن ستی پئی (دوجیاں ، چھپی (اوتھے) سی

اردو:- چھوٹی بیوی سو رہی تھی (دوسریاں) چھپ (وہاں) موجود تھیں۔

:دی قوں، گوٹی اونا تے تلا دوربیسی، اسوں انگا چاداپتی

پ:- اوہناں نے کہیا۔ ٹوکری دا منہ اوہدے تالو (سر) تے چڑھا دیو۔ اساں دے

(آنگن) (ویہڑا) پتر جمیا۔

اردو:- انہوں نے کہا۔ غلہ کی ٹوکری کا منہ اس کے سر پہ چڑھا دیں۔ ہمارے گھر لڑکا

پیدا ہوا ہے۔

اُو ات ، اہے کنت انا تے تلا توں دوریتوں

پ :- انج کہیا ایہو کینا۔ ٹوکری وا منہ اوہدے تالو تے چڑھا دتا

اردو:- ایسا کہا ایسا ہی کیا۔ ٹوکری کا منہ اس کے سر پہ چڑھا دیا۔

اس مضمون کی تیاری میں زیادہ تر مندرجہ ذیل کتابوں اور مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے

(1) HISTORY OF INDIA BY MOUNTSTURAT ELPHINSTON 1857

(2) ETHNOLOGY OF INDIA BY R.G. LATHAM 1859

(3) LINGUISTIC SURVAY OF INDIA BY G.A. GRIERSON 1927

(4) THE INDIAN EMPIRE BY W.W. HUNTER 1892

(5) THE ORIGIN OF THE ARYANS BY ISAAK 1892

(6) HANDBOOK OF BIROUHI LANGUAGE BY ALLAH BUX 1877

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از جان بیمز، مترجمہ سید احتشام حسین

(7) CASTES AND TRIBES OF SOUTH INDIA BY EDGAR THURSTON 1909

(8) THE VEDIC LANGUAGE BY A.A. MACDONELL (IMPERIAL GAZETTER OF INDIA)

قدرت نقوی

غالب کا رابطۂ فرنگ

عظمت و برتری کا وجود دل و دماغ پر جو نقوش مرتسم کرتا ہے، زمانے کے انقلاب میں ان نقوش کو زائل کرنے کی طاقت نہیں اس عظمت و برتری کے فقدان پر احساس برتری ہی شعورِ کمتری کا سبب ہوتا ہے ان دونوں کے تصادم کا نتیجہ یا تو پستی کے قعرِ عمیق میں دھکیل کر ہمیشہ کے لئے عروج و ارتقا کے راستے مسدود کر دیتا ہے اور قویٰ کو قوتِ عمل سے بے بہرہ کر کے مغلوب بنا دیتا ہے۔ یا عظمت و عروج کا عرش نشیں ہونے کا شرف بخشتا اور قویٰ کو قوتِ عمل کا ذریعہ بنا کر عطا کرتا ہے کہ ناکامیوں اور نامرادیوں سے مایوسی کفر کے مترادف خیال ہونے لگتی ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ احساسِ برتری اور شعورِ کمتری کی آویزش، ہمتِ بلند کے لئے تازیانہ کا کام کرتی ہے کیونکہ احساسِ برتری، اپنی بازیافت کا جذبہ ابھارتا ہے اور شعورِ کمتری اپنے استیصال کے لئے انگیخت کرتا ہے۔ اسی حصول و زوال کے مرحلے کو طے کرنے کے لئے بیش از پیش کوشش کا سلسلہ جاری رہتا ہے، کبھی "حریفِ مئے مرد افگن" بن جاتا ہے اور کبھی روح القدس کو بھی اپنا ہمزبان نہیں سمجھتا۔ کبھی اس مقام پر جہاں سے "کچھ ہماری خبر نہیں آتی" پہنچ جاتا ہے اور کبھی "حلقۂ صد کام نہنگ" سے نبرد آزما ہوتا ہوا "گہر ہونے تک" کی منزل کو پا لیتا ہے۔

شعورِ کمتری کے شدید تاثر سے احساس برتری بھی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ شدت یا تو عقل کو ماؤف کر دیتی ہے اور دماغ کو مختل بنا دیتی ہے، ایسی حالت میں جبکہ دماغی توازن برقرار نہ ہو، انسان توہم پرستی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس سے مافوق الفطرت ہستی ہونے کے دعاوی کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ یا دوں ہمتی کے جوہر پیدا ہونے لگتے ہیں جن کا نتیجہ گوشہ گیری کی منزل میں

سکون بخشتا ہے لیکن اگر اس شدتِ احساس میں عقل متوازن اور ہمت بلند ہو تو پھر انسان میں زمانہ سے نبٹنے کے عزائم جنم پانے لگتے ہیں اور ایسے مردِ آزاد، غم والم میں "برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم" کہتے نظر آتے ہیں۔ دنیا کو "بازیچۂ اطفال" اور تغیراتِ زمانہ کو "تماشائے شب و روز" سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک "اورنگِ سلیمان" صرف "ایک کھیل" اور "اعجازِ مسیحا" "بس" "ایک بات" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

یہ باتیں، احساسِ برتری اور شعوری کمتری کی آویزش اور اس دور کے تاریخی عوامل کے ردِعمل سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسا انسان جو احساسِ برتری اور شعورِ کمتری کی آویزش کا شکار ہو اور اس میں زمانے کے تاریخی بہاؤ سے متصادم ہونے کی ہمت بلند بھی موجود ہو تو ان کے ردِعمل سے اس میں زہرخند کی کیفیت اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے دور سے بہت آگے ہوتا ہے اس عالم میں جو باتیں اس کی ذات سے ظہور پذیر ہوتی ہیں وہ اس دور کے عام مذاق و رجحان سے مختلف ہوتی ہیں۔ عام سطح سے بلند، اسی لیے وہ ہدفِ طنز و دق بنتا ہے معاصرین کا یہ طنز اس کی قوتِ تگ و تاز کو انگیخت کرتا ہے اور وہ اپنی طبعِ بلند کو زیر نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ وہ اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر دیکھتا ہے اور خود کو منفرد بنانے کے لئے زمانہ کی نبض پر ہاتھ ڈالتا اور اقدار کا جائزہ لے کر اس مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اگر ایک اقتدار کی لگام میرے ہاتھ سے چھن رہی ہے تو اس کا نعم البدل تلاش کروں اور کوئی دوسرا اقتدار حاصل کر کے اس میں اپنی انفرادیت قائم کروں۔ اسی انفرادیت کو پا لینے کے بعد کہہ اٹھتا ہے:

دانایانِ خوئے بدریم کردہ اند
خندہ بر دانا و نادان می زنم

جو انسان احساسِ برتری، شعورِ کمتری کے تصادم کا شکار اور تاریخی عوامل کے ردِعمل کا اسیر ہو، اگر وہ بلند حوصلہ اور عالی ہمت ہو تو اس کی زندگی کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک وہ عالم کہ جس میں وہ اپنے احساسات، شعور و وجدان، کیفیات و جذبات، خواہشات و تصورات کی خوش آئند دنیا بناتا ہے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے اسباب فراہم کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ دوسرا وہ کہ جس میں وہ تاریخی بہاؤ سے متصادم رہتے ہوئے، عملی زندگی "خوش و

ناخوش" گزارتا رہتا ہے۔ یہ عملی زندگی، درد و تکلیف کا مجموعہ ہوتی ہے، کیونکہ پہلے عالم کی وجہ سے جو" انا" اس میں جنم لیتی اور پرورش پاتی ہے۔ وہ اس کو بلند سطح سے نیچے آکر دریوزہ گری تملق اور چاپلوسی کی سرحد میں داخل نہیں ہونے دیتی۔ مگر جب اس کے بہی خواہ اس کی عملی زندگی کی کربناکی سے متاثر ہوتے ہوئے اس کو مشورہ دیتے ہیں کہ ابنائے زمانہ کی موجودہ روش کو دیکھو جو تم سے کم مرتبہ ہیں، مگر دادِ عیش دے رہے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے زمانہ سے سمجھوتہ کر لیا ہے تم بھی "گر زمانہ با تو نسازد تو بزمانہ بساز" پر عمل کرو۔ پس ہر وقت کے اس مشورے سے اس کے احساس برتری اور شعورِ کمتری کی کشاکش زیادہ تیز ہوتی ہے اور وہ کبھی کبھی چند لمحات کے لئے رک کر زمانہ سے صلح کر لیتا ہے اور ان مشوروں پر عمل پیرا ہو جاتا ہے وہ اپنی سطح سے نیچے اتر آتا ہے۔ عرش سے فرش کی راہ لیتا ہے" فقیروں کا بھیس بنا کر" وہ تماشائے اہلِ کرم" دیکھنے لگتا ہے۔ مگر اس دریوزہ گری میں اس کا احساس اور زیادہ مجروح ہوتا ہے۔ وہ" انا" جس کو اس نے تھوڑی دیر کے لئے الگ کر دیا تھا اس کے اندر بھر ابھر آتی ہے اور" لٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا" کی منزل پر لا کھڑا کرتی ہے۔ وہ دوسروں کا بن نہیں پاتا، بلکہ خود اپنا بن جاتا ہے اور اپنے کرم فرماؤں سے کہہ دیتا ہے" لے لیا مجھ سے میری ہمتِ عالی نے مجھے!"

احساس و شعور کی آویزش اور قوتِ انا کے تاریخی بہاؤ سے تصادم کے نتائج کا عکس ہمیں غالب کی زندگی میں بہ تمام و کمال نظر آتا ہے اور ہم اسی آویزش، کشمکش اور تصادم کے چند پہلو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب کے انگریزوں سے روابط کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ مگر ان روابط کے عوامل، اس زمانہ کی سیاست اور اقدارِ حیات کو پیشِ نظر نہ رکھنے کی کمی پائی جاتی ہے۔ غالب کے ذہنی رجحانات، خاندانی مراتب عظمت کو بھی انفرادی حیثیت سے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

غالب نے جب ہوش سنبھالا، باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ چچا نے سرپرستی فرمائی غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ آگرہ کو انہوں نے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور نواب احمد بخش خاں کی سفارش پر انگریزی فوج میں رسالدار ہو گئے۔ ہزار روپے ماہانہ اور بقول بعض ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ اور ایک جاگیر بسر لہ کے

خرچ کے لئے مقرر ہو گئی۔ مگر غالب نو برس کے تھے کہ چچا ہاتھی سے گر کر دارالبقا کو سدھارے انگریزوں نے صلۂ خدمات وجاگیر کے عوض دس ہزار روپے سالانہ غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے متوسلین کی پنشن ریاست فیروز پور جھرکہ سے وابستہ کر دی۔ نواب احمد بخش خاں والیٔ ریاست تھے۔ بقول غالب انہوں نے کچھ دن بعد دس ہزار کے پانچ ہزار سالانہ کرا دیئے اور خواجہ حاجی کو بھی اس میں دو ہزار کا شریک کرا دیا۔ جس میں غالب اور ان کے بھائی کو صرف پندرہ سو روپے سالانہ ملنے لگے۔ نواب احمد بخش خاں خانہ نشین ہوئے۔ ریاست دو حصّوں میں تقسیم کر دی گئی۔ فیروز پور جھرکہ شمس الدین خاں کو ملا اور لوہارو امین الدین خاں کو۔ شمس الدین خاں کی خاندان کے دیگر افراد سے بنتی نہ تھی۔ شمس الدین نے غالب کی پنشن اور بیگم غالب کا وظیفہ بھی بند کر دیا۔ آمدنی کے وسائل محدود، اخراجات کی تنگی نے پریشان کر دیا۔ غالب پہلے تو نواب احمد بخش خاں کے پاس گئے کہ ان سے مل کر معاملہ سلجھائیں۔ لیکن نواب صاحب نے باتوں سے بہلا دیا۔ غالب نے مجبور ہو کر قانونی چارہ جوئی کا ارادہ کیا۔

اس زمانہ تک غالب کی زندگی ہر طور فراغت سے بسر ہوئی۔ ننھیال سے والدہ کی معرفت کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ نواب احمد بخش خاں بھی کچھ نہ کچھ پنشن کے علاوہ دیتے رہتے تھے۔ سسرال سے بھی مدد ملتی رہتی تھی۔ بے فکری سے اس لئے بسر ہوتی تھی کہ خرچ برداشت کرنے والے مقے۔ نواب کہلاتے تھے۔ انہی ایام کے متعلق ایک خط میں اشارہ کیا ہے۔

"بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں۔ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو جا مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ چاٹو۔ نہ مول، نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلوا دیا۔ کبھی ماں نے آگرہ سے کچھ بھیج دیا۔"[1]

۱۸۲۵ء کے بعد ان امور میں تغیر واقع ہوا۔ قرضخواہوں نے تنگ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر خان (نواب احمد بخش خاں) کے رویّہ میں تبدیلی ظاہر ہے۔ خاص کر ان کے بیٹے شمس الدین

---

[1] خطوط غالب ص۲۷

خاں نے غالب کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

جس عہد کی ہم بات کر رہے ہیں وہ بڑی ابتری کا دور تھا۔ اگرچہ انگریزوں نے حالات کو کچھ نہ کچھ بہتر بنا دیا تھا مگر اہل ہند، معاشی و اقتصادی حیثیت سے بہت پریشان حال تھے۔ غالب نواب تھے مگر جاگیر نہ تھی۔ جائداد نہ تھی۔ انتہا یہ کہ گھر کا مکان تک نہ تھا۔ اٹھنا بیٹھنا امیروں، جاگیرداروں اور رئیسوں کے ساتھ، وضعداری کو قائم رکھنا عزت کو بنائے رکھنا بھی ایک ہمت و جوانمردی کا کام ہے۔ پس اسی وضع و عزت کی خاطر انہوں نے پنشن کی بحالی کے لئے کوشش کی جو دراصل دس ہزار روپے سالانہ تھی جس میں غالب کا حصہ ڈھائی ہزار روپے سالانہ تھا اور وہ اس میں بہر طور گزارہ کر سکتے تھے۔ پس پنشن کے نہ ملنے کی وجہ سے غالب داد خواہی کے لئے دہلی چھوڑ کر کلکتہ چلے، انگریزوں سے ملے۔ اپنی مطلب برآری کے لئے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ گو غالب کے انگریزوں سے روابط پنشن کی بدولت بچپن سے رہے لیکن وہ بالواسطہ تھے یعنی پنشن نواب احمد بخش خاں کے توسل سے مل جاتی تھی۔ مگر جب پنشن میں رکاوٹ ہوئی اور خرچ میں تنگدستی بڑھی تو شعوری طور پر پنشن کی حقیقت پر توجہ دینی پڑی کاغذات دیکھے تو غالب کو معلوم ہوا کہ پنشن میں رکاوٹ تو ظلم ہے ہی تخفیف بہت بڑی ناانصافی اور جعلسازی ہے۔ انہی کے ازالہ کے لئے غالب کو انگریزوں سے بلاواسطہ روابط کا سلسلہ قائم رکھنا پڑے۔

غالب کو اپنے خاندان کی عظمت و برتری کا بڑا احساس تھا۔ مگر تنگدستی کی وجہ سے گردو پیش میں شعور کمتری پیدا ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے تصادم نے انہیں پنشن کی طرف متوجہ کیا جو خاندانی عظمت اور ذاتی معیشت کا واحد ذریعہ تھی۔ یہ ۱۸۲۷ء کی بات ہے اور اسی زمانہ سے انگریزوں سے روابط کا سلسلہ بھی شروع ہوتا ہے کلکتہ انگریزی دارالحکومت تھا لہٰذا غالب پنشن کا دعویٰ کرنے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ بقول مولانا مہر، غالب اپریل ۱۸۲۷ء کو دہلی سے روانہ ہو کر اور ۲۰ فروری ۱۸۲۸ کو کلکتہ پہنچے[1]۔ وہاں انگریز حکام سے ملے اور پنشن کے معاملہ میں گفتگو کی۔ ان

---

[1] غالب از مہر ص۱۱۔ تاریخ ورود کلکتہ مولوی محمد علی خاں کو چہارم شعبان روز سہ شنبہ لکھی ہے مولانا مہر نے تقویم کے ذریعے عیسوی تاریخ تطابق فرمایا تو ۲۰ فروری ۱۸۲۸ء روز چہار شنبہ نکلا۔ غالب نے تاریخ بتقویم لکھی ہے جو حساب بہ رویت ہلال ہے اسلئے جب ہجری تاریخ کو عیسوی کی تطابق کرتے ہیں تو دن کو اساس قرار دیا جاتا ہے میرے خیال میں تقویم ہجری تاریخوں کے لئے زیادہ مستند نہیں ہے۔

کے احباب وہمدرد نواب اکبر علی خاں صاحب طباطبائی، مولوی سراج الدین صاحب اور منشی محمد حسین صاحب سرفہرست ہیں۔ انہی حضرات کے توسل سے اعلیٰ حکام تک بغیر زحمت رسائی حاصل ہوئی سب سے پہلے ان کی ملاقات فریزر اسسٹنٹ سیکرٹری سے ہوئی جس نے آمد پر استقبال کیا، گلے ملا، عطر و پان سے تواضع کی۔ رخصت کرنے ساتھ آیا۔ اسی کو گورنر جنرل کے نام ارادی اس نے درخواست لے کر مسٹر پاٹن کو دی کہ اس کو انگریزی میں ترجمہ کر دو۔[ٖ۵۰] اس کی مدح میں قصیدہ[۵۱] مشمولہ کلیات ہے۔ اس میں تشبیب نہیں ہے۔ مطلع کے بعد ہی مدح شروع کر دی ہے۔ مدح میں پارینہ ومروجہ طریقہ سے کام لیا ہے۔ وہی الفاظ جو ہر ایک کی مدح میں اکثر شعرا استعمال کرتے رہے ہیں۔ غالب نے بھی استعمال کئے ہیں۔ گو بندش کی چستی اور روانی بلا شبہ رشک انگیز ہے۔ آخر میں اپنا درد دل بیان کیا ہے:-

غمے در دلست کہ شور بیانش
جگر پارہ از دیدۂ تر برآرد
فشارد چو اندیشہ ام مغز جاں را
ہمہ ریزۂ نوک نشتر برآرد!

مسٹر اینڈرو اسٹرلنگ، چیف سیکرٹری سے ملے۔ اس کو سخن دوست پایا۔ اس نے امداد کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی مدح میں قصیدہ نمبر ۲۳ اور قطعہ نمبر ۵۴ کلیات میں موجود ہے۔ قصیدہ اس کو سنایا، بہت خوش ہوا۔ اس قصیدہ کی تشبیب غالب کے دل غمزدہ کی ایک فغاں ہے۔ فغاں کے بعد اپنی حالت زار بیان کرتے ہوئے مدح کی طرف گریز کرتے ہیں۔ مدح کا وہی عام طریقہ ہے۔ پھر اپنی حالت بیان کی ہے۔ اسی میں مدعا پیش کیا ہے۔ گویا یہ منظوم عرضی ہے جس کے ذریعے اسٹرلنگ کو اپنی مدد پر آمادہ کیا ہے:-

زلبت سال فزوں میشود کہ می سوزد
نفس چو رشتۂ شمع بہ بزم حیرانی!

۵۰۔ کلیات نثر ص ۱۶۷

بداد گاہ رسیدم چنانکہ دانستم
برس بداد غریباں چنانکہ میدانی

غالب کا مقدمہ کونسل میں پیش ہوا تو اس پر حکم ہوا کہ اس کو پہلے دہلی کے ریزیڈنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد یہاں آنا چاہیئے۔ غالب نے کلکتہ ہی سے کاغذات مرتب کر کے دہلی بھیجے، ہیرا لال کو وکیل بنایا۔ اس زمانہ میں دہلی کے ریزیڈنٹ مسٹر کوبرگ تھے جن سے کرنل ہنری املاک کے گہرے مراسم تھے۔ کرنل ہنری املاک نے مسٹر کوبرگ کے نام اور مولوی سراج الدین نے میر منشی التفات حسین کے نام سفارشی خط دیا تھا۔ غالب کو قوی امید تھی کہ کوبرگ حسب منشا رپورٹ کرے گا۔ مگر کاغذات دہلی پہنچے تو کوبرگ بالزام رشوت ستانی برطرف ہو گیا۔ فرانسس ہاکنس اس کی جگہ ریزیڈنٹ دہلی مقرر ہوا۔ ادھر گورنر جنرل نے کلکتہ سے الہ آباد اور دہلی کی طرف جانے کا پروگرام بنا لیا۔ غالب نے کلکتہ میں قیام کرنے کو مفید نہ سمجھا اور دہلی آنا اس لئے مناسب خیال کیا کہ دہلی آ کر خاطر خواہ رپورٹ لکھائی جاتے مگر بیکار کیونکہ شمس الدین خاں نے فرانسس ہاکنس کو اپنے موافق بنا لیا تھا۔ چنانچہ اس نے غالب کے خلاف رپورٹ کر دی۔ غالب کو پھر بھی امید تھی کہ اسٹرلنگ کام کو سنبھال لے گا مگر ابھی رپورٹ نہ پہنچی تھی کہ مسٹر اسٹرلنگ کا انتقال ہو گیا۔ قطعہ نمبر ۵۴ اسی کی وفات پر لکھا ہے۔ اب ان کی امید صرف مسٹر جارج سوئینٹن سے وابستہ رہ گئی تھی۔ وہ بھی لندن چلا گیا۔ غالب بے یار و مددگار رہ گئے۔ مولوی سراج الدین احمد کو ۱۲ اکتوبر ۱۸۳۰ء ۵ جمادی الاول ۱۲۴۶ھ کو لکھتے ہیں۔

"اما چہ کنم کہ کار برگشت و روزگار برگشت، خدارا بنگر و مدد دل من وا رس۔ کوبرگ بتوسط کرنیل ہنری املاک برمن مہربان شد و دور وپتیکہ خوشتر ازاں نتواں اندیشید بعد رفت و جوابیکہ سود مند تر ازاں نتواں سنجید از صدر حاصل نماید ہنوز

آں جواب درراہ باشد کہ کولبرگ معزول گردد
ہاکس بجائے کولبرگ نشیند۔ انچہ برہم زدن ہنگامۂ
سلطنتِ ما بس باشد از بہر من بصدر نویسد و من دراں
داوری از مسٹر اسٹرلنگ چشم یاوری داشتہ باشم
ہنوز آں رپورٹ بصدر نرسیدہ باشد کہ مسٹر اسٹرلنگ
راہ ہرو راہِ عدم گردیدہ باشد چوں ہمہ بگسلم و بدامن
جارج سوئنٹن آویزم، اگرم از جا برخیزد و دامن
برشغل جہانبانی افشاند۔ سبحان اللہ! معزول نگردد
مگر کولبرگ، امرگ ناگاہ نمیرد، مگر اسٹرلنگ، بولایت
نرفت۔ مگر جارج سوئنٹن، در خود ایں صدمہ ہائے
جانکاہ نباشد مگر اسد اللہ داد خواہ[1]"

ایک اردو خط بنام سرور مارہروی میں حضرت صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا
تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میرے اور
میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر
نواب احمد بخش خاں، دس ہزار روپے سال مقرر
ہوئے۔ انہوں نے نہ دیئے۔ مگر تین ہزار روپے
سال۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ
ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی
میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرگ صاحب بہادر ریذیڈنٹ

---

[1] کلیات نثر ص۱۲۳

دہلی اور راستر لنگ صاحب بہادر سیکرتر گورنمنٹ
کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ ریذیڈنٹ
معزول ہو گئے۔ سیکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ
مر گئے [۱]"

فرنسس ہاکنس نے غالب کے خلاف رپورٹ کی تھی۔ اس کی مذمت میں یہ قطعہ نمبر۱۵
لکھا ہے:۔

ایا ستم زدہ غالب زہاکنس مسگال
منہ بسینۂ بے کینہ از شکایت داغ
اگر بصدر خلاف تو کردہ است رپورٹ
دگر بخشم بقتل تو بستہ است جناغ
قضا بنائے خرابی نگندہ ہم زنخست
ندیدۂ کہ ہمہ عکس غالبست بلاغ

انگریز مشرقی ہندوستان سے آگے بڑھ کر ہندوستان کے ہر علاقہ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ قابض ہو چکے تھے۔ بہادر شاہ ظفر بھی انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے۔ ان کا اقتدار صرف قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھا۔ باقی ہر امر میں مختار کل انگریز تھے۔ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر بجز معدودے چند (اہل خانقاہ) ہر شخص ان کی طرف جھک رہا تھا اور وہ بھی اپنے مفید مطلب اشخاص کو نوازتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے لئے اردو کتابوں کے تراجم کرائے اور معقول مشاہرے دیئے۔ میرامن دہلوی نے جان گلکرائسٹ کے متعلق بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ غالب کی مدحت طرازی کے متعلق اکثر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں کہ غالب نے انگریزوں کی مدح میں قصیدے لکھے۔ ان کی خوشامد کی۔ مدحت طرازی و خوشامد ایک خوددار آدمی کی شان کے خلاف ہے۔ مرزا غالب کا دعویٰ خودداری باطل ہے۔ ایسے حضرات

---

[۱] خطوط غالب طبع ثانی صہ۱۵۱

نے کلامِ غالب اور اس وقت کے ماحول اور حالات کا مطالعہ دقتِ نظر سے نہیں کیا۔ ورنہ وہ مرزا کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کرتے۔ غالب ـــ معاشی بحران میں مبتلا تھے جس کے متعلق بیان گزر چکا ہے۔ نیز قدر ناشناسی کے اسیر بھی تھے۔ جس کی شکایت انہیں ہمیشہ رہی۔ غالب بحیثیت شاعر، عرفی۔ نظیری، ظہوری وغیرہ سے کم مرتبہ نہ تھے بلکہ ان کا مرتبہ کچھ بلند ہی ہے۔ ان شعرا کی قدر و منزلت کی داستانیں معلوم تھیں۔ غالب بھی ویسی ہی قدر و منزلت کے خواہاں تھے۔ اس میدان میں بھی ان کو اپنی برتری کا احساس بہرحال رہا۔ لیکن زمانہ نے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس سے شعورِ کمتری کا پیدا ہونا ایک لابدی امر تھا۔ غالب نے اپنی برتری کے لئے کوشش کی اور انہیں انگریزوں کے علاوہ اور کوئی نظر نہ آیا جو انہیں بلند مرتبہ دے سکتا۔ چنانچہ خود کو ملکہ کا شاعر بنائے جانے کی تمنا کا اظہار اسی بنا پر کیا ہے۔ ورنہ کلکتہ کے دوران قیام سے لے کر آخر تک انگریزوں کے متعلق جتنے قطعات و قصائد ہیں ان میں سے زیادہ تر منظوم عرضیاں ہیں۔ ان کا منشا ہی یہ تھا کہ حکام وقت پنشن، خلعت، دربار اور خطاب کے بارے میں میری مدد کریں۔ غالباً ۱۸۴۳ء میں سپریم کونسل کے ممبر مسٹر چارلس مٹکاف کی مدح میں قصیدہ نمبر ۲۳ لکھا تھا[1]۔ اس کے چند شعر دیکھئے بالکل عرضی ہیں۔ قصیدہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ مسٹر چارلس مٹکاف دہلی آئے ہیں۔ غالب کلکتہ میں ان سے مل چکے تھے۔ تشبیب کے بعد مدح میں وہی مبالغہ آمیز باتیں دہرائی گئی ہیں جو ہر ایک کے لئے بادنیٰ تغیر استعمال ہوتی رہی ہیں۔ پھر اپنی حالت زار بیان کر کے مطلب کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:ـ

پنج مطلب ز توام ہست بصد گونہ امید
خواہم آں پنج علی الرغم حسود و غماز
اول انیست کہ در باب معاشے کہ مراست
کنی اندیشہ حکم بہ طریق ایجاز
ہرچہ در دفتر سرکار بود نقش پذیر
ہم باندازہ آں نقش شوی مائدہ ساز

---

[1] کلیاتِ نظم ص ۲۵۶

دوم آں کز اثر عدل تو اے سنجر عہد
عیز یابندہ دریں وجہ نباشد انباز
سوم آنست کہ دیگر نکنم دست طلب
پیش فرماندۂ میوات، بدریوزہ دراز
ہم بہ گنجینۂ سرکار براتے خواہم
دادہ انصاف بدیر یافتگی اذنِ جواز
چہارم آنست کہ باقی زرِ چندیں سالہ
بے نزاع و جدل و جہد بمن گردد باز
پنجم آں کز پس ایں فتح کہ بنماید روئے
دہیم مژدۂ اکرام و نوید اعزاز
بخشیم تازہ خطابی و برآں افزائے
خلعتی در خور ایں دولت جاوید طراز[1]

غالب کی قادر الکلامی قابلِ داد ہے کہ اپنے مطالب کو کیسے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے اس مدحت طرازی کی علتِ غائی معاشی تنگی سے نجات تھی۔ ورنہ ۱۸۵۷ء سے قبل انہوں نے کسی انگریز کی مدح میں ایک شعر بھی نہیں لکھا۔ پس اس کو مطلب برآری کا وسیلہ ہی کہا جائے گا غالب شاعر تھے۔ انہوں نے صحیح راستہ اختیار کیا کہ شعر کو ذریعۂ اظہارِ مدعا قرار دیا۔ نثر کے مقابلے میں شعر کی تاثیر مسلم۔ اگرچہ غالب کے حق میں شعر کی تاثیر بھی معدوم ہی رہی۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب نے ہندوستانی امراء و سلاطین کی شان میں بھی قصیدے لکھے ہیں۔ لیکن انہوں نے غالب سے کیا سلوک کیا؟ یہ بات سب پر روشن ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے بھی حکیم احسن اللہ خاں اور حضرت کالے صاحب کی سفارش پر غالب کو ملازم رکھا اور تنخواہ صرف پچاس روپے ماہانہ "تاریخ نویسی خدمت" بعد میں اصلاح شعر کا کام بھی سپرد ہوا۔ انگریزوں

۱؎ کلیات نظم ص ۲۵۸

کے خزانہ سے ساڑھے باسٹھ روپے سالانہ ملتے تھے جس کے عوض کوئی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ غدر کے بعد نواب رامپور نے ضرور (جولائی ۱۸۵۹ء سے) سو روپے ماہانہ سے مدد کی۔ بس یہ اس زمانہ کا طریقہ تھا کہ شاعر کا جس سے توسل ہوتا اسی کی مدح سرائی کرتا۔ اگر غالب کا تعلق پنشن کی وجہ سے انگریزوں کے ساتھ نہ ہوتا تو غالب بھی اوروں کی طرح انگریزوں کی مدح نہ کرتے۔ غالب کی اس مدحت طرازی کی حقیقت اس وقت واضح ہو جاتی ہے جبکہ ہاکنس، غالب کے خلاف رپورٹ کرتا ہے تو غالب اس کی قدح پر اتر آتے ہیں۔ اس کا ایک ہی مطلب ہوا کہ جس سے مطلب برآری میں امداد ملنے کی ذرا سی بھی توقع ہوئی اس کو خوش کر کے اپنا کام نکالنا چاہا اور تعریف و توصیف سے اپنی طرف مائل کیا۔ جس نے مخالفت کی اس کی برائی کر دی۔

غالب کی سلامتیٔ طبع کے ثبوت ان کی تحریروں میں جابجا ملتے ہیں جو اس بات کی بین دلیل ہیں کہ غالب انگریزوں کے متعلق اچھی رائے رکھنے کے باوجود ان کے افعال پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ مولوی سراج الدین احمد کو انگریزوں کے عدل و انصاف کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ہیہات! اگر معاشِ من ہمیں پنج ہزار روپیہ
سالانہ ہم بدیں تفریق از روئے دفتر سرکار کہ
سادہ لوحاں آنرا معدلت آثار گویند ثابت
شدہ بود بایستے کہ صاحباں صدر مرا انہ ملتی
داندندے؟"[۱]

"سادہ لوحاں آنرا معدلت آثار گویند" میں کتنا گہرا طنز ہے۔ اسی طرح جب مولوی فضل حق نے رشتہ کواری عدالت سے استعفیٰ دے دیا تو اہلِ شہر کو سخت صدمہ ہوا۔ بہادر شاہ ظفر ولیعہد سلطنت تھے انہوں نے بھی بہزار شیون و بکا مولوی صاحب کو رخصت کیا۔ غالب نے یہ تمام حالات مولوی سراج الدین احمد کو ۱۱۔ جنوری ۱۸۳۲ء کو خط میں لکھے ہیں۔ انگریزوں کے متعلق لکھتے ہیں "بے تمیزی و قدر ناشناسی حکام رنگ آں ریخت"[۲]۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ غالب کا

---

[۱] کلیات نثر ص ۱۲۲
[۲] کلیات نثر ص ۱۲۱

مقدمہ حکومت کے سامنے ہے۔ ان تمام امور سے قطع نظر اگر صرف معاملہ ملازمت مدرسی دہلی کالج کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جائے کہ غالب کی خودداری کس منزل تک پہنچی ہوئی تھی۔ یہ واقعہ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بعنوان "کیا آن تان ہے" لکھا ہے۔

"۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لیفٹننٹ گورنر بھی رہے اس وقت سیکرٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دہلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپے مہینہ کا ایک مدرس عربی کا ہے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور قدیم صاحب سیکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جبکہ نہ وہ اُدھر سے آئے، نہ یہ اِدھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سیکرٹری نے جمعدار سے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے۔ میں کیونکر جاتا۔ جمعدار نے جا کر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا جب آپ دربار گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں! صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے"[1]

جیمس ٹامس جن کے ساتھ یہ معاملہ گزرا غالب کے پرانے جاننے والوں میں سے تھے۔ ان کی مدح میں قطعہ ۲۱، قصیدہ نمبر ۳۶ اور ردیف "ش" کی آخری غزل کلیات میں موجود ہے۔ پنج آہنگ میں ان کے نام تین خط ہیں جن میں غزل اور قطعہ بھی شامل ہے یہ پہلے گورنر کے سیکرٹری، پھر فارن سیکرٹری اور بعد میں یو۔پی کے لیفٹننٹ گورنر ہوئے دہلی اس زمانہ میں یو پی میں شامل تھی۔ ایسے شخص کے روبرو، مرزا غالب کی یہ جسارت، غیر معمولی

---

[1] آب حیات ص ۴۹۵

بات نہیں۔ اور بغیر ملاقات لوٹ آنا بھی ایک غیر تمدنانہ فعل ہی کہا جا سکتا ہے۔ یا خفت و برتری کے شدید احساس کا نتیجہ، ان کے بعد مومن خاں مومن کو بلایا جاتا ہے وہ بھی ملازمت کرنے سے منع کر دیتے ہیں صرف اس لئے کہ ان کو سو کی جگہ اسی روپے ماہانہ دینا چاہتے تھے[1] ظاہر ہے کہ غالب نے ملازمت عزت کی خاطر قبول نہ کی اور مومن خاں نے صرف بیس روپے کی کمی کی وجہ سے۔ دونوں کا فرق واضح ہے۔

غالب ۱۸۴۴ء میں پنشن کے معاملہ میں بالکل مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن ان کو نئے خطاب و اعزاز کی ملکہ وکٹوریہ سے امید تھی۔ یہ امید آخری دم تک رہی جو پوری نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک غالب شاہ دہلی سے وابستہ رہے اس زمانے میں بھی انگریزوں سے رسمی تعلقات رہے۔ وہ شدید باقی نہ رہی جس کا ظہور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۴ء تک ہوا۔ یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ غالب کی مدحت طرازی مطلب برآری کے لئے تھی۔ البتہ ۱۸۵۷ء کی "رستخیز بیجا" کی وجہ سے انہیں پھر انگریزوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ کیونکہ اس زمانے میں پنشن کی بندش خلعت و درباری اعزاز سے محرومی ان کے لئے معاشی بدحالی اور اعزاز کی پائمالی کا سبب تھی۔ اس لئے سب سے پہلے پنشن کے حصول کی کوشش کرنی پڑی اور اس کے بعد خلعت و اعزاز کی بحالی کے لئے تگ و دو ہوئی اور ان دونوں امور کے سلسلے میں سب سے مقدم "دستنبو" ہے۔ جس میں غالب نے غدر[2] کے واقعات لکھے ہیں۔ یہ کتاب غالب نے چھپوا کر انگریزوں کی نذر کی تھی۔ اس کتاب میں وہ اپنے آپ کو ہنگامہ پرور گروہ سے الگ ثابت کرنا چاہتے تھے تاکہ پنشن و خلعت وغیرہ بحال ہو جائے۔ ایام غدر میں تنہائی سے اکتا کر اوقات گزاری کے لئے حالات غدر، دیدہ و شنیدہ قلمبند کرنے شروع کر دیئے۔ مگر کتاب خود شاہد ہے کہ اس میں واقعات و حالات جو کچھ لکھے گئے تھے ان میں سے بعض حالات بربنائے مصلحت بعد

۱؎ کلیات نثر ص ۲۵۸

۲؎ اگرچہ آج کل "غدر" کہنا درست نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ جنگ آزادی تھی مگر جس عہد کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کے لئے ہم اس کے استعمال پر مجبور رہے۔ "جنگ آزادی" کہہ کر بعض جگہ بات نہیں بنتی۔

کو کتاب سے نکال دیئے۔ بالخصوص حالات دربار شاہ ظفر وغیرہ ۔ مگر جو کچھ لکھا ہے اس کی درستی میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ غالب کی اصلیت پسندی و حقیقت نگاری آشکارا ہے۔ انگریزوں کے بے جرم و خطا قتلِ عام پر اگر افسوس کا اظہار کیا ہے تو ہندوستان کی تباہی پر بھی خون کے آنسو بہاتے ہیں۔

"دل است، سنگ و آہن نیست، چرا نسوزد، چشم تر است، رخنہ و روزن نیست، چوں نگرید۔ آرے ہم بداغ فرماندہاں باید سوخت و ہم بہ ویرانی ہندوستان باید گریست[1] " گویا ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

انگریز مرد، عورتوں اور بچوں کے قتل کے متعلق لکھا ہے:۔

"ہمی آں جہانداران داد آموزہ دانش اندوز
نکو خوی نکو نام و آہ ازاں غنا تونان پری چہرہ
نازک اندام بار خی چوں ماہ و تنی چوں سیم خام
و دریغ آں کودکاں جہاں نا دیدہ کہ دز شگفتہ روئی
بہ لالہ و گل ہمی خندیدند و در خوش خرامی بر کبک
و تذرو آہو ہمی گرفتند کہ ہمہ یکبارگی گرداب خون
فرو رفتند[2]"

سر سید احمد خاں نے "اسباب بغاوت ہند" میں ہندوستانیوں کی ناکامی کا سبب، غیر تربیت یافتگی، جہالت، فقدان تنظیم اور عدم اتحاد قرار دیا ہے۔ سر سید احمد حکومت کے ملازم تھے۔ انھیں حالات کا زیادہ علم تھا۔ لیکن غالب نے ہندوستانیوں کے لشکر اور ان کے نظام حکومت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سر سید احمد خاں سے کہیں زیادہ وقیع ہے:۔

---

[1] کلیات نثر ص۳۸۳ [2] کلیات نثر ص۳۸۲

"این لشکرہائے بیرون از شمار جنگ جویان بے شمار راجا روب داد کمر بند یکیست آرے رفت و روب ہند بوم، بدانساں کہ آرائش و آسائش، اگر چہ بند باندازۂ پرۂ کاہی کاہی نیابند۔ ہم چنیں جاروب گیتی آشوب، ہمیں خواست اینک ہزار لشکر نگری، ہم بے لشکر آرامی آراستہ، بسا سپاہ بینی، بے سپہدار بجنگ برخاستہ"

اور ہندوستان کے شہروں کی حالت ملاحظہ فرمائیے:۔

"شہرہائے بے شہریار، پراز بندہ ہائے بے خداوند۔ چنانکہ باغہائے بے باغباں پرانہ درختان تا برہ مند۔ رہزن از گیرودار آزاد، بازرگان از تمغا خانہ ہا۔ ویرانہ ہا و کلبہ ہا خوان یغما۔ گنامان نہاں خانہ نشیں، تا خویش را آرایند، و شوخ چشمی خویش بمردم نمائند۔ پردہ۔ پردہ چوں مژہ ہا۔ خنجر ہا آختہ و نیک مرداں آسودگی گزیں۔ دمیکہ برفتار آیند تا از خانہ بہ بازار آیند، ہزار جا سپر انداختہ دزداں بلکہ در روز، سیم و زر، دلیرانہ ربایند۔ شبہا از پرنیان و دیبا بستر خواب آرایند۔ روشن گہراں را روغن نماند کہ شبانہ بکاشانہ چراغ افروزند[1]"

اس سے زیادہ اور کیا بدنظمی ہوگی۔ یہ کتاب انگریزوں کو نذر دی گئی جو بہادر شاہ ظفر کے سخت ترین دشمن تھے۔ لیکن اس میں بادشاہ کے متعلق کتنا درد انگیز بیان ہے اور اس کی بیچارگی کی کتنی بیمثال تشبیہ دی ہے:۔

شاہ را درمیاں گرفت سپاہ
ویں گرفتن بود گرفتن ماہ
ماہ نو ہیچ گہ نمی گیرد
جز مہ چاردہ نمی گیرد

---

[1] کلیات نثر صفحہ ۳۸۳

شاہ ماہ گرفتہ را ماند

نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند[۱]

بادشاہ "گہن لگا چاند" تخیل کی بلندی کا کمال ہے اور اس کی بے بسی اور مجبوری کی کتنی عجیب و لطیف مثال ہے۔ بادشاہ اور شہزادگان کے حالات فتح دہلی کے بعد لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس لئے بات کو اس طرح ٹال جاتے ہیں:۔

"این کہ فرجام کار بادشاہ و بادشاہزادگان کہ بود کہ و داستان کشائش شہر بالیستے نخست نہ نگاشتہ ام۔ لاو اینست کہ مرا اندریں نامہ شنیدن سرمایۂ گفتار و ہنوز سخن ہائے ناشنیدہ بسیار است[۲]"

لیکن ایک موقع پہ بادشاہ و شاہزادگان کے متعلق افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"از شاہزادگان بہرہ دل ازیں تیرہ دلان سرو دکہ اندے را اثرہائے مرگ بدہان زخم گولۂ تفنگ فرو برد۔ و چندے را در جسم بند چاقو (چاقوئی) بخناکش رسن روان و در تن افسردہ و افسردۂ چند از اں میان زندان فشیں اند۔ و شمردۂ چند از اں دودمان آوارۂ روئے زمین۔ بر بادشاہ ارک (قلعہ) آرامگاہ کہ ماتم زدۂ تاب و توان ماست، فرمان گیرودار بانداز بازپرس رواں ہست[۳]"

آخر کار دستنبو کی تحریر یکم اگست ۱۸۵۸ء کو ختم کر دی۔ خاتمہ پہ لکھتے ہیں:۔

"کہن پنسن اگر بدست آید نیز زنگ از آئینہ نمی زداید .... کاش دربارۂ آں خواہش ہائے سہ گانہ، ہمانا مہر خواں (خطاب) و دستار ہائے (خلعت) و ماہیانہ (پنشن)، چنانکہ ہم دریں نگارش از اں گزارش آگہی دادہ ام و اینک چشم نگراں بداں دوختہ و دل بر امید بداں نہادہ ام[۴]"

گویا دستنبو کو بھی خطاب، خلعت اور پنشن کی بحالی کا ذریعہ بنایا ہے۔ اردو خطوط میں بھی

۱۔ کلیات نثر ص ۳۸۵ ۲۔ کلیات نثر ص ۳۹۸

۳۔ ایضاً ص ۴۰۱ ۴۔ ایضاً ص ۴۱۰

دہلی اور اہلِ دہلی کی بربادی پر دردناک بیانات موجود ہیں۔ سب سے پہلے قطعۂ غدر یہ ملاحظہ فرمائیے۔
یہ علاؤ الدین خاں علائی کو اسی زمانہ میں تحریر کیا تھا:

بسکہ فعالِ ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلمان کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا[1]

انگریز سپاہیوں کی مطلق العنانی، مسلمانوں کا قتلِ عام ان کی تباہی حالات، مجبوری بے بسی

---

[1] خطوطِ غالب ص۵۳

اس سے زیادہ کیا بیان ہو سکتی تھی۔ اب دیکھئے انگریزوں کے ترحم کی مثال بے مثال غالب ہی کا قلم لکھ سکتا ہے:۔

"ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپے مہینا پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط، بطریق ترحم دس دس روپے مہینا تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا! میں خود موجود ہوں، حکام صدر کا روشناس ... ... سکتا ہے"[1]

یہ داستان دراز سے دراز تر ہوتی جا رہی ہے۔ غالب نے غدر کے حالات بہت زیادہ لکھے ہیں۔ صرف دو واقعے اور ملاحظہ فرمایئے

غدر کے بعد دہلی کی عمارات بھی انگریزوں کی تباہی و بربادی کا نشانہ بنیں بہت سی عالیشان عمارتیں برباد ہوئیں۔ مسجدیں مسمار کی گئیں۔ امام باڑے ڈھائے گئے۔ مولوی محمد باقر کا امام باڑہ ڈھایا گیا تو غالب کو بہت دکھ ہوا[2]۔ شہر کی بربادی مسجدوں کی مسماری میں انگریزوں کی حرکتیں ملاحظہ فرمایئے:۔

"بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھایا گیا۔ قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹایا گیا۔ کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی، سرکٹ کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں۔ اور ہندو کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر دروازہ میں تن بندرہ پیدا ہوا ہے مکانات و اسباب ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام گنرمی کہتے ہیں۔ انھیں ہلا ہلا کر ایک ایک بنیاد ڈھا دی، اینٹ سے اینٹ بجا دی، واہ رے بندر، یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر"[3]

---

[1] خطوط غالب ص ۳۹۸ [2] خطوط غالب ص ۳۹۹ [3] خطوط غالب ص ۴۹

انگریز کو بندر کہنا کتنی بے مثال تشبیہ ہے۔ میرے لڑکپن تک انگریزوں کے لئے یہ لفظ بچوں اور لڑکوں کی زبان پر تھا۔ مگر غالب نے اس سے جو فائدہ اٹھایا ہے اور جس موقع پر استعمال کیا ہے وہ بلاغت کی انتہا ہے۔ بندر کی فطرت کو سامنے رکھئے اور اس انگریز کی حرکت کو دیکھئے اور تشبیہہ کا لطف اٹھائیے۔ اسی طرح انگریز حکام کی جہالت کا خاکہ کتنے پر لطف انداز میں اڑایا ہے۔ ہندوستان میں عرف کی وبا عام ہے۔ نام اور عرف کو انگریز نہ ایک جانتے ہیں۔ نہ مانتے ہیں:-

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو! حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے ہیں۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہوئے مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں! پھر پوچھا حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ میں! اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممو ممو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی میاں ممو اپنے گھر چلے آئے"[1]

ان واقعات میں انگریزوں کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کم نہیں ہے۔ اب انگریزی فوج کے متعلق بھی سن ہی لیجئے۔ غالب باغیوں کی طرح انگریزی فوج کو بھی اچھا خیال نہیں کرتے تھے:-

" ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا۔ ایک فتنہ انہدام مکانات کا ایک آفت وبا کی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے"[2]

کتنے لشکروں کا دہلی پر حملہ ہوا۔ اور انگریزی فوج نے کیا کیا لوٹا۔ اس کی تفصیل غالب

---

[1] خطوط غالب ص ۲۹۶ [2] خطوط غالب ص ۳۰۲

ہی سے سنیئے:۔

"پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پہ ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر۔ اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں[1] کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضے کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔"[2]

انگریزوں نے دہلی میں جو تباہی مچائی تھی اس کو کتنے مختصر اور جامع لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ تفسیر کی جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ غالب کا مسلمانوں کی زبوں حالی پر افسوس ایک فطری امر تھا۔ خطوط میں جابجا اس کا اظہار پایا جاتا ہے۔ مسجدوں کے انہدام اور ہندوؤں کے مکانات کی شان و شوکت کا مقابلہ جس دردناک انداز میں کیا ہے وہ پہلے گزر چکا۔ مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں لکھا ہے کہ مرزا کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے۔"[3] ان کے کلام میں اس موضوع پر بھی بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ جب پنجاب میں سکھوں کا زور تھا تو مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ شمالی ہند میں سکھوں کے خلاف کافی غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مولانا سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے انہی کے خلاف جہاد کیا تھا۔ مومن نے شرکت جہاد کی تمنا کی تھی۔ غالب نے بھی اپنی حسرت کا اظہار ہارڈنگ کے قصیدہ میں جو فتح پنجاب کی خوشی میں لکھا ہے اس طرح کیا ہے۔

گزاف شیوۂ من نیست راست میگویم — دریں زمانہ مرا بودے اندماں شباب
پے شکستن کفار بستمے بہ نبرد — کمر بہ سرخوشیٔ نیت حصول ثواب[4]

۱۔ انگریزی فوج، خاکی وردی کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے۔ دیگر خطوں میں بھی خاکی بمعنی انگریزی سپاہی لکھا ہے۔ ۲۔ خطوط غالب صفحہ ۳۵۹ ۳۔ یادگار غالب صفحہ ۹۵ ۴۔ کلیات نظم صفحہ ۲۷۴

اسی طرح ایک غزل میں کتنے اچھے انداز میں بارگاہ رب العزت شکوہ پیش کیا ہے

نہ کوئی چارہ لب خشک مسلمانے را

اسے بتر سا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل[1]

غرض غالب نے غدر، محرکات غدر، نتائج غدر کے بیان میں سلامتی طبع کا ثبوت دیا ہے۔ انگریزوں کے موافق و مخالف تاثرات کا اظہار گزر چکا ہے۔ اب پنشن اور دربار کے متعلق مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ انگریزی پنشن مئی ۱۸۵۷ء سے بند ہوگئی تھی۔ اور مئی ۱۸۶۰ء میں بحالی ہوئی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد طریقہ سے کوشش کی۔ ان کے احباب اور قدر دانوں نے بھی حتی الامکان سعی و سفارش کی۔ دوسروں کی سعی و سفارش منظر عام پر نہیں آسکی، لیکن بمقتضائے ہمدردی اس سے انکار کی بھی گنجائش نہیں کہ دوسروں نے درپردہ اس بارے میں ضرور مدد دی ہوگی۔ غالب اس کو "عطیہ ید الٰہی" قرار دیتے ہیں:

"میرا دار و گیر سے بچنا، کرامت اسد اللہی ہے۔ ان پیسوں (پنشن) کا ہاتھ آنا عطیہ ید الٰہی ہے[2]"

اور یوسف مرزا سے جب خواجہ جان نے کہا کہ پنشن کی بحالی میں والئی رامپور نواب یوسف علی خاں ناظم کا ہاتھ ہے تو انہیں جواب دیا:۔

"خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے۔ والئی رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خداساز کا ہے۔ یہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا ہے[3]"

یہی حال خلعت و دربار کا ہے۔ مرزا صاحب کو دربار میں داہنی طرف دسویں نمبر پر کرسی ملتی تھی خلعت پارچہ و سہ رقوم جواہر خلعت میں ملتے تھے۔ غدر کے زمانہ میں اس کی بھی توقع نہ رہی۔ ۱۸۶۳ء میں سر رابرٹ منٹگمری نے دربار کیا، مرزا صاحب کو بلایا نہ گیا تھا۔ لیکن ۳ مارچ کو گورنر نے یاد کیا اور خلعت عطا کیا۔ دربار کا مژدہ سنایا کہ انبالہ جاؤ وہاں دربار ہوگا اور خلعت پاؤ غالب نے اس کی اطلاع قریب قریب سب ملنے والوں کو دی۔ مگر بعض حضرات اس کو درست

۱۔ کلیات نظم ص ۴۵۱ ۲۔ خطوط غالب ص ۳۸۹

۳۔ " " ص ۴۰۸

نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ غالب نے خلعت ملنے کی خبر اپنی کسی مصلحت سے اڑادی ہو۔ ان حضرات کی یہ رائے اس لئے تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ غالب نے جن حضرات کو اطلاع دی ہے سب کو لکھا ہے کہ لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے اپنی طرف سے خلعت دیا۔ اس خبر کو انہوں نے اخبارات میں بھی شائع کرانے کی کوشش کی ہے خط بنام منشی نولکشور میں بھی عطائے خلعت کا ذکر موجود ہے۔ یہ خط اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ شیو نرائن کو بھی خط لکھا ہے۔ ان کا بھی اخبار نکلا کرتا تھا۔ قیاس ہے کہ اس میں بھی یہ خبر شائع ہوئی ہو گی۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور، منشی غلام غوث خاں بے خبر میر منشی لیفٹننٹ گورنر یو پی کو بھی لکھا ہے۔ ایسے حضرات کو غلط خبر دینی کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اخبار میں اشاعت مفید ہی نہیں بلکہ مضر ثابت ہو سکتی تھی۔ غالب ایسی غلطی کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں کو جو خط دربار اور خلعت کے سلسلے میں لکھا ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ لیفٹنٹ گورنر نے دہلی میں ایک دربار تالیف قلوب کی خاطر کیا تھا۔ جس میں صاحبان فن و کمال کو شرکت کا اعزاز بخشا گیا تھا۔ یہ عام درباروں سے جداگانہ نوعیت کا دربار تھا۔ لیفٹننٹ گورنر نے اردو میں تقریر کی تھی۔ اس میں خلعت صرف غالب ہی کو دیا گیا تھا اور کسی کو نہیں۔ جس کا اظہار روئداد دربار میں بھی ہے اور لیفٹنٹ گورنر نے بھی اپنی تقریر میں اردو کی تعریف کرتے ہوئے اس طرح کیا ہے "اس کی شہادت آپ کے مشہور شاعر مرزا نوشہ کے کلام سے جن کو خلعت دیا گیا ہے ظاہر ہے"۔ کیونکہ معمول کے مطابق دربار نہ تھا اس لئے اس میں خلعت ملنے کی توقع بے محل تھی۔ اس لئے غالب نے یہ صحیح لکھا ہے "نہ مجھے احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر اور شہر کو علم"۔ اور غالب کے اس لکھنے کو "بعد غدر اگرچہ پنشن اور دربار بحال رہا لیکن خلعت موقوف ہو گیا"۔ سہو پر محمول کرنا چاہیئے۔

غالب کے انگریز حکام کے علاوہ دوسروں سے بھی مراسم تھے جن میں جان جاکوب، اور الیگزینڈر ہیڈرلے کا نام سرفہرست ہے۔ انگریزوں کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں وہ

"اہ! انگریز قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان میں سے کوئی میرا امید گاہ

تھا اور کوئی میرا شفیق۔ اور کوئی میرا دوست
اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد"[1]

میجر جان جاکوب سے بہت دیرینہ مراسم تھے۔ یہ فارسی کا بڑا اچھا مذاق رکھتا تھا۔ دیوان حافظ کو مرتب کرکے چھپوایا تھا۔ غالب سے دیباچہ لکھوانا چاہا۔ لیکن غالب نے تقریظ لکھ دی[2] جو کلیات نثر میں موجود ہے۔[3] خط و کتابت بھی تھی[4] مکان اور کنوئیں کی تاریخیں بھی کہیں۔ جو کلیات نظم میں شامل ہیں قطعہ نمبر ۲۲ میں اس کا زائچہ بھی نظم کیا ہے۔ یہ غدر میں مارا گیا تھا۔ حاتم علی مہر لکھتے ہیں

"ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مارا گیا۔ سچ
ہے۔ اس کا شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مانع
آتا۔ اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت
دلواتا۔ یہ بھی انہیں میں سے ہے۔ جن کا میں
ماتمی ہوں"[5]

اور منشی تفتہ کو تقریظ دیوان حافظ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"جو تقریظ دیوان حافظ کی بموجب فرمائش میجر جان
جاکوب بہادر کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ
فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح
آئی ہے۔ اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی
مطالب ہیں"[6]

الگزینڈر ہیدرلے ایک فرانسیسی خاندان کا فرد تھا۔ اس کے باپ نے کسی ہندوستانی عورت سے شادی کرلی تھی۔ اردو کا بڑا اچھا شاعر تھا۔ ابتدا میں زین العابدین خاں عارف سے

---

[1] غالب از مہر صفحہ ۲۶۷ [2] کلیات نثر صفحہ ۱۶۱ [3] کلیات نثر صفحہ ۵ [4] کلیات نثر از صفحہ ۱۶۱ تا صفحہ ۱۶۵ [5] خطوط غالب صفحہ ۲۱۰ [6] خطوط غالب صفحہ ۱۳۰

بھی منذکور ہے۔ مگر غالب کے کسی خط سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اپریل ۱۸۶۰ء میں یوسف مرزا کو لکھا ہے:۔

"الگزینڈر ہیدرلے صاحب میرے دوست کے
فرزند ہیں اور نیک بخت و سعادت مند ہیں۔۔
.... دو مقدموں میں میں نے انہیں
خط لکھے۔ مگر انہوں نے ایک کا بھی جواب نہیں
دیا اور ان مقدموں میں سفارش بھی نہیں کی"[1]

پھر ۹ مئی ۱۸۶۰ء کو انہی کو لکھا:۔

"تامس ہیدرلے صاحب سے میری ملاقات
نہیں ہے۔ ہاں الک صاحب سے ہے۔ سو
ان کے نام کا خط لکھا ہوا تم کو بھیجتا ہوں"[2]

میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"الگزنڈر ہدرلے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا
ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط
لکھتا رہتا"[3]

پھر انہی کو اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"الگزنڈر ہدرلے مشتہر بہ الک صاحب مرگیا
واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور
راغب میں اور مجھ میں متوسط تھا"[4]

ان بیانات میں شاگردی کا ذکر کہیں نہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ عارف کے انتقال کے

۱؎ خطوط غالب ص۲۸۲ ۔ ۳؎ خطوط غالب ص۴۹۳

۲؎ " " ص۲۸۳ ۔ ۴؎ " " ص۲۹۸

بعد اس نے غالب سے ضرور اصلاح لی ہوگی تامسن ہدرلے نے بھی اپنے دیباچہ میں اس کا اعتراف نہیں کیا۔ البتہ منشی شوکت علی صاحب کے دیباچہ میں غالب کی شاگردی کا ذکر موجود ہے۔[1]

اب تک غالب کے انگریزوں سے روابط بیان کئے گئے۔ میجر جان جاکوب اور الگزینڈر ہلاسے کے علاوہ اوروں سے تعلق تمام تر پنشن، خلعت اور دربار کے سلسلہ میں رہا۔ حصول عظمت و برتری کی خاطر غالب ان روابط کے لئے مجبور رہتے۔ اگر غالب نے انگریزوں کی مدح سرائی کی ہے تو ان کی برائی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے لیکن ان روابط نے غالب کو فائدہ بھی پہنچایا ہے۔ غالب طبعاً جدت پسند تھے۔ شاہراہ عام سے الگ چلنا بھی ان کی فطرت میں تھا طبع معنی یاب و فکر دور رس پائی تھی۔ پنشن کے قضیہ میں انہیں مالی فائدہ تو نہیں پہنچا۔ مگر فکر و نظر کے لئے اسباب افادیت فراہم ہوتے رہے۔ دہلی سے کلکتہ کو چلے۔ راستہ میں تجربات حاصل ہوئے۔ یہ احساس برتری ہی تھا کہ لکھنؤ میں معتمد الدولہ آغا میر سے صرف اس لئے نہ ملے کہ اس نے غالب کی دو شرطیں منظور نہ کیں۔ اول یہ کہ نائب السلطنت غالب کی تعظیم دیں، دوسرے نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے[2]۔ باندہ، بنارس، مرشد آباد، کانپور میں بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ بنارس بہت پسند آیا اس کے متعلق مثنوی "چراغ دیر" ایک عمدہ مثنوی ہے۔ کلکتہ پہنچے وہاں کی ادبی ہنگامہ آرائی نے غالب کو مقلد محض نہ بننے میں بڑی تقویت پہنچائی۔ اس بحث میں بھی احساس برتری اور شعور کمتری کی آویزش کو بڑا دخل ہے۔ ایرانیوں کی تعریف نے دل کے حوصلے بڑھائے۔ مرزا کوچک ایک ایرانی فاضل نے بھری محفل میں غالب کے متعلق کہہ دیا کہ آج اس درجہ کا شاعر سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں[3]۔ غالب کی صلح جوئی بھی "باد مخالف" کے روپ میں ڈھلی۔

کلکتہ دارالحکومت تھا۔ پنشن کے مقدمہ میں جہاں ان کو ٹھہرنا پڑا اس قیام کا اثر ان پر بہت اچھا ثابت ہوا۔ انگریزی ایجادات سے وہ شعوری اور لاشعوری طور پر متاثر ہوئے اور انہیں ایک آنے والے دور کا شدید احساس ہوا۔ ان کے طبعی میلان اس دور آئندہ سے مناسبت

۱؎ مقالات ماجد ص۱۰ ۲؎ یادگار غالب ص۳۷

۳؎ غالب از مہر حاشیہ ص۱۲۶

رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے اس کے آثار دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ایسے آثار قائم کئے اور ایسے نقوش چھوڑے کہ ان کے بعد والوں نے انہی کو نشانِ راہ بنایا اور ایک منزلِ ارتقا کی طرف قافلہ بڑھایا۔ اس دورِ آئندہ کے نشانات ان کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں مثلاً:-

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

"مژدۂ صبح" سے مراد دورِ آئندہ اور "تیرہ شباں" سے مراد دورِ پستی و بربادی ہو تو کیا تعجب ہے اور مصرعِ ثانی ترقی کی نشان دہی کے لئے اشارہ ہو تو کیا بعید ہے۔ مگر یہاں تاریخی شعور سے کام لیا جائے تو بات بنتی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت خوب لوٹی، مگر ایک نیا ذہن اور جدید شعور انہی کی بدولت حاصل ہوا۔ غالب کے معاصرین کا کلام دیکھئے وہ اپنے مفروضہ تنگ اور محدود دائرے سے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے۔ مگر غالب طرح طرح سے دورِ جدید کی طرف اشارہ کرتے ہیں ایک غزل ہے جس کی ردیف "محتسب" ہے پوری غزل ایک پیامِ بیداری ہے تشبیہ و استعارہ کے پیرائے میں بہت کچھ کہہ دیا ہے پوری غزل پڑھئے اور سوچئے کہ غالب نے کیسے عالم میں بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص یہ شعر:-

سحر دمیدہ و گل در دمید نیست، محتسب
جہاں جہاں گل نظارہ چید نیست محتسب
تو محوِ خواب و سحر در تلاش از انجم
بہ پشت دست بدنداں گزید نیست محتسب
نشانِ زندگی دل، درد و ید نیست مایست
جلائے آئینۂ چشم دید نیست، محتسب

اور بہت سی غزلوں میں یہی احساس کارفرما ہے۔ چند شعر اور ملاحظہ فرمائیے:-

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم

در بزم رنگ و بو نمطے دیگر افگنم
تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم
بخت در خوابست، میخواہم کہ بیدارش کنم[1]
پارۂ غوغائے محشر کہ در کارش کنم
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم!
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

اور اردو میں مشہور قطعہ:-

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار گر تمہیں ہوس ناؤ نوش ہے

میں جو کیفیت ہے اس کو "دیدۂ عبرت نگاہ" اور "گوش حقیقت نیوش" ہی کی ضرورت ہے کیونکہ اس کا سرچشمہ "نوائے سروش" ہے گویا دم توڑتی ہوئی مغلیہ تہذیب کی تصویر ان کے علاوہ غالب کی پیش بینی اور نئے دور کی طرف کھلے اشارے، آئین اکبری کی تقریظ[2] میں ملتے ہیں جو سر سید احمد خاں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اس مثنوی میں انہوں نے سر سید احمد خاں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پرانے آئین و روش کو چھوڑ کر نئے آئین و ایجادات کی طرف متوجہ ہوں۔ دیکھیں کہ انگریزوں نے دخانی کشتی، ریل، موٹر، ٹیلیگرام، ٹیلیفون، گراموفون، گیس کی روشنی، دیا سلائی وغیرہ، ایجاد کی ہیں۔ اگرچہ سر سید احمد خاں نے اس وقت اس مثنوی کو قبول نہ کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ غالب نے یہ بات اپنی روشن طبعی اور بالغ نظری کی وجہ سے بہت پہلے محسوس کر کے لکھ دی تھی۔ غالب کی نگاہ دور بیں، اس قدیم دور اور تہذیب کو ختم ہوتے دیکھ رہی تھی، اسے ایک نئے دور کی آمد کا شدید احساس تھا۔ اس سے دور جدید کی طرف رخ بدلنے کا عمل بین طور پر دکھائی دیتا ہے

---

[1] غدر کے بعد بیداری ظاہر ہے، غالب کی پیش بینی قابل داد ہے
[2] مثنوی کلیات نظم ص۱۰۴ اس سلسلہ میں میرا مضمون "غالب اور سر سید" مطبوعہ ماہ نو شمارہ بابت فروری ۱۹۶۱ء بھی دیکھیے

جس کی روح، عقل، عمل اور تجسس ہے۔ بنابریں ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید احمد خاں کو غالب کے بتلائے ہوئے راستہ کو اختیار کرنا ہے۔

غالب نے صرف انگریزوں کی ایجادات اور آئین ہی کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ انگریزی زبان کے الفاظ کو بھی بکثرت استعمال کیا ہے جو ان کے معاصرین کے ہاں اس کثرت سے نہیں پائے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن حالات سے انہیں دو چار ہونا پڑا ان کے ہمعصر ان حالات سے بہت دور تھے۔ پنشن کے قضیہ اور مقدمہ، بندش اور بحالی خلعت و دربار کے معاملہ میں انہیں بعض انگریزی لفظوں سے واسطہ پڑا اور انہیں بے تکلف اپنی اردو اور فارسی تحریروں میں استعمال کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:[۱]

> "چاپی، کہ پائے فارسی اور یائے حطی ہے۔ کاپی اور راپی اور پاپی یہ قافیہ ہمدگر ہو سکتے ہیں۔ چاپی، لغت انگریزی ہے۔ اس زمانے میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے بلکہ مزا دیتا ہے۔ تار بجلی اور دخانی جہاز کے مضامین میں نے اپنے یاروں کو دیئے ہیں۔ اوروں نے بھی باندھے ہیں، رہ لکاری اور طلبی اور فوجداری اور سررشتہ داری، خود یہ الفاظ میں نے باندھے ہیں۔ چابی بہ معنی کلید شوق سے لکھو نہ چابھی"

الفاظ و اصطلاحات کے علاوہ بہت سے لفظوں کا ترجمہ بھی کیا ہے، مثلاً ماچس کو انگریزی دیا سلائی، فوٹو کو آئینہ کی تصویر، عکس کی تصویر، مارشل لا کو جرنیلی بندوبست، گورنر جنرل کو حاکم اکبر لکھا ہے۔ دیکھئے: صاحب، میم اور بابا کو کیسے عمدہ طور سے میاں بیوی اور بچوں کے لئے استعمال کرتے ہیں "پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے"[۲] یہی نہیں بلکہ چک، نوٹ، رپورٹ کو نظم بھی کیا ہے:

۱۔ خطوط غالب ص ۵۴۸ ۲۔ خطوط غالب ص ۸۱

آرے نہ چک بود نہ تمسک نہ ہرکہ ہست
نہ دستخط، نہ مہر نہ نام ونشان اوست
مضمون شعر نوٹ بود فی زمانا
یعنی بدست ہر کہ بیفتاد آن اوست[۱]

غالب کے نزدیک ولایتی یعنی انگریز اردو کو کما حقہ، نہیں سمجھ سکتے تھے، میر حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں :۔

" آپ ولائتی بھی نہیں جو میں تصور کروں کہ اردو عبارت سے استنباط مطلب اچھی طرح نہ کر سکے"[۲]

انگریز اردو سے نابلد ہونے کی وجہ سے غلط اردو بولتے تھے۔ اس کے متعلق بھی اشارے کئے ہیں مثلاً " اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو"[۳] یا ایک اور جگہ لکھتے ہیں " فریاد مؤنث۔ فریاد کرلینی، چاہیئے۔ فریاد کر دینا انگریزی بولی ہے"[۴]۔ غالب اس فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آج ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اردو کو انگریزی محاورہ سے بچایا جائے۔ انگریزی کے رواج کے متعلق لکھتے ہیں " گل بمعنی پھانسی انگریزی لغت ہے۔ انگریزی زبان نے بنگالے میں سو برس اور دلی، اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے"[۵]

غالب کی تحریروں میں بعض انگریزی لفظوں کا تلفظ بدلا ہوا ہے مثلاً لارڈ کو لاڑد اور لاٹ لکھتے ہیں۔ پنشن کو پنسن، بریگیڈیر کو برگڈیر، سارٹی فیکیٹ کو سارٹی فکٹ اسٹیشن کو اسٹین، کیمپ کو کمپ اور کنپ، نمبر کو لمبر لکھا ہے۔ مرزا جواں بخت کے سہرے میں لمبر ہی نظم کیا ہے :

پسر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پراے طرف کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا[۶]

۱؎ کلیات نظم ص ۱۴۳ ۲؎ خطوط غالب ص ۵۷۰ ۳؎ خطوط غالب ص ۳۹۶ ۴؎ خطوط غالب ص ۲۷۵
۵؎ رشک لکھنوی نے نظم کیا ہے " گگے لگے بت فرنگی کے ۔ واجب القتل ہیں تو گل دے گا
۶؎ خطوط غالب ۔ ص ۵۵۵

اسی طرح ٹکٹ کو کئی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ٹکٹ = اسٹامپ، ٹکٹ = اجازت نامہ (پرمٹ) ٹکٹ = ملاقاتی کارڈ، انگریزی الفاظ کی ایک فہرست آخر میں شامل کی جارہی ہے۔

غالب کی اردو نثر میں خطوط قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی طرزِ تحریر کے متعلق اکثر حضرات کا یہ کہنا ہے کہ یہ انگریزی طرز سے تاثر کا نتیجہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"خط و کتابت میں قدیم اسلوب القاب و تخاطب سے کلی احتراز اور محض کسی ایک نام و لقب سے یاد کر کے براہ راست حرفِ مطلب پر آجانا، جو اس عہد میں ایک غیر معمولی بات تھی، یقیناً انگریزی اسلوب کے تاثر سے سامنے آئی ہے[1]"

مولانا ابوالکلام آزاد کے بیان میں ہمیں اس لئے تامل ہے کہ غالب نے پنج آہنگ کا دیباچہ اور آہنگ اول ۱۸۲۵ء میں ارتجالاً تین روز میں مرتب کر دیا تھا[2]۔ اس میں لکھتے ہیں:

"ادا شناس جانتا ہے کہ نگارش میں میری روش
یہ ہے کہ جب کاغذ و قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو
مکتوب الیہ کو اس کے مرتبے کے لائق لفظ سے
خطاب کرتا ہوں اور مدعا بیان کرنے لگتا ہوں
القاب، آداب، خیریت گوئی اور عافیت جوئی
حشو و زائد ہی ہے[3]"

دیباچہ ہی میں مکتوب نگار کو ہدایات فرمائی ہیں۔ جن میں ... کو ترک کرنے اور اختیار کرنے کے متعلق لکھا ہے۔ ابتدا میں لکھتے ہیں:

"نامہ نگار کو چاہیئے کہ نگارش کو گزارش سے
الگ نہ کرے۔ تحریر کو تقریر کا رنگ دے

---

[1] غالب از مہر ص۱۱۳ [2] کلیات نثر ص۵ [3] کلیات نثر ص۵ (ترجمہ)

مطلب کو اس طرح ادا کرے کہ اس کا سمجھنا
دشوار نہ ہو۔"

غرض غالب کے دیباچہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ یہ اسلوب ان کا اپنا ایجاد کردہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزوں سے ان کے مراسم نہ تھے۔ کلکتہ کی سیر تو درکنار، سفرِ کلکتہ کا خیال بھی نہ تھا۔ مولانا آزاد نے قیاس سے کام لیا ہے۔ تحقیقی بات نہیں ہے مگر پنڈت دتاتریہ کیفی نے آج کل دہلی بابت ستمبر ١٩٥٢ء میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں غالب کی طرزِ خطوط نویسی کو غالب کی ایجاد تسلیم نہیں کیا بلکہ منشی رام چندر کے ایک مضمون مطبوعہ رسالہ محبِ ہند جلد ٢٩ بابت دسمبر ١٨٤٩ء و جنوری ١٨٥٠ء سے اثر پذیری کا نتیجہ اور کامیاب تقلید کا نمونہ قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق پھر کبھی سیر حاصل بحث کی جائے گی۔ بہر دست یہی کافی ہے کہ ١٨٤٥ء کی تحریر کی موجودگی میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ منشی رام چندر کا مضمون غالب سے استفادہ کا نتیجہ ہے۔

المختصر یہ امور مذکورہ ہمارے نزدیک روابطِ فرنگ ہیں جن کا تعلق تمام تر خاندانی اعزازات کی برقراری ہی سے نہیں بلکہ غالب کی معیشت سے بھی گہرا ربط ہے اور ان دونوں نے نفسیاتی طور پر ان کو متاثر کیا تھا۔ البتہ جدید آئین اور ایجادات سے دلچسپی ان کی ترقی پذیر طبیعت اور جدت پسند فطرت سے مناسبت کے باعث ہے وہ "خُذ ما صفا دع ما کدر" کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ انھوں نے "مئے فرنگ" میں نفاست، لذت، بو، رنگ بہتر پایا اس کے فریفتہ ہو گئے۔ اولڈ ٹام۔ فرنچ، شام پین، کاس ٹین وغیرہ سے رغبت ہو گئی اور "شراب قندئ ہند" سے ہمیشہ نفرت رہی بلکہ اس کے مقابلے میں شراب کشمیری کو بہتر خیال کرتے تھے۔[1]

غالب شراب قندئ ہندم کباب کرد
زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشید کرد

---

[1] کلیات نظم ص١٢١

شراب قندئ ہندوستاں دماغم سوخت
ز میوہ خانۂ کشمیرم آورند شراب

ان دو بھدے سلسلے میں بات پھر اسی مرکز پر آجاتی ہے کہ غالب کی زندگی کے حالات زمانہ کی تاریخی رو سے متصادم ہوئے اور غالب کو کبھی کبھی اپنے بلند معیار سے نیچے اتر کر باتیں کرنی پڑیں۔ نہ صرف انگریزوں کی مدح سرائی بلکہ مسلمان اور ہندو زعما اور حکمرانوں کی شان میں قصیدہ خوانی بھی اسی منزل سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ خود کہتے ہیں۔

لیک نا ید ز من کہ در گفتار
مدحت لالہ سورداس کنم

جاہ و دولت و حکومت کی مدحت سرائی اور قصیدہ خوانی میں جو وقت برباد ہوا اور جو قوت بیان ضائع ہوئی ان کا احساس برتری اس پر آخر عمر تک افسوس کرتا رہا۔ کلیات میں اپنی زندگی کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"در ہوائے کہ ہال بالا خوانی زدہ ام و درا دائیکہ
خود را لشگرفی ستودہ ام۔ ہمیہ ازاں شاہد بازیست
یعنی ہما پرستی و شیدہ دگیر تو انگر ستا نجست بیہ
باد خوانی۔۔۔ شادم از آزادی کہ لب اسخن
بہنجار عشق بازاں گزاردستم، و داغم از آزمندی
کہ ورقی چند بکردار دنیا طلباں، در مدح اہل جاہ
سیہ کردستم[1]"

اب میں غالب کے برتے ہوئے انگریزی الفاظ کی فہرست پیش کرتا ہوں۔

ٹکٹ گورنمنٹ . گورمنٹ پنشن کمشنری ڈاکٹر کیمپ . کلب اگریمنٹ
کلکٹری انکم ٹیکس پارسل ٹین ڈپٹی کمیٹی ریل

---

[1] کلیات نثر ص۵۲ و کلیات نظم ص۸

رپورٹ　ایجنٹ۔ اجنٹ　پوسٹ پیڈ　ڈپٹی کمشنر　ڈاکخانہ پوسٹ پیڈ ۔ جرنیلی بندوبست

بنک　رجسٹری　حاکم اکبر۔ گورنر جنرل　پاکٹ　لفٹننٹ گورنر　پمفلٹ پاکٹ

بابو　کاپی　فلورنس (کاغذ کا نام)　ممبر۔ میمبر　پریسیڈنٹ ۔ پریسیڈنٹ

لنڈن　انگلینڈ　کمانڈر انچیف　پوسٹ ماسٹر　اسٹامپ ۔　پرمٹ

کمشنر　کورٹ　تار برقی (ٹیلیگرام)　فینانشل کمشنر　نوٹ　چک

سیشن جج　اکسٹرا اسسٹنٹ　ٹیکس　اسپتال　گگ (چھلنی)　کاموشمپین (شراب)

اولڈٹام (شراب)　کونسل پوئنٹ　برگڈیئر۔ بریگیڈیئر　جنرل　انڈیا گورنمنٹ　بارک

مس　مسٹر　ٹکٹ (اجازت نامہ)　دخانی جہاز　انگریزی دیا سلائی　کونسل (باہمی مشورہ)

کونسل　فیرہ　فرونٹیج (شراب)　شام پین　پولیس　سیکرٹری

اسٹامپ پیپر　ڈبل کٹ　کوٹ　لارڈ۔ لارڈ۔ لاٹ　سکہ ممبرز (بزمرہ جواہر)　سرٹیفکیٹ سارٹی فکٹ

سکرترہ۔ سکرٹرہ　ٹیکوہ　ٹکٹ (ملاقاتی کارڈ)　ڈپٹی کلکٹر　کمپنی　اپیل

بانگلس　پوسٹ ٹکٹ چھپہ　پیڈ (کٹنت چپیاں)　اسٹیشن ۔　کورٹ آف وارڈس　ریوینیو بورڈ

ڈیپیزمنٹ۔ ریزیڈنٹ　ریسیڈنسی ۔ ریزیڈنسی ۔ ایجنسی ۔ اجنسی ۔ ڈگری　مجسٹریٹ ۔ اسسٹنٹ سکرٹر

چیف سکریٹر۔ عکس کی تصویر، آئینہ کی تصویر ۔ بڑا پوسٹ ماسٹر　گورنر جنرل　گورنر　کرنل

میجر　اسٹامپ کے ٹکڑے　ڈبہ　بھاپ و بخار۔ ٹنگان دار　میگزین (بارود خانہ)

طشتِ گل

(نظم و غزل)

ارشد ملتانی
اعجاز اکرم
جابر علی جابر
ریاض انور
شفقت کاظمی
صادق مصور
عاصی کرنالی
عرش صدیقی
فرخ درانی
کشفی ملتانی
کیفی جامپوری
محمد علی بخاری
ندیم جعفری

ارشد ملتانی

○

اب ختم ہے فسانۂ شب جاگتے رہو
اے وارثانِ صبحِ طرب جاگتے رہو

چمکے گی پھر ضرور سحر کیف و نور کی
وارفتگانِ بنتِ عنب جاگتے رہو

غم ہائے روزگار کے خاشاک کے لئے
آتش بجان و شعلہ بلب جاگتے رہو

چھوٹے نہ ہاتھ سے کبھی دامن امید کا
لائے گا رنگ حسنِ طلب جاگتے رہو

راہوں پہ منحصر نہیں خطرے حیات کے
آسودگانِ منزلِ شب جاگتے رہو

بیداریٔ حیات کے پیغامبر ہو تم
صورت گرانِ شعر و ادب جاگتے رہو

کٹ جائے گی یہ رات بھی ارشد کسی طرح
مینا بدست و جام بلب جاگتے رہو

سودا نہیں آسودگیٔ سرو سمن کا
سایہ بھی بہت ہے ہمیں دیوار چمن کا

شاید ہے یہی قربت منزل کی علامت
ہر گام پہ ہوتا ہے جو احساس تھکن کا

احساس کی شدت نہیں اسلوب کی محتاج
پابند نہیں جذبۂ دل دار و رسن کا

لہرائے خیالوں پہ شفق رنگ اجالے
اُبھرا ہے تصور جو کسی شعلہ بدن کا

ہر لفظ میں معنی کا جہاں گونج رہا ہے
شکوہ ہے مجھے تنگیٔ دامان سخن کا

زنجیر کی جھنکار سنی میں نے تو جانا
کوندا کوئی لپکا تری پازیب کی چھن کا

سب اپنی طرح خوار ہوئے عشق میں ارشد
دلی کا ہو غالب کہ ولی ہو وہ دکن کا

○

خامشی محشرِ افکار کا سایہ تو نہیں
دقت کی چپ، کسی پیکار کا سایہ تو نہیں

ہر قدم پر نئے فتنے ہیں، نئے محشر ہیں
یہ تری شوخیٔ رفتار کا سایہ تو نہیں

وہی رعنائی کا عالم ہے وہی جلوے ہیں
موسمِ گل ترے رخسار کا سایہ تو نہیں

بیٹھ جائیں گے جہاں چاہیں گے دیوانے ترے
دشتِ غم میں تری دیوار کا سایہ تو نہیں

حسن اک خاص تناسب سے سمٹ آیا ہے
تیری صورت مرے معیار کا سایہ تو نہیں

جھومتا جھامتا مستانہ چلا آتا ہے
ابرِ رحمت کسی مے خوار کا سایہ تو نہیں

سوچ لے عرضِ تمنا سے یہ پہلے ارشدؔ
نطق میں تلخیٔ گفتار کا سایہ تو نہیں

○

کچھ بڑھ گیا ہے ذوق خریدار بھی بہت
کچھ کھل گئے ہیں شہر میں بازار بھی بہت

سب ہمکنار جلوۂ صبح طرب نہیں
ہیں شب کی تیرگی میں گرفتار بھی بہت

ہر اہل دل تو ننگ مذاق طلب نہیں
ہیں واقفان عظمت پندار بھی بہت

اب گیسوؤں کی چھاؤں کی حسرت نہیں رہی
ہے بیٹھنے کو سایہ دیوار بھی بہت

اڑنے لگا ہے ابلق عمر رواں تو کیا
ہے تیز اسپ وقت کی رفتار بھی بہت

کچھ رہ رووں کی سست روی کا بھی ہے قصور
کچھ مرحلے ہیں زیست کے دشوار بھی بہت

پیدا صنم کدوں کے ثنا خواں ہوئے تو کیا
ہیں عظمت حرم کے عزادار بھی بہت

آئے ہیں تیری بزم میں اب اہل دل کے ساتھ
سوداگران کاکل و رخسار بھی بہت

ارشدؔ رفاقتِ غم دوراں بھی خوب ہے
پر لطف دے رہا ہے غم یار بھی بہت

اعجاز اکرم

"فاصلے"

زندگی سایۂ گیسو ہو کہ ہو دار و رسن
ایک ہی جذبے کی تسکین سے بہم ہوتی ہے
سلسلے شوق کے ہر چند دلاویز سہی
فرصتِ کشمکشِ امید سے کم ہوتی ہے
لب و رخسار کی جنت ہو کہ صد رنگ بہار
دل کشی تنگیٔ داماں پہ نظر رکھتی ہے
عہدِ شاہی ہو کہ سلطانیٔ جمہور کا دور
زندگی اپنے مقدر کی خبر رکھتی ہے
بے رخی وقت کی کب دستِ دعا تک پہنچی
سرکشی حضرتِ انسان کی خدا تک پہنچی
عدل و انصاف کے مرقد سے دھواں اٹھتا رہا
بے بسی تھی کہ جو الزامِ وفا تک پہنچی
کتنی بے نام بہاروں کے نشیمن اجڑے
تب کہیں جل کے نظر رنگِ حنا تک پہنچی
جرمِ حق گوئی کی پاداش میں کتنے سقراط
عظمتِ خام سے الجھے تو دل افگار ہوئے

کتنے مجذوبِ حقیقت تھے کہ منصورِ صفت
حلقۂ وہم سے نکلے تو سرِ دار ہوئے

تیرگیٔ غمِ ایام ہو یا دردِ فراق
کوئی بھی غم ہو غمِ زیست میں ڈھل جاتا ہے
آرزو پیکرِ یخ بستہ ہو یا برقِ تپاں
وقت کے ساتھ ہر اک رنگ بدل جاتا ہے
آگہی روکشِ منزل ہو تو اکثر انساں
کوئی افتاد پڑے بھی تو سنبھل جاتا ہے

مطلعِ دہر پہ چھایا ہوا صدیوں کا جمود
شعلۂ فکر جو لپکے تو پگھل جاتا ہے
ایک ہی لمحے کی تسخیر کا غم رکھتی ہے
زندگی فاصلہ حالات سے کم رکھتی ہے

"شبِ زنداں"

عہدِ رفتہ کے حسیں گیت نہ چھیڑ اے مطرب!
تو سمجھتا ہے کہ جذبات کی رو میں بہہ کر
ہم گراں باریٔ حالات سے بچ جائیں گے
زندگانی کے حقائق سے گریزاں ہو کر
سایۂ گیسوئے جاناں میں سکوں پائیں گے
رامش و رنگ کی باتوں سے بہلنے والے
عشرتِ خام کا انجام بھی سوچا ہوتا
جنکے دامن میں بجز گردِ الم کچھ بھی نہیں
اک نظر تونے کبھی ان کو بھی دیکھا ہوتا
آج بھی زیست کے بے رنگ شبستانوں میں
کتنے گیسو ہیں جو بے منتِ آرائش ہیں
آج بھی صرصرِ حالات سے مرجھائے ہوئے
کتنے چہرے ہیں جو بیگانۂ زیبائش ہیں
چوٹ پڑتی ہے جو دل پہ تو ڈھلک جاتے ہیں
ہر حسیں گیت کے آہنگ پہ اشکوں کے گہر

دردِ بے چارگیٔ زیست فزوں ہوتا ہے

تیرہ و تار فضاؤں میں بھٹکتی ہے نظر

اس دہکتے ہوئے ماحول میں یخ بستہ نوا،

عظمتِ فن پہ ہے الزام ترا رنگِ سخن

زخم ہائے غمِ ہستی، کا مداوا تو نہیں

عہدِ خوں گشتہ کی بے جان روایاتِ کہن !

کاش اے نغمہ گرِ شوق ترا جذبِ دروں

دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو غزلخواں کر دے

رقت دردمیں ڈوبے ہوئے نغمات کی لے

لالہ و گل کے رگ و پے میں شرارے بھر دے

ایک شعلہ کہ رگِ سنگ سے کرنیں پھوٹیں

اک تجلّی کہ فسونِ غمِ دوراں ٹوٹے

ایک لمحہ کہ نئی صبح کا عنواں بنے

ایک نغمہ کہ سکوتِ شبِ زنداں ٹوٹے

"دشتِ وفا"

چاک دل، چاک جگر نوحہ گرانِ ہستی
اپنے بگڑے ہوئے حالات کا غم کھاتے رہے
ایک مدت سے غلط بخشیٔ دنیا کے طفیل
عرصۂ زیست میں جینے کی سزا پاتے رہے
قحط و افلاس کے ماحول میں آنکھیں کھولیں
آہوں اور اشکوں کی آغوش میں پروان چڑھے
عدل و انصاف کے ایوانوں میں فریاد کناں
جرمِ حق گوئی کی پاداش میں بے موت مرے
جب بھی ایثار طلب آئے مقامات کہیں
رہنماؤں کا بھرم خاک میں ملتے پایا!
یوں تو کہنے کو کئی ایک شریکِ غم تھے
غم گساری کے لئے کوئی نہ آگے آیا!
کارواں لٹ کے بھی بڑھتے رہے منزل کیلئے
تذکرے چھوڑ گئے گرمیٔ محفل کے لئے
رقصِ بسمل سے عبارت ہے حیاتِ تازہ
اور یہی رقصِ غمِ زیست کا درماں ٹھیرا!

نشترِ صبحِ طرب سے تو نہ کچھ بات بنی
دشنۂ شامِ الم سلسلہ جنباں ٹھہرا

دامنِ شوق میں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں
کوئی ہم سا نہ یہاں بے سر و ساماں ٹھہرا

ہم ہیں وہ سوختہ جاں جنکو سرِ دشتِ وفا
حلقۂ دار و رسن گیسوئے جاناں ٹھہرا

رشتۂ درد کی توقیر کو شوریدہ سراں
مرحلہ کوئی بھی ہو دل سے بہم رکھتے ہیں

ظلمتِ وقت میں بھرتے ہیں وہی رنگِ شفق
ہر نفس لٹ کے بھی جو لٹنے کا دم رکھتے ہیں

سرِ مقتل جو ہمیں ہیں وہ تماشا ہوگا
چشمِ خوباں نے جسے پہلے نہ دیکھا ہوگا

گردِ الم

مدّتوں ہم نے جس امید پہ اے جانِ وفا!
تیرے ہر درد کو آنکھوں سے لگائے رکھا
زخمِ خنداں کو ترے حسن سے تعبیر کیا
دل کے ہر داغ سے محفل کو سجائے رکھا
عالمِ خواب بھی آئینۂ محرومی تھا
ہم جو سوئے بھی ترے غم نے جگائے رکھا
رشتۂ یاد کی توقیر کو گھٹنے نہ دیا!
تیرے ہر زخم کو سینے میں چھپائے رکھا
خود تماشا بنے رسوا سرِ بازار ہوئے
تجھ کو دنیا کی نگاہوں سے بچائے رکھا
مرحلے تیری جدائی کے مگر طے نہ ہوئے
تجھ سے مل کر بھی ہمیں ملنے کی حسرت ہی رہی
بے طرح عمرِ غمِ ہجر کی منزل میں کٹی!
خوں شدہ دل کو ترے قرب کی چاہت ہی رہی

گلشنِ درد سے چن چن کے مسل ڈالے ہیں
دستِ گل چیں نے تری یاد کے مہکے ہوئے پھول

موسمِ گل میں نئی طرح فغاں ڈالی ہے
دامنِ شوق وہی صرصرِ آلام کی دھول

کون ہیں اور کہاں ہیں نہ ملا ہم کو سراغ
شامِ غربت میں تری یاد نے دم توڑ دیا

زندگی گردِ الم بن کے نہ اڑ جائے کہیں
گردشِ وقت کہاں لا کے ہمیں چھوڑ دیا

اب اُس اُمید میں پہلی سی کوئی بات نہیں
ہم تجھے بھول سکیں ایسے بھی حالات نہیں

○

سید جابر علی جابرؔ

مشینی دور

کتنی دلسوز ہے یہ فرصتِ ہستی! اے دل
کارخانوں کی چیختی ہوئی شوریدہ سری
یہ دھواں دھار سلگتی ہوئی بستی اے دل

آہ! وہ سوچ میں ڈوبا ہوا فطرت کا نقیب
وہی صدیوں کے گذرنے پہ جو آتا ہے نظر
اجنبی شہر میں آیا ہوا حیران و عجیب

وہ مضافات میں اٹھتی ہوئی قمری کی فغاں
اک سکوں بخش سا پیغام سنانے والی
اب اسے پھیلی فضاؤں میں ملے گی نہ اماں

کل جہاں دھوم مچاتی تھی چناروں کی بہار
اے ستم کیش وہاں آج نظر آتی ہے
برقی کھمبوں کی تراشی ہوئی بے کیف قطار

نیم شفّاف شیشہ

نیم شفّاف یہ شیشہ مری نظروں کا حریف
سنگِ رہ دشمنِ جاں، مدِ مقابل دل کا
پاس کے پھیلے مناظر کو مری آنکھوں سے
یوں چھپائے ہے کہ اب چشمِ تصوّر میں بھی
نقشِ تخئیل کے بازصفت خلا باقی ہے

اے کہ تو پردۂ الفاظ کی ہے اک تمثیل
یا کسی بحرِ گراں خواب کی وہ سطحِ عریض
چیر سکتی نہیں جس کو یہ نگاہ بے تاب
دور تا حدِ نظر دوڑ کے رہ جاتی ہے
کتنا بے رحم ہے تو جانی ہوئی چیزوں کو
ایسے کہرے میں چھپاتا ہی چلا جاتا ہے
جس نے ہر شے کی حقیقت کو چھپا رکھا ہے

اے کہ تو میری نگاہوں میں ہے تصویرِ مجاز
کسی عارف کے تصور کا وہ دھندلا پرتو
جو کسی مہرِ جہاں تاب کا سایہ بھی نہیں
یا مرے فکر کی نادیدہ سی پریاں جن کو
زلف و رخسار کے رنگوں سے سجایا میں نے
رنگ، الفاظ، صدا، پیکرِ سنگی کا جمال
کتنے پردوں کی ہے تمثیل تری سنگینی
اے دل و جاں کے رقیب اے مری نظروں کے حریف!

غزل

کتنے چہرے ہیں حجاب اندر حجاب
کتنی تصویریں نقاب اندر نقاب

کتنے نشوں کا فسوں بے کراں
پردۂ انگور میں ہے محوِ خواب

وقت تیرے ہاتھ کا ہے منتظر
دیدۂ عارف! نقیبِ انقلاب

آہ! یہ دوری کا حسنِ بے کراں
بادلوں کے رنگ بے حد و حساب

ہر گھڑی صورت بدلتا منقلب
حسنِ فطرت کا فسوں بے انتخاب

کون کر سکتا ہے ان سب کو اسیر
لفظ کی زنجیر؟ یا دامِ رباب

دیکھنے والے کی چشمِ تیز کو
روشنی دیتا ہے فانوسِ حباب

ابر کا ٹکڑا ہے مجھکو جامِ حسن
بیقراری میں جہانِ اضطراب

ایک موضوعِ غزل ہے بیکراں
کون کہتا ہے کہ فطرت ہے کتاب

٥

غزل

آتی ہے میرے گوشِ رسا میں صدائے رنگ
کس درجہ دلکشا ہے فسونِ نوائے رنگ

انسان کا ہاتھ کیسے وہاں تک پہنچ سکے
فطرت کو جو نصیب ہے طرزِ ادائے رنگ

کیسے اسے سنبھال سکے چشمِ کم نگاہ
جب کائنات صورتِ دریا بہائے رنگ

رکھتی ہے مجھکو رنگ کی لیلیٰ اسیرِ شوق
آنکھ آشنائے رنگ ہے دل مبتلائے رنگ

ہر جلوۂ حیات سے دل ہے گریز پا
جچتا نہیں کچھ آنکھ میں جا بر سوائے رنگ

یہ قربتیں یہ فاصلے

میرے ساتھی ترے اور مرے درمیاں
کسقدر فاصلوں کی فصیلیں کھڑی ہیں یہاں
میرا ویرانہ ہو یا ترا گلستاں!
ہر قدم پر ہزاروں صلیبیں گڑی ہیں یہاں
آرزوؤں کے سائے ہیں پھر بھی رواں
حاصل زندگی حاصل بندگی
آنسوؤں کی جلن حسرتوں کا دھواں
ہر ابھرتی ہوئی رات کی تیرگی
تیری افشاں سے تارے چراتی رہی
میرے آنگن کو آ کر سجاتی رہی
شمع ہستی مگر ڈگمگاتی رہی!
دل پکارا کیا روشنی! روشنی!

کہر آلود راہوں پہ چلتے ہوئے
ہر قدم پر تجھے میں نے آواز دی بارہا
میری آواز نے خود پکارا مجھے
کھو گئی ان خلاؤں کی یخ بستگی میں صدا
ہجر کے مرحلے درد کے سلسلے
کرب کی آندھیاں دل کا بجھتا ہوا اک دیا
تیرے ہونٹوں کی کلیاں مہکتی رہیں
آنکھ روتی رہی ہونٹ ہنستے رہے
جانے کس منزلِ زیست پر آ گئے
میری یادوں کے مہتاب گہنا گئے!

جب چلی سرد ہوا

موسمِ سرما کی یہ ویران اور مغموم شام
کُہر کی چادر میں لپٹی ہے سسکتی کائنات
گیت خوابوں کی طرح لرزاں، سلگتی ہے حیات

برف میں ڈوبی ہوا کی سیٹیاں
چیل کے جنگل کی میٹھی لوریاں

ڈگمگاتے ہیں پریشاں، مضمحل لمحوں کے گام
چار سو آواز دیکر پوچھتا پھرتا ہوں میں

ان ہواؤں کی جبینِ ناز پر
کیا کہیں لکھا ہوا ہے میرا نام

اُڑ رہے ہیں راستوں پر زرد پتے جو کبھی
چند لمحوں کو بنے تھے زینتِ شاخِ شجر
جانے یہ کب تک رہینگے یوں ہوا کے دوش پہ
کو بہ کو، قریہ بہ قریہ، یم بہ یم محوِ سفر
دکھ کے لمبے سلسلے اور چند لمحوں کی خوشی

یہ ہے ساری زندگی!

لمحوں کی موت

سال چلا، دم توڑتے لمحے دھند کی چادر اوڑھے
ماضی کی مغموم تمناؤں کا بوجھ اُٹھائے
آنکھوں میں آنے والی خوشیوں کے دیپ جلائے
گزر رہے ہیں آدھی رات کی سونی راہگذر سے
دکھ کے ایوانوں سے گزریں یاد کی سرد ہوائیں
کتنے پھول سے چہرے من کے آنگن میں مسکائے
کتنے سپنے آنسو بن کر پلکوں پہ لہرائے
اجلی صبحیں روشن شامیں رہ رہ کے تڑپائیں
گھومتی صدیوں کے گرداب میں ڈولے دل کی ناؤ
دیواروں پر کانپ رہے ہیں ڈھلتی رات کے سائے
مدھم سُر کی لہروں پر مخمور بدن لہرائے
دیوانو! کیوں چپ بیٹھے ہو کوئی بات سناؤ
جانے والے کا دکھ کیسا اک آئے اک جائے
اک لمحے کی موت سے دوجا لمحہ جیون پائے
جیسے اک کونپل پھوٹے اور اک پتا گر جائے

ایک موت ایک احتجاج

لاس اینجلز کے زرتاب شبستانوں میں
سو گئی آج وہ آواز کہ جس کا جادو
بوئے گل بن کے اڑا، کوچہ بہ کوچہ ہر سو
بن کے اک چیخ لرز جاتی ہے اب کانوں میں
شب گیسو، شفقِ لب، رخِ تاباں کی سحر
کھو گئے آج اندھیروں کے صنم خانوں میں
خواہشِ مرگ میں ڈوبی ہوئی شاداب نظر
بجھ گئی درد کے ہیبت زدہ ایوانوں میں
زلفِ زریں کی مہک پھول سے ہونٹوں کی ہنسی
نشۂ حسن میں بہکی ہوئی الھڑ رفتار
چشمِ گلگوں کی کرن دستِ حنائی کی بہار
ڈھل گئی رات شبِ رفتہ کی روداد بنی

اب بھی کچھ کہنے کو بیتاب ہیں وہ ہونٹ جنہیں
مل سکا محفلِ ہستی میں نہ اذنِ گفتار

اب بھی سینے میں تڑپتا ہے وہ قلب محزوں
مل سکی جسکو نہ بے لوث محبت کی بہار

بسترِ مرگ پہ ساکت ہے وہ نقشِ ماضی
جس کی پر نور جوانی کو ہوس کاروں نے

معبدِ فن کے خداؤں نے جہانداروں نے
اک مٹتی ہوئی تہذیب کے سرداروں نے

قریہ قریہ سرِ بازار کیا تھا نیلام
گردشِ وقت کے دامن پہ رہے گا الزام

○

شفقت کاظمی

غزل

کس راہ پہ ہیں رواں دواں ہم
جائیں گے خبر نہیں کہاں ہم

اک بار فریب کھا گئے تھے
اب تک ہیں کسی سے بدگماں ہم

جب پوچھ رہے تھے آپ ہم کو
اس وقت نجانے تھے کہاں ہم

یوں تیری نگاہ سے گرے ہیں
گویا تھے متاعِ رائیگاں ہم

دل میں تھیں کچھ ایسی حسرتیں بھی
تجھ سے جو نہ کر سکے بیاں ہم

گذری ہے قفس میں عمر لیکن
بھولے نہیں یادِ آشیاں ہم

بڑھتی گئی منزلوں کی دوری
ہوتے گئے گردِ کارواں ہم

پیش آئے نجانے کیا سفر میں
گھر سے تو چلے ہیں شادماں ہم

کچھ بس نہ چلا تری جفا پر
دیکھا کئے سوئے آسماں ہم

اک منزلِ بے نشاں کی دھن میں
شفقتؔ نہ پھرے کہاں کہاں ہم

غزل

ہم کو ہر چند مطلب نہ تھا آپ سے　　پھر بھی ملتے رہے بارہا آپ سے

جب سزاوارِ غم بھی نہ سمجھے گئے　　ہم کریں اور امید کیا آپ سے

آج حیراں ہیں یوں آپ سے ملکے ہم　　جیسے اب تک نہ تھے آشنا آپ سے

ہم نے جو بات ظاہر نہ کی آپ پر　　لوگ کہتے رہے برملا آپ سے

عمرِ امید یونہی گزر جائے گی　　کوئی وعدہ نہ ہوگا وفا آپ سے

ہر مسرت سے محروم رکھا ہمیں　　خیر اتنا تو ممکن ہوا آپ سے

خوفِ اعدا الگ طعنِ یاراں جدا　　ہم بھی مجبور تھے کچھ سوا آپ سے

کوئی ملنے کی تدبیر بنتی نہیں　　جانے کب تک رہینگے جدا آپ سے

کون لغزش ہوئی آپ سے کاظمی
بے سبب کیوں ہے دنیا خفا آپ سے

غزل

راہ دیکھا کئے عمر بھر آپ کی
کوئی لایا نہ ہم تک خبر آپ کی

سرد مہری یہی ہے اگر آپ کی
بھول جائیگی ہم کو نظر آپ کی

جب سے اہلِ جنوں کا ٹھکانا بنی
کتنی آباد ہے رہگذر آپ کی

بے تعلق رہے آپ ہم سے مگر
یاد آتی رہی بیشتر آپ کی

یوں میں ہر راہ پر گام فرسا رہا
جیسے ہر راہ تھی رہگذر آپ کی

کتنے افسانے اس کے سبب بنے کاظمیؔ
بات ہر چند تھی مختصر آپ کی

غزل

اُس دیارِ جاں فزا سے ایک بار
ہم بھی گزرے تھے مگر بیگانہ وار

زندگی کی ہر خوشی تجھ پر نثار
اے غمِ دل اے کسی کی یادگار

راہ اُن کی دیکھنا دیوانہ وار
یاد ہے اب تک وہ شامِ انتظار

مٹنے والے کاروانوں کا نشاں
آج بھی دیتا ہے راہوں کا غبار

داستاں در داستاں ہوتی گئی
بات اپنی باوجود اختصار

باغ پر اپنا بھی کچھ حق تھا مگر
باغ میں جب تک نہ آئی تھی بہار

قربِ تیرا اپنی قسمت میں نہ تھا
گو ترے ملنے کی راہیں تھیں ہزار

کیا خبر بھولے سے آ نکلے کوئی
اور تھوڑی دیر کر لیں انتظار

دوستوں کی یاد تازہ ہو گئی
شکریہ اے موجۂ بادِ بہار

حادثوں سے دل کا یہ عالم ہے اب
کاظمی جیسے کوئی اجڑا دیار

صادق منصور

غزل

حالات کا دھارا ہے کہ نیزے کی انی ہے
شاید غمِ دل کی غمِ دوراں سے ٹھنی ہے

اب کیوں مری فرقت کی سحر سے ہے گریزاں
وہ دھوپ جو شب بھر ترے آنچل سے چھنی ہے

ہر گام پہ اک منزلِ شیریں کی کشاکش
اس جادۂ سنگیں میں بھی کوہ کنی ہے

زلفوں کے خنک سائے میں اے گردشِ دوراں
سستائے کوئی دم کہ یہاں چھاؤں گھنی ہے

دل جوئی سے احوالِ زبوں پہ نہ کرم کر
اے دوست یہ دل والوں کی خاطر شکنی ہے

اب کس کو فراغت ہے یہاں کسبِ ہنر کی
چادر غمِ ایام کی ہر سر پہ تنی ہے

احساس کے شیشے میں اُبھر آئیں لکیریں
وہ شوخ نظر بھی کوئی ہیرے کی کنی ہے
ہاتوں پہ سلگتی ہے جو تحریر حنا کی
اے شمعِ نگاراں تری شعلہ بدنی ہے
جھلمل سی جبیں، ریشمی زلفوں کے یہ سائے
تصویر یہ تری شام کے رنگوں میں بنی ہے!

مرگِ مسلسل

ہر فاتحِ عالم کو ہے بس ایک ہی سودا
لہرائے نشاں اپنا ستاروں کی زمیں پر
ہے دُور بہت، پھر بھی ہوس کی ہے نظر میں
جھومر جو دمکتا ہے ثریّا کی جبیں پر!

یہ شوکت و سطوت کا حریفانہ تقابل
تخریب و ہلاکت کا یہ اندیشۂ پیہم
دارائی آفاق میں سبقت کے جنوں سے
خطرات میں گھرتا ہوا مستقبلِ عالم

دوراہا

تجھکو نیرنگئ دوراں سے یہ اُمید نہ تھی
یوں کبھی تجھ سے ملاقات بھی ہو جائے گی
مل کے کھو جائے گی تو وقت کے دوراہے پر
زندگی دُورِ خرابات بھی ہو جائے گی!

اب تو وہ وقت تجھے یاد نہ آتے ہوں گے
(اب انہیں یاد دلانے سے بھی حاصل کیا ہے)
میرے خوابوں میں بھی جب ایک پری رہتی تھی
جب تری مانگ ستاروں سے بھری رہتی تھی
کتنے ہنگامے ہوئے، کتنے ہی فتنے جاگے
اور حالات نے بھی رنگ نہ بدلے کیا کیا

انقلاب آیا، کوئی سُرخ سویرا پھوٹا
ابن آدم نے پھر اک خون کی ہولی کھیلی
ذہنِ انسان میں صدیوں سے اُبلتا لاوا
چارسو آگ اُگلتا سا نظر آتا تھا

دور اس دہر کے ہنگامۂ خیر و شر سے
میں ترے شہرِ طلسمات میں محصور رہا
تیرے رخسار کے مہتاب کی مشعل لے کر
تیری زلفوں ہی کے ظلمات میں محصور رہا!

فن کی پلکوں پہ جنہیں میں نے ترے نام کے دیپ
پھونک ڈالا جسے اس جوت نے میرا گھر تھا
خود کو جھلایا، ترا روپ اُجاگر کر کے
میں ترے جلوۂ شب تاب کا پس منظر تھا!

گرچہ آنکھوں سے چھلکتے رہے یاقوت کے رنگ
کوئی آنسو بھی نہ پانی سے گہر تک پہنچا
کتنے ہی خوابوں پہ چھٹکی ترے آنچل کی دھنک
کوئی بھی خواب نہ پایانِ سحر تک پہنچا
بھیجتا ہی رہا دل رنگ و طرب کے پیغام
کوئی قاصد نہ ترے روپ نگر تک پہنچا!

بے نور خلاؤں میں بھٹکتی ہوئی روحیں
شیرازۂ ہستی ہے کوئی خوابِ پریشاں
یہ موت کی دہلیز پہ سہمے ہوئے سائے
یہ مرگِ مسلسل سے گزرتے ہوئے انساں

تسخیرِ خلا، جوہری قوت کے مظاہر
آفاق میں اک حشرِ بلاخیز بپا ہے
اے لرزہ بہ اندام زمینوں کے خداؤ
آدم کو یہ کس دانۂ گندم کی سزا ہے؟

عاصی کرنالی

غزل

رخ سے وہ آہستہ آہستہ اٹھاتے ہیں نقاب
تم نے دیکھا ہے تماشائے طلوعِ آفتاب؟

چومتے پھرتے ہیں آنکھوں کو نجوم ماہتاب
دوستو! ہم نے بھی دیکھے ہیں کھلی آنکھوں سے خواب

یہ دہکتا حسن، یہ خوشبو میں بہتا شباب
اے خبر! اک اللہ یہ تم ہو یا کوئی شاخ گلاب

اے نگاہِ زہد تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
وہ نگاہِ مست بن جاتی ہے جب موجِ شراب

جب دمکتے حسن کے جلووں پہ پڑتی ہے نظر
ایک دل میں جذب ہو جاتے ہیں کتنے آفتاب

چہرہ ہے ظالم کا یا تصویر رعنائی کا عروج
حسن ہے کافر کا یا مومن کی غزلوں کا جواب

مسکراتی آنکھ یوں دیتی ہے لرزش روح کو
جس طرح دھیرے سے کوئی چھیڑ دے تارِ رباب

ایک آنچل چھو گیا مجھ کو تو یوں ٹوٹا ہے دل
جس طرح لمسِ ہوا سے ٹوٹ جاتا ہے حباب

یہ شعاعیں، یہ شرارے، یہ شگوفے، یہ نجوم
چھین لے یارب نگاہوں سے شعورِ انتخاب

غرق ہو جا ان خموں میں اے جگر کی تشنگی
ڈوب جا ان مے کدوں میں اے نگاہِ باریاب

لیکن اے وجدانِ شاعر یہ تری منزل نہیں
یہ جہانِ زلف و رخ، یہ رنگ و نکہت کا سراب

غزل

میرا اخلاصِ طلب یاد آیا
بے مروّت کو مَیں کب یاد آیا

منزلِ شوق پہ جب ہم پہنچے
دیر تک دشتِ طلب یاد آیا

اُف وہ میرا سفرِ تنہائی
تو سرِ جادۂ شب یاد آیا

دل ہوا اُس سے پشیماں کیا کیا
غمِ دوراں میں وہ جب یاد آیا

صبح خلوت کی اداسی ہیں مجھے
جلسۂ شامِ طرب یاد آیا

جب ستاروں پہ جمی اپنی نظر
اک ستارہ سرِ شب یاد آیا

رات ہم دل کے کھنڈر میں گھومے
چاند اک خندہ بہ لب یاد آیا

آج جب آپ کو ہنستے دیکھا
دل کے لٹنے کا سبب یاد آیا

کبھی تم بھی تھے شناسا اپنے
شکل دیکھی ہے تو اب یاد آیا

ہم کو عاصیؔ! سرِ صحرائے معاش
مدتوں شعر و ادب یاد آیا

غزل

وفا ڈھلتا ہوا سایا نہیں ہے   یہاں تک زندگی دھوکا نہیں ہے

جوانی کو خنک موسم نہ سمجھو   جوانی دھوپ ہے سایا نہیں ہے

تری موجودگی تو کی ہے محسوس   اگر میں نے تجھے دیکھا نہیں ہے

جسے سنیئے، وہی کچھ کہہ رہا ہے   جسے کہیئے، وہی سُنتا نہیں ہے

خرد کہتی ہے ترکِ عشق کیجئے   مگر دل نے تو فرمایا نہیں ہے

ذرا تکلیف کر اے حسنِ رنگیں   گلوں کا رنگ ابھی گہرا نہیں ہے

کہا میں نے محبت کیا ہے اے دل!   کہا دل نے، محبّت کیا نہیں ہے

بہت نازک خلش ہے زندگانی   یہ ظالم پھانس ہے کانٹا نہیں ہے

یہ غم یہ دھیمی دھیمی آنچ عاصیؔ
کہ دل جلتا ہے اور جلتا نہیں ہے

غزل

حسنِ گل جنتِ دیدار بھی ہو جاتا ہے ۔۔۔ پھول کا رنگ شرربار بھی ہو جاتا ہے
یہ جو طوفاں ہیں یہ انساں کا دل دیکھتے ہیں ۔۔۔ جو تلاطم ہے وہ پتوار بھی ہو جاتا ہے
پاؤں کا سایہ سمجھ کر مجھے پامال نہ کر ۔۔۔ سایہ بڑھ جائے تو دیوار بھی ہو جاتا ہے
ہائے کس دل سے میں اُس چاند کو ویراں سمجھوں ۔۔۔ جو ترا شعلۂ رخسار بھی ہو جاتا ہے
غم ہے اک زہر مگر یہ بھی سنا ہے میں نے ۔۔۔ غم شرابِ نگہِ یار بھی ہو جاتا ہے
حشر جو شے ہے میں اُس سے نہیں ڈرتا لیکن ۔۔۔ حشر بڑھ کر تری رفتار بھی ہو جاتا ہے
دیکھ اے دستِ ہوس پھول کے دامن کو نہ چھو ۔۔۔ پھول اس وقت میں تلوار بھی ہو جاتا ہے
جب تماشائے سرِ بزم سے نکلتی ہے حیات ۔۔۔ اک تماشائے سرِ دار بھی ہو جاتا ہے

یہ بھی اک شیوۂ اظہارِ جنوں ہے عاصیؔ
نغمہ زنجیر کی جھنکار بھی ہو جاتا ہے

عرش صدیقی

پا بہ زنجیر

ہوا تھم گئی ہے
درختوں پہ اک گہری چپ خیمہ زن ہے
ہری گھاس پر چاندنی سو رہی ہے
فضا میں خموشی کی خوشبو بسی ہے
میں اک نیم روشن پہاڑی پہ بیٹھا
درختوں کی وہ چوٹیاں گن رہا ہوں
جو اک دوسرے سے برابر گریزاں !
حسیں رات کی چاندنی میں فروزاں
مجھے میری تنہائیٔ جان و تن کی
خبر دے رہی ہیں !
اُدھر سامنے ایک خاموش میداں
فضاؤں کے ہمدوش پھیلا ہوا ہے
اِدھر پشت پر کوہساروں کی دنیا
افق تا افق آسمان تک گئی ہے
میں اپنی پہاڑی کی چوٹی پہ بیٹھا

نگاہیں جھکائے ہوئے سوچتا ہوں
کہ ان آسمانوں
کہ اِن کوہساروں
کہ ان مرغزاروں میں کیا شے ہے میری!
مجھے سب خبر ہے
مرا کچھ نہیں ہے
نہ کہسار میرے
نہ میدان میرا
فقط نیم روشن پہاڑی ہے میری!
ازل سے میں اس برجِ کاکیشیا کا
پرومی تھیس ہوں!

پہاڑوں کے اُس پار ہے ایک وادی
جسے میں تخیّل کی آنکھوں سے اکثر
سدا دیکھتا ہوں
کبھی میں وہیں تھا
مگر اب پہاڑوں کا وہ سلسلہ درمیاں ہے

جو دروں کے ہر طور امکاں مٹائے
کراں تا کراں آسماں تک گیا ہے
مرے سامنے ہے جو خاموش میداں
یہاں بھی کئی بار محفل سجی ہے
کئی بار اٹھے ہیں نغمے یہاں سے!
وہ نغمے کہ جن سے جواں زندگی ہے
کئی بار اُس نے پکارا ہے مجھ کو
کئی بار میں نے بھی آواز دی ہے
مگر میں ہوں اپنی پہاڑی کا قیدی
(اُدھر دشتِ فردا، اِدھر کوہِ ماضی)
یہ سب دور ہی دور سے دیکھتا ہوں!

اے جادوگر

اے جادوگر، پاس ترے کیا ایسا بھی کوئی جادو ہے
مجھ کو جو اک دم پنکھ لگادے اور کیلاش پہ پہنچا دے؟
ساتھ میں اپنے گھور اندھیرے اس دھرتی کے لے جاؤں
اور کیلاش پہ برساؤں،
پاربتی کو سیس نواؤں اور شوجی سے یہ پوچھوں
تم جو یہاں کیلاش پہ بیٹھے امرت جام چڑھاتے ہو
اور تاروں کی قندیلوں سے اپنا سورگ سجاتے ہو
کوئی نہیں دکھ درد نہیں، تم ہر دم عیش مناتے ہو
گیت خوشی کے گاتے ہو
پر اِس دھرتی کے پُرشوں کو وعدوں سے بہلاتے ہو
ہر دل کو ترساتے ہو
تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے دھرتی پہ کیا ہوتا ہے؟
کیوں اس کا نصیبہ سوتا ہے
اِس دھرتی کو دیکھو جو ہے ایک پہیلی، ایک سوال
ہر سینہ ہے اک اگنی کنڈ، ہر آنکھ یہاں اک ننھی تال

ہم سے اتنی دور ہے اوشا جتنا سورج سے پاتال
پل بھر کو ملتی ہے خوشی ۔۔۔ اور باقی برسوں کا جنجال!
کس برتے پر کہلاتے ہو شو جی تم جگ پال؟
روح کی باتیں سب کرتے ہیں کوئی نہیں ودوان
کوئی نہیں جو ہم کو بتائے ملتا ہے کیسے بھگوان!
مذہب ایسا خول بنا ہے جیسے مورت مندر کی
اوپر سے پیاری پیاری
اور اندر سے خالی سی!
تم نہلاؤ نام پہ اپنے جب مندر بنواتے ہو
اس میں اک پتھر رکھوا کر خود کیوں گم ہو جاتے ہو؟

اے جادوگر، پاس ترے کیا ایسا بھی کوئی جادو ہے
مجھ سے جو میرا درد بٹا کر اس دھرتی پہ بکھرا دے
غم کے ان بیجوں کی دھرتی کچھ عرصہ رکھوالی ہو
اور پھر برسے ایسے برکھا پگ پگ پہ ہریالی ہو!
ہر غم کی پامالی ہو!

یا پھر مجھ سے میں چھن جاؤں، میری سوچ ہی مٹ جائے
پھر نہ مجھے اپنا ہی دکھ ہو اور نہ ہو غم دُنیا کا
دھرتی پر ہو گھور اندھیرا اور میں بے پروا سوؤں!
شوجی امرت جام چڑھائیں، چین کی مرلی بجائیں
سب کچھ دیکھوں، کچھ بھی نہ سمجھوں خود میں گم ہو جاؤں!
اے جادوگر پاس ترے کیا ایسا بھی جادو ہے؟

دعائے نیم شبی

فضا چپ ہے اور نصف شب جا چکی ہے
میں اک فکرِ فردا لئے جاگتا ہوں
مری ننھی بچی، منزہ، کہ جس کو
مرے پاس لیٹی ہوئی اس کی امی بہت پیار کرتے ہوئے سو گئی ہے
مجھے، میرے ماضی کی قندیل لے کر
کسی آنے والے زمانے کی تصویر دکھلا رہی ہے

مجھے یاد ہے اک برس اس کے آنے سے پہلے
مجھے اس کی امی سے کوئی تعلق، کوئی واسطہ تک نہیں تھا
میں اس کے لئے غیر تھا، اجنبی تھا
مگر ایک سیّال لمحے نے اسکو
اسی اجنبی کی، اسی غیر کی ہر خوشی کا خدا کر دیا تھا
میں اک اجنبی دور سے آنے والا
وہ اک دوسرے شہر کی رہنے والی

نہ میں نے اسے تپتے صحرا میں ڈھونڈا
نہ اس نے مجھے میٹھے سپنوں میں دیکھا
مگر ہم نے اک دوسرے کی نظر میں
سکون و محبت کا وہ راز پایا
کہ ہم اپنے بختِ رسا پر ہیں نازاں

میری ننھی بچی، منزہ کہ جس کو
میرے پاس لیٹی ہوئی اس کی امی بہت پیار کرتے ہوئے سو گئی ہے
مجھے، میرے ماضی کی قندیل لے کر
کسی آنے والے زمانے کی تصویر دکھلا رہی ہے
کہ ہو کر جواں جب
وہ امی کے حسنِ سکون بخش کی یاد تازہ کرے گی
تو اک اجنبی، جانے کس شہر سے، کونسے راستے سے
سجائے ہوئے اپنے ماتھے پہ تاروں کا سہرا
لئے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا گجرا
میرے پاس آئے گا اپنے مقدر کا زور آزمانے
میں اس کی خوشی کے لئے زندگی کے اثاثے کو قربان کر دوں گا

وہ ہنستا ہوا مسکراتا ہوا، میری تسکینِ جان کو
مرے لختِ دل کو، مرے مرکزِ آرزو کو
نہ جانے کہاں، کونسے دیس کی کونسی وادیوں میں مقید کرے گا!
میں اس آنے والے زمانے کی تصویر یہ ہر شب
دریچوں میں، کمروں میں، صحنوں میں سجتی ہوئی دیکھتا ہوں
اور اپنے خدا سے
(ازل اور ابد کی سمجھ دینے والے خدا سے)
فقط اک دعا۔ ایک اتنی دعا مانگتا ہوں
کہ اس اجنبی کا بھی میرا سا دِل ہو!

○

بیکرانی

ہمیشہ مرے دل کو اچھی لگی ہے
یہ تنہا پہاڑی،
ہمیشہ رہا جاگزیں میرے دل میں
یہ سنسان ٹیلہ
ہمیشہ مجھے سرخوشی دے گیا ہے
یہ اک سلسلہ جھاڑیوں کا — کہ جس نے
چھپایا ہے میری نظر سے اُفق کا
ذرا سا کنارا
ذرا سا کنارا عبارت ہے جو خود بھی پہنائیوں سے

نظر دیکھتی ہے تو پھیلے ہوئے اس افق کا تصور
مرے ذہن پر بیکراں وسعتوں کے۔ خلاؤں کے در کھولتا ہے!
وہ خاموشیاں اور وہ گہرائیاں سب — کہ ارضی نہیں ہیں
جو میرے تخیل سے، ادراک سے ماورا ہیں
میرے دل کو وحشت زدہ کر گئی ہیں

اِدھر جب ہوا تیز اور تند ہو کر
نکلتی ہے شاخوں سے چلاتی روتی
تو میں ان صداؤں کو اِس خامشی کے مقابل بٹھا کر
ازل اور ابد کو
بیابانِ ماضی کے ان بیکراں فاصلوں کو
جو پیکارِ ہستی کی گرمی سے محروم ہو کر فنا ہو چکے ہیں
اور اس عہدِ حاضر کے ان فاصلوں کو
جو زندہ ہیں اور زندگی دے رہے ہیں
اور اس عہدِ حاضر کی آوازِ پا کو
تخیل میں اک ساتھ پھیلا ہوا دیکھتا ہوں
اور ان بے اماں بیکراں وسعتوں میں
میں ہنستا ہوا ڈوب جاتا ہوں اکثر
کہ ایسے میں اس بحر میں، ڈوب مرنا بھی اک زندگی ہے!

ماخوذ

○

مسرّت درّانی

تاریکیاں

میں تاریکیوں کا پجاری ازل ہی سے تاریکیوں کا ثنا خواں رہا ہوں
وہ تاریکیاں جو کسی بے وفا، بے ثبات، عارضی روشنی کی طرح
آفتاب اور چراغوں کے احسان اٹھاتی نہیں ہیں
وہ تاریکیاں جو خدا کی طرح روزِ اوّل سے خوددار و خود آفریں ہیں
وہ تاریکیاں جو نہیں نور کی، نار کی منتظر ایک پل کے لئے بھی
وہ تاریکیاں جن کے خاموش پہلنے سے ہر روشنی کی کرن پھوٹتی ہے
وہ تاریکیاں جو ازل سے ہر اک چیز کی زندگی کو جنم دے رہی ہیں
وہ تاریکیاں جن کی سمت آخرِ کار ہر زندگی لوٹتی ہے
وہ تاریکیاں جو بڑی پائدار اور بڑی مستقل ہیں
وہ تاریکیاں جن میں ہر وقت اُمید کی دیویاں بال کھولے خراماں خراماں
کہیں دور امکاں کے کچھ دیوتاؤں کی جانب رواں ہیں
وہ تاریکیاں جو ہمیشہ سے ہر صبحِ تاباں کی پیغامبر ہیں
مجھے رات کی بے کراں وسعتوں کی قسم ہے

مجھے رات کی خوابگوں، پُرسکوں، پُر فسوں تیرگی سے ازل ہی سے
اک ربطِ پیہم رہا ہے

یہی تیرگی غم کے لمحات میں
میری تخیّل کا تازیانہ بنی
بن کے مہمیز وہ میری تخلیق کی
میرے افکار پر، میرے جذبات پر، میرے وجدان پر
میرے احساس پر اس طرح چھا گئی جس طرح نیلگوں آسماں پر ہو قوسِ قزح
اور میں شب کا پرستار ہونے کے باوصف بھی کوئی بزدل قنوطی
نہیں ہوں

میں ڈرتا نہیں دن کی للکار سے
جنگ و یلغار سے جہد و پیکار سے
مرد بن کر لڑا ہوں میں آفات سے
اور مصائب کو دندان شکن مات دی
برق بن کر گرا ہوں میں حالات پر
اور سانہیں میرے سانچوں میں ڈھلنا پڑا
پھر بھی ظلمات سے

بے کراں رات سے
مجھ کو اک ربط ہے
مجھ کو اک اُنس ہے
تیرگی کے خدا کا ثنا خواں ہوں میں
مجھ کو ابلیس کی عظمتوں کی قسم
مجھ کو ابلیس کی ذات سے پیار ہے
مجھ کو اس کے تمرد کا اقرار ہے
اس کے دم سے ہے رنگینیٔ کائنات
اس کے دم سے ہے سرگرمیٔ شش جہات
اور مجھے غم سے بھی ایک دیرینہ وابستگی اور اک والہانہ محبت رہی ہے
کہ تاریکیوں کے حسیں شہر میں غم کا ہی راج ہے
غم جو تخلیقِ عالم کی بنیاد ہے
غم جو انساں کی عظمت کا غماز ہے
غم جو انساں کی تکمیل کا راز ہے
غم ہے سرچشمۂ دانش و آگہی!
غم کی تقدیس کا مجھ کو اقرار ہے
غم کی تحریم کا غم کی تکریم کا
غم جو دنیا کی سب سے بڑی سب سے پائندہ سب سے واضح حقیقت کا اک نام ہے

غم کہ جس کے بسیط اور خاموش سینے سے ہر سرخوشی، ہر مسرت
ازل سے جنم لے رہی ہے
یہ غم جو کہ انسان کے ذوقِ عمل اور اس کی تگ و دَو کا خلاق ہے۔
غم جو مجبہ صفت اور مکّار و عیّار و ناپائدار، عارضی اور بیکار خوشیوں
کی مانند بے سود سی کھوکھلی شے نہیں
غم جو انسان کا مستقل، باوفا اور بے لوث ساتھی ہے
اور اس کی تنہائیوں کا سہارا ہے مونس ہے غم خوار ہے
مجھ کو غم کی حقیقت کا اقرار ہے
غم جو تاریکیوں کا جہاندار ہے
اور میں تاریکیوں کا پجاری ازل ہی سے تاریکیوں کا ثنا خواں رہا ہوں۔

٭ ٭ ٭

فاصلے

رات کی تیرگی میں اک راہی
اجنبی شہر سے گزرتا ہے
اور اک چیخ گونج اٹھتی ہے

○

غزل

شور ہے ہر طرف سحاب سحاب — ساقیا ساقیا شراب شراب
آبِ حیواں کو مے سے کیا نسبت — پانی پانی ہے اور شراب شراب
رند بخشے گئے قیامت میں — شیخ کہتا رہا حساب حساب
اک وہی مست باخبر نکلا — جسکو کہتے تھے سب خراب خراب
مجھ سے وجہِ گناہ جب پوچھی — سر جھکا کر کہا شباب شباب
جام گرنے لگا تو بہکا شیخ — تھامنا تھامنا کتاب کتاب
کب وہ آتا ہے روبرو کشفیؔ
جس کی ہر ہر ادا حجاب حجاب

غزل

اُٹھ اُٹھ کے بگولے مجھے کرتے ہیں اشارے
ہیں کتنے دلآویز یہ صحرا کے نظارے

آنسو کے تلاطم میں ہے امید کی کشتی
کب دیکھئے لگتی ہے یہ دریا کے کنارے

سن آئے ہیں تو حضرتِ واعظ کا بھی ہم وعظ
جسطرح کہ سویا ہوا سوتوں کو پکارے

دن فکر میں شب فکر کے بہلانے میں گزری
اسطرح سے کچھ زیست کے ایام گذارے

جسطرح کہ منزل کا مسافر کو یقین ہو
بیٹھا ہوں تری راہ میں یوں پاؤں پسارے

تصویر کے ہر رُخ پہ حقیقت کی جھلک ہے
کچھ ایسے مصوّر نے ترے نقش اُبھارے

مندر کے جھروکوں سے چمک جیسے ہو ظاہر
کافر کی نگاہیں ہیں کہ بجلی کے شرارے

کشفیؔ کی طرح کون وفادار ملے گا
جو توڑ کے لادے تجھے گردوں کے ستارے

غزل

بے کسی دیکھی نہیں یا بے بسی دیکھی نہیں
زندگی میں مَیں نے کوئی دلکشی دیکھی نہیں

ایک افسانہ ہے جسکے سینکڑوں عنواں ہیں
بات یہ ہے تو نے میری زندگی دیکھی نہیں

ایسا کچھ احساس ہوتا ہے وفورِ غم کے ساتھ
جسطرح میں نے کبھی کوئی خوشی دیکھی نہیں

روشنی کے دیکھنے کو دل کی آنکھیں چاہئیں
مہر و مہ دیکھے ہیں تو نے روشنی دیکھی نہیں

چھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد سینہ ِ نور سے
چاندنی راتوں میں تو نے چاندنی دیکھی نہیں

عشق کی ہر بات سے ہشیار رہنا چاہیئے
دوستی دیکھی ہے تو نے دشمنی دیکھی نہیں

دے کے دل اس شوخ کو کیا ہو گیا کشفی تجھے
ایک مدت سے ترے لب پہ ہنسی دیکھی نہیں

غزل

آنکلتا وہ کسی روز ادھر — حوصلے ہم نے دیئے ہار مگر
میری پلکوں پہ دمکتے آنسو — جیسے لڑیوں میں چمکدار گہر
اے دلِ زار یہ کیا عالم ہے — تجھکو میری نہ مجھے تری خبر
بام پر آکے زمانہ دیکھے! — غیرتِ گل ہے کہ تو رشکِ قمر
اے مسافر یہ تغافل کب تک — ہوش میں آکہ ہے درپیش سفر
لے چلا عشق بیابانوں میں — کوئی منزل نہ کوئی راہگذر
ہم نے فریاد بھی کر دیکھی ہے — نہ ہوا تجھ پہ مگر کوئی اثر
ہجر کی رات بھی کیا رات ہوئی — شام کہتی ہے کہ مشکل ہے سحر

وہ جو مل جائے تو سب کچھ مل جائے
یار کشفی کوئی تدبیر تو کر

کیفی عُباپوری

دیوانہ کوئی چاک گریباں نہ ملیگا
اب کوئی شناسائے بہاراں نہ ملیگا

گذریں گے بہت لوگ تری راہگزر سے
پر ہم سا کوئی سوختہ ساماں نہ ملیگا

کب یاد نہ آئیگی ترے عہدِ وفا کی
کب اشک سرِ دامنِ مژگاں نہ ملیگا

اب عمر اسی حال میں کٹ جائیگی شاید
تسکین کا پہلو کسی عنواں نہ ملیگا

جلتے ہیں کہ اب آتشِ غم سرد نہ ہوگی
کڑھتے ہیں کہ اس درد کا درماں نہ ملیگا

اس جشنِ گل و لالہ کے انبوہ میں کوئی
غم خوار تجھے شبنم گریاں نہ ملیگا

احسان اٹھاتے ہو عبث چارہ گروں کے
یہ زخم تو اے سینہ فگاراں نہ ملیگا

آرائشِ گیسو کا خیال آئے گا تم کو
جب کوئی بھی سرگشتہ و حیراں نہ ملیگا

کانٹے ہیں کہیں اور کہیں سنگِ گراں ہیں
کیفی! مری راہوں میں گلستاں نہ ملیگا

○

مرہم میں نمک آپ ملا کیوں نہیں دیتے
زخموں کو بھی ہنسنے کی سزا کیوں نہیں دیتے

مایوس تمنا بھی ہیں محرومِ کرم بھی!
پھر لوگ تمہیں دل سے بھلا کیوں نہیں دیتے

دن رات یہ پلکوں پہ سلگتے ہوئے آنسو
احساس کی دنیا کو جلا کیوں نہیں دیتے

پھرتا ہوں بڑی دیر سے آوارہ و تنہا
رستے مجھے منزل کا پتا کیوں نہیں دیتے

رہ جائیگا یوں ہی تو بھرم چارہ گری کا
احباب مجھے زہر پلا کیوں نہیں دیتے

ہو جائے نہ شعلہ لبِ صرصر میں فسردہ
غنچہ کوئی گلشن میں کھلا کیوں نہیں دیتے

ہم لوگ تو زندانیٔ ناموس و اداں ہیں
تم ہم کو حقیقت کا پتا کیوں نہیں دیتے

دل جگر میں کئی ناسور لئے پھرتے ہیں ۔۔۔ لب پہ اک خندۂ مجبور لئے پھرتے ہیں

کوئی فتویٰ تو ملے اور کہیں سولی تو گڑے ۔۔۔ اہل دل دعویٰ منصور لئے پھرتے ہیں

پھر نہ ہو جائے کہیں وحشت دل کا چرچا ۔۔۔ تیری بستی سے اسے دور لئے پھرتے ہیں

دشت کے سینۂ بے نور میں کتنے ذرے ۔۔۔ اپنے دامن میں کئی طور لئے پھرتے ہیں

اس بدلتی ہوئی دنیا میں وفا کی رسمیں ۔۔۔ ہم سے کچھ لوگ بدستور لئے پھرتے ہیں

دوستو! ہم بھی مدارات بہاراں کے لئے ۔۔۔ کب سے اک ساغر مخمور لئے پھرتے ہیں

یہی رستے۔ یہی ساتھی۔ یہی رستوں کے چراغ ۔۔۔ میری منزل سے مجھے دور لئے پھرتے ہیں

لب پہ آیا تھا کبھی حرف تمنا کیفیؔ
لوگ اب تک وہی مذکور لئے پھرتے ہیں

غم کی جب لہر چلی ہے دل میں — زندگی جاگ اٹھی ہے دل میں

سرِ مژگاں جو ستارے چمکے — روشنی پھیل گئی ہے دل میں

نہ رہا ان سے تعلق پھر بھی — کاہشِ درد وہی ہے دل میں

کتنے معصوم و حسیں چہروں کی — ایک محفل سی جمی ہے دل میں

تم نہیں کوئی تو گذرا ہوگا — ایک آہٹ تو سنی ہے دل میں

کون سا چاند افق پر ابھرا — چاندنی پھیل گئی ہے دل میں

مجھ کو بھی راکھ نہ کر دے کیفیؔ
یہ جو اک آگ لگی ہے دل میں

محمد علی بخاری

قطع و برید

کیفِ مقصد سے تہی

زیست
بسر کرنے کو
دل نے کیا رنگ بھرے
عقل نے کیا کیا نہ کیا
مشیتِ امکان میں فطرت کے تقاضوں کی طرح
خوابِ امروز کی تعبیر پہ باندھے اُمید
منتظر ہوں کسی فردا کا جیئے جاتا ہوں
زندگی کاش کسی طرح گوارا ہو جائے
اپنی بے خواب تمناؤں سے
دلِ صد چاک کو ناچار سیئے جاتا ہوں

دیکھ!
دیوار پہ "ساعت" کی طرف دیکھ!
چلی جاتی ہے
اپنی رفتار کا مقصد اسے معلوم نہیں
یہ خد و خال یہ "ساعت" کی فروزاں صورت

کاوشِ کارِ مسلسل کی گراں باری سے
وقت کی ڈھول سے ہر لمحہ اٹی جاتی ہے
کاوشِ کارِ مسلسل سے جو گھبراتی ہے
اپنی رفتار کو لمحوں میں بدل دیتی ہے
رقصِ طاؤس کی فرصت کہ جس میں اسکو
"نیم ساعت" یہ وہ پازیب کی تکرار
میسر ہر روز
اس کی کلفت کو مٹا دیتی ہے
اس میں جینے کی ہوس بڑھا دیتی ہے
میرا جینا بھی یہی ہے جو ہے اس "ساعت" کا
بس یہی قطع و برید
زندگی کاش کسی طرح گوارا ہو جائے
اسے لمحات کے ٹکڑوں میں بدل دیتا ہوں
اور ہر لمحے کو رنگین بنا کر شب کو
کاٹ دیتا ہوں . فنا کرتا ہوں

کاوشِ عمرِ دراز
کیفِ معراجِ تعیش کے لوازم کی تلاش
شیوۂ زیست بنا جاتا ہے

نغمۂ چنگ ، مئے تند ، غزالانِ فرنگ
رقصِ عریاں میں جوانی کے تقاضوں کی بہار
آبِ کوثر سے گراں آگ یہ مغرب کی شراب
اس تہی زیست کی معراج سہی
مگر اس پر بھی
روح تسکین سے محروم نظر آتی ہے
بیکلی جینے کا مفہوم نظر آتی ہے
جامِ بلور سے لمحات تراشوں کب تک ؟
زہرِ غم کو رگِ ساز میں لاؤں کب تک ؟
زندگی ٹکڑوں میں تقسیم اگر ہو سکتی
حاصلِ زیست کو منتھی ہیں لئے
نوعِ انساں کی صفِ اول میں
میں بہت دیر کا پہنچا ہوتا
عشرتِ روح کبھی کاش میسر ہوتی
ایک بے لوث جنوں
کوئی جو دیوانہ پن
اس سے محروم جیئے جاتا ہوں
زندگی ٹکڑوں میں تقسیم کیے جاتا ہوں

ترغیب

ہٹلر کی موت پر

آگ برسی کہیں شعلوں سے زمیں پاک ہوئی
ذرۂ مہر کہیں مثلِ جہنم ٹوٹا
آفریں چھین کے یزداں سے کہیں دستِ جنوں
بانگِ زردست کا پیغام لئے
خوابِ چنگیز کی تعبیر ہوا۔
برق لپکی۔ کہیں طغیانِ اجل ٹوٹ پڑا
سانس لینے کی ہوس تھی کہ یہ تھا عزم بقا
کوہِ آتش سے جو لاوے کی طرح پھوٹ پڑا
مردِ جانباز پہ کیا گزری۔ تجھے اس سے کیا
رفعتِ عرش سے ٹکرا کے ہوا ٹکڑے تجھے اس سے کیا

خلدِ آدم کے نکوکار امیں
سن کہ مٹی سے ندا آتی ہے
فتنے برپا بھی ہوئے اور مٹائے بھی گئے
تو جہاں بھی تھا وہیں محوِ تماشا ہی رہا۔

کڑوے بول

تھک گئے ہم تو سنتے سنتے اب ہو وے پربھات
کتنی آنکھیں پتھرائی ہیں پر نہ بیتی رات
دکھ کے بہتے ساگر میں سکھ کاغذ کی اک ناؤ
اس پر کھیون ہار کہاوے تیری بھی کیا بات
رام دوارے تلک لگا کر راون کتھا سنائے
زور ہے جسکا سیتا اس کی زور ہے اونچی ذات
سندر صورت بات رسیلی گلی گلی تصویر
گئی ہیں کتنے یہ مت پوچھو ڈھاک کے تین ہی پات
جل کر دیپ کی لو بن جانا اِک پاگل کی ریت
دین دھرم مایا پہ واریں یہ سب [illegible]
سوکھ گئے آدرش کے دھارے بجھ گئی جیون جوت
بن آدرش کے جیون کیا ہے دولہے بنا برات
سچ تو کڑوا لاگے جگ کو بول نہ کڑوے بول
راج سنگھاسن کی پوجا ہے پوچھ اب ذات نہ پات
کیا بتلاؤں اِس نگری میں ایک کری کے بھاگ
آشاؤں کے کھیت ہیں بھگون سپنوں کی برسات
جیون کال پڑا ہے ساتھی چل پردیس چلیں
پاپ کہاوے اِس نگری میں جوبن کی سوغات

سرور جعفری

○

پھول کیوں افسردہ و برہم رہے
باغ کے کانٹے ہی کچھ محرم رہے

کتنی آہیں تھیں جو بے صرفہ رہیں
اور کتنے زخم بے مرہم رہے

کیا خبر کس دم بجیں شہنائیاں
ہم رہینِ مجلسِ ماتم رہے

گو ترے ملنے کی راہیں دور تھیں
فاصلے پھر بھی دلوں کے کم رہے

یوں ہوا محسوس تیرے قرب سے
جیسے جنّت کی فضا میں ہم رہے

عظمتِ یزداں مسلّم، پر ندیمؔ
ہم قتیلِ عظمتِ آدم رہے

نکہت گلوں کی بادِ خزاں بن کے رہ گئی !
ہر اک امنگ اشک فشاں بن کے رہ گئی

اے اجنبی دیار کے لوگو خبر تو لو
میری تلاش سنگِ گراں بن کے رہ گئی

دنیا یہ جانتی ہے نہیں ان سے رسم و راہ
اللہ کیوں یہ دشمنِ جاں بن کے رہ گئی

کتنے ضرر رساں ہیں زمانے کے لوگ بھی
دل کی حسیں مراد زیاں بن کے رہ گئی

تشریح واقعات کی صورت تو بن پڑی
رودادِ خامشی بھی زباں بن کے رہ گئی

کیا تھیں ندیم شیشہ و ساغر کی گردشیں
صہبا کی بوند موجِ رواں بن کے رہ گئی

یونہی گزر کے نہ چل دل کی شاہراہ سے دور
یہ احتیاط ہے آدابِ رسم و راہ سے دور

جنوں مچلتا رہے گا شرار بن بن کر
وہ تیری بزم ہو یا تیری جلوہ گاہ سے دور

یہ اجنبی سے تعارف یہ اجنبی سے لوگ
یہ سلسلے ہیں بہت قربتوں کی راہ سے دور

جنہوں نے رات کی تنہائیوں سے پیار کیا
وہ لوگ رہتے ہیں شاید تری نگاہ سے دور

وہ چند اشک جو پلکوں پہ بھی ٹھہر نہ سکے
چمک رہے ہیں ستاروں کی شاہراہ سے دور

فسانہ رات کا رہنے دے اے غمِ جاناں
یہ واقعات ہیں دل کی بھی دستگاہ سے دور

○

تخلیقِ کائنات کا مطلب سمجھ گئے
تیرے تکلفات کا مطلب سمجھ گئے

احباب کر رہے ہیں بڑی چارہ سازیاں
شاید طویل رات کا مطلب سمجھ گئے

ہم چل رہے ہیں تیرے ارادوں کے ساتھ ساتھ
مجبوریٔ حیات کا مطلب سمجھ گئے

شاید کہ ہم نباہ کے لائق نہیں رہے
ترکِ تعلقات کا مطلب سمجھ گئے

اے دوست نیتوں کے تقاضے کچھ اور ہیں
اس رنگِ التفات کا مطلب سمجھ گئے

دامِ خیال

(۱۰ افسانے)

افتخار رضوی
جمیل الزمان
حفیظ احسن
سلیم اختر
عاصی کرنالی
عبداللہ شمشاد
عرش صدیقی
مقصود زاہدی

افتخار رضوی

اِس حمام میں

موجو کے بھنگڑ خانے کا دروازہ یوں تو دن ڈھلے سے رات کے بھیگنے تک مسلسل بڑی خاموشی سے کھلتا اور بند ہوتا رہتا تھا۔ مگر آج جب جعفر داخل ہوا تو اس نے دروازے کو اتنی زور سے کھولا کہ بوسیدہ کواڑوں کی چولیں چیخ اٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو سارے بھنگڑ خانے میں طوفان آگیا۔ ہر چیز اپنی جگہ کانپ اٹھی۔ اندر بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھنے لگے۔ جیسے وہ پوچھ رہے ہوں یہ کیسی آواز تھی۔

کونے میں بیٹھے ہوئے کلوا، گلابی، شفیعہ جو سیپ کھیل رہے تھے۔ بالکل سہم ہی گئے۔ گلابی اور شفیعہ تو اپنے اپنے تاش پھٹی ہوئی چٹائی کے نیچے چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگے اور کلوا کا وہ ہاتھ جو پتا پٹکنے کے لیے اوپر اٹھا تھا وہیں کا وہیں رکا ہوا تھا۔ البتہ تاش کا پتہ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ سے اس طرح نیچے گرا۔ جیسے کسی شاخ سے سوکھا ہوا پتا جدا ہو کر گرتا ہے۔ موجو کے بڑے تیزی سے گھومنے والے سونٹے کے سرے پر جڑے ہوئے پیتل کے گھنگروں کی جھنکار بھی یک بیک تھم گئی۔ اور وہ دروازے کی طرف کچھ ایسی پیلی پیلی آنکھوں سے دیکھنے لگا کہ اگر وہ ان کو اور پھیلاتا تو حلقوں میں سے ڈھیلے نکل کر اس کے سامنے رکھی ہوئی اس کونڈی میں جا گرتے۔ جس میں گاڑھی گاڑھی بھنگ باوجود سونٹا رک جانے کے تیزی سے گھوم رہی تھی۔ چھت کی سیاہ اور خمیدہ لکڑیوں میں ٹنگے ہوئے باریک باریک تیلیوں والے پنجرے میں سوئے ہوئے بٹیروں نے بھی اپنی اپنی گردنیں پروں میں سے نکال کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر سو گئے۔

جعفر کھلے ہوئے کواڑوں کے درمیان سینہ نکالے کولھوں پر دونوں ہاتھ رکھے ٹانگوں کو قدرے پھیلائے ہوئے یوں کھڑا ہوا تھا۔ جیسے وہ ابھی ابھی جیب سے پستول نکال کر گرجدار آواز میں کہے گا۔ "تمہاری جیبوں میں جو کچھ ہے، مجھے دے دو۔" جعفر گلابی رنگ کے بڈی ہملٹن کا کرتا اور اسی رنگ کی پاپلین کی شلوار پہنے ہوئے تھا۔ شلوار سے جو کپڑا بچا تھا اس نے اس کا رومال سلوا کر گلے میں باندھ لیا تھا۔ اور کرتے سے بچے ہوئے کپڑے کی ٹوپی سلوا کر سر کے آدھے حصے پر اس احتیاط سے منڈھ لی تھی کہ سامنے کے بال بدستور ماتھے پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کا سیاہ جوتا کوٹھری میں جلتے ہوئے دیئے کی روشنی سے دمک رہا تھا۔ اور دیئے کی وہ لو جو تلک جیسی سیدھی تھی۔ اس کے بوٹ کی ٹو میں صاف نظر آ رہی تھی۔ دروازے کی طرف دیکھ کر یہ تو سب کو اطمینان ہو گیا تھا۔ کہ آنے والا کوئی اور نہیں اپنا جعفر ہی ہے۔ مگر اب بھی وہ آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کر رہے تھے۔ "اس کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ اس طرح کیوں آیا ہے۔ جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ اور اب یوں اکڑا ہوا کیوں کھڑا ہے جیسے مال روڈ پر عجائب گھر کے سامنے کسی انگریز کا بت کھڑا ہو۔"

"اگر نئے کپڑوں کی بات ہے تو شاید زندگی میں ایک آدھ بار ہم نے بھی پہنے ہوں گے۔ ہم تو موجو کے بھٹیار خانے میں جب بھی آئے سر جھکائے ہوئے ہی آئے ہوں گے۔" اگر نورا کو منھ میں رکے ہوئے تمباکو کے دھوئیں کے گھونٹ سے پھندا نہ لگتا جو اس نے کواڑوں کی چیخ سن کر حلق سے اتارتے اتارتے روک لیا تھا تو شاید خوف و حیرت میں کھوئے ہوئے یہ لوگ کچھ دیر اور کھوئے رہتے۔ مگر نورا کی کھانسی نے سب کی توجہ اپنی طرف کر لی۔ جعفر اب بھی اسی طرح کھڑا ہوا اپنی چھوٹی چھوٹی گھٹی ہوئی مونچھوں پر بل چڑھا رہا تھا۔ جو بالکل ان سبز مرچوں کی طرح تھیں جنہیں پالے نے کالا کر دیا ہو۔

جب نورا کی کھانسی رکی تو موجو نے سونٹے کو دوبارہ کونڈی میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "جا پھر اب دروازہ بند کر کے ایک طرف کو بیٹھ بھی جا۔ دیکھ نہیں رہا ہے ہوا سے دیئے کی لو کانپ رہی ہے۔"

جعفر نے کھڑے کھڑے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے دروازے کو ایک جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ اور ساتھ ہی چٹائی کے ایک ٹکڑے پر آگے کی طرف پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک پڑیا نکالی۔ اور موجو کی طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "چچا اس میں بادام کی گری مصری اور دو چار الائچیاں ہیں۔ چار آنے کی بوٹی ملا کر ٹھنڈائی تو بنا دے۔ ہاں مگر بوٹی خوب باریک رگڑی ہوئی ہو۔ اور لاگ والی

نہ ہو تو مجا آئے گا۔ چائے کی پتی کی طرح اوپر تیرتی ہوئی نہ ہو۔ موجو نے پڑیا کو کونڈی میں الٹتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔ "ابھی تیرے چاچا کے ڈوڈوں میں، اتنا دم ہے کہ اس کے سونٹے کے تلے بوٹی تو کیا پتھر بھی آ جائے تو کسم ہے حجرت علی کی سرمہ ہو جائے سرا۔ مگر ہاں ایک بات تو بتا آج تو بڑی موج میں ہے۔ کدھر کی تیاریاں ہیں۔ اس سان وسوکت سے۔ معلوم ہوت ہے دھندا کھوب چل رہا ہے تیرا۔"

جعفر کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا۔ کلوا اپنی جگہ سے چرس کا بھرا ہوا آدھا سگریٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "چاچا اسے کیا پوچھے ہے اس کی مستی کا راج۔ آج جے رانی جی کے سائے کی طرح کیوں اکڑے ہے۔ جے ہم سے پوچھ ہم نے اس کی کسمت کا پھاٹک کھول دیا ہے چاچا۔ اس کے ہاتھ ایک بڑی کراری چھوکری کا سودا کیا ہے اب کمائی ہی کمائی ہے۔ عیس کرے گا میرا پٹھا عیس۔"

جعفر نے چرس کے سگریٹ کا لمبا سا کش لگا کر نیلا نیلا دھواں کلوا کی طرف ایک لکیر کی شکل میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "احسان تو توں جتا رہا ہے۔ جیسے چھوکری بھری دے گیا ہو۔ تو نے کراری سی چھوکری دی ہے تو سالے ہم نے بھی پانچ کرارے کرارے نوٹ قائد اعظم کی تصویر والے دیئے ہیں۔" کلوا نے جعفر کے قریب سرکتے ہوئے اپنے کان سے آدھ جلی بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے کہا "یار تو تو ناراج ہو گیا۔ میں تو مجاک کر رہا تھا۔ میں تو سالی سے تنگ آیا ہوا تھا۔ پیچ دی بڑی نکمی چھوکری ہے خیال رکھیو سنا ہے دس جماعت پاس ہے تعلیم یافتہ ہے۔"

جعفر نے مونچھوں پر بل چڑھاتے ہوئے کہا "تو جانے کلوا میرا نام، جا پھر بے جا پھر سالی جاستی نخرے کرے گی تو یاد دلا دے بیل تدری گرا دوں گا۔ ہوس آ جائیں گے تعلیم یافتہ کو۔"

موجو جو ابھی تک سونٹا کونڈی میں ڈالے اور اس کے گھنگروں والے سرے پر ٹھوڑی ٹکائے کلوا اور جعفر کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا پل بندی کا نام سن کر جھرجھری سی لے کر بولا۔ "نا بھیا وہ چھوکری ہے، چرس کا سگریٹ تو نہیں ہے۔ جو باری باری ساری محفل والے سوٹا لگائیں۔" موجو اپنی بات پوری بھی کرنے نہ پایا تھا۔ جعفر بولا۔ "چاچا تو کیا سن رہا ہے ہماری باتیں تو اپنا کام کر جلدی سے ٹھنڈائی رگڑ دے۔ مجھے جروری کام سے جانا ہے۔"

موجو کو یوں بات کا کاٹنا برا معلوم ہوا۔ اس نے جھنجلاہٹ کے ساتھ قریب رکھی ہوئی اس کنارہ ٹوٹی ہانڈی کو جس کے گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ اور قریب کرتے ہوئے مٹھی بھر بھنگ کونڈی

میں ڈالی اور پانی کا چھینٹا دے کر یا علی کا نعرہ لگایا، سونٹا کونڈی میں بڑی تیزی سے گھومنے لگا۔ سونٹا جتنی تیز ہوتا جاتا اتنی ہی تیزی سے اس کا بڑے بڑے بالوں والا سر بھی گھوم رہا تھا۔ پیتل کے گھنگروں سے اور اس کے سیاہ ہاتھوں میں کہنی تک پہنے ہوئے رنگ برنگے موٹے موٹے کانچ کے کڑوں سے مل کر ایک ایسی جھنکار پیدا ہو رہی تھی جس کا شاید فن موسیقی میں کوئی بھی نام نہیں اور اسی بے نام سی موسیقی پر بھنگڑ خانے کا ہر فرد جھوم رہا تھا۔ نورا نے تو کھڑے ہو کر ناچنا شروع کر دیا۔ اس نے گھنگروں اور کانچ کے کڑوں کی جھنکار سے پاؤں ملاتے ہوئے نعرہ لگایا۔ "واہ چاچا — بھنگ میں رنگ تیرے دم سے" موجو نے اپنی گردن اس کی طرف گھماتے ہوئے سر کو تھوڑا سا خم کیا جیسے وہ شکریہ ادا کر رہا ہو۔ موجو کے ہاتھ اور سر دونوں تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔

جب موجو کا پسینہ کونڈی میں ٹپک ٹپک کر پانی کی کمی کو پورا کرنے لگا۔ اور تیزی سے گھومنے والے اس کے بڑے بڑے پھٹکے پلنے لگے تو جعفر نے کہا چاچا اب رہنے بھی دے خوب گھٹ گئی۔

ادھر موجو کا سونٹا رکا تو ادھر نورا بھی یا علی مست قلندر کا نعرہ لگاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

جعفر نے بوٹ سے اس مٹی کو برابر کرتے ہوئے جو کو اڑوں نے فرش سے چھیل کر ایک طرف کو اکٹھی کر دی تھی۔ کہا "چاچا دو پیالے کر دے کلوا بھی پئے گا۔"

کلوا چونک پڑا "نہیں یار یہ نہیں پیوں گا۔ تو پی مجھے تو پہلے ہی بے حوس کئے لیتے ہیں۔" پھر اس نے اس کی ران پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ہاں یار ایک بات تو بتا۔ کوئی سودا بھی بنا تیرا۔ یا دن کھائی جا رہے ہیں۔" جعفر ران کو سہلاتے ہوئے بولا "ابھی میں نے کوشش ہی کی ہے اور آج تو میرا اپنا کھیل ہے برتنے کا۔"

کلوا یوں مسکرا دیا جیسے جعفر نے کوئی بڑی نادانی کی بات کی ہے۔ اس نے ایک آنکھ کو آدھا بند کرتے ہوئے کہا "ابے بے کوف وہ تو تیرے گھڑے میں پلی ہوئی مچھلی ہے۔ جب جی چاہے باہر نکال کر تماشہ دیکھ لیجو۔ پہلے کمائی کی سوچ" پھر اور قریب ہوتے ہوئے کہا "ایک تماس بین کل سے نوٹ کا بٹا جیب میں ڈالے میرے پیچھے پھر رہا ہے۔ اگر کہے تو کرا دوں سودا۔" جعفر نے آہستہ سے کہا۔ "اچھا تیری مرضی۔"

کلوا اٹھتے ہوئے بولا "اچھا تو بوٹی پی کر گھر پہنچ چھوکری تیار رکھیں اسے لے کر آیا جعفر کے

پکارتے پکارتے کلوا آہستہ سے دروازہ کھول کر گلی میں غائب ہو گیا۔ اس نے موجو کے بیلے کہتے میں پھینی ہوئی بھنگ جلدی جلدی پی اور کھڑے ہوتے ہوئے سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا "اچھا یارو پھر ملاقات ہوگی۔ اگر جنید تی رہی۔۔۔۔۔۔۔"

جعفر جب اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس کی جوان بہن دلاری دوڑتی ہوئی اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی پھر اس نے اور نزدیک ہو کر اس کے گلے میں بندھے ہوئے رومال کی گانٹھ کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا "بھیا ایک بات کہوں"

جعفر گرجا "ایک۔ نہیں تو دس باتیں کر مگر مجھ سے دور رہا کر کمبخت انگیٹھی کی طرح تپ رہی ہے۔ کوئی ملتا بھی نہیں جو تیا پانچا کردوں۔ جا اوپر جا کے رضیہ سے کہہ پانچ منٹ میں تیار ہو جائے میرے ساتھ سیر کو جانا ہے"

جب پانچ منٹ کی جگہ دس منٹ گزر گئے تو جعفر آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھری کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اندر سے رضیہ کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی میں تم سے کہہ چکی ہوں نہیں جاؤں گی۔ میں اس سیر کا مطلب خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے پچھلے دو ماہ میں سینکڑوں بار سیر کرائی گئی ہے۔ اب تو اس زمانے کے لیئے میں خود ایک سیرگاہ بن کر رہ گئی ہوں۔ میں ایک ایسی سڑک کی مثل ہوں جس پر سے ہر وہ شخص گزر سکتا ہے جو اس کے نگہبان کی مٹھی گرم کر سکے۔ میرا وجود لائبریری کی کتاب جیسا ہے۔ جو ہاتھوں ہاتھ گھوم کر میلی ہو رہی ہے اس دنیا نے مجھ سے سب رشتے چھین لیئے میں نہ کسی کی بیٹی ہوں، نہ بیوی، نہ بہن، نہ ماں صرف جسم ہوں۔ اور یہ جسم بھی لوگوں کے لیئے پیاز کی گانٹھ جیسا ہے۔ جس کے ورق ایک کر کے سر بازار اتار لیئے جا رہے ہیں"

پھر اس نے دلاری کو اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا "تم بھی تو حسین ہو، جوان ہو، تمہارا بھیا تمہیں سیر کرانے کیوں نہیں لے جاتا ؟"

آخری جملے کا ایک ایک لفظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح جعفر کے کانوں میں اتر گیا اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے سامنے دلاری کو ننگا کر دیا ہو۔ اس کے جسم کے اندر کوئی چیز چھناک سے ساتھ ٹوٹ گئی ہے۔ اس نے پوری طاقت سے بند کواڑوں پر لات ماری دونوں پٹ ایک مہیب چیخ کے ساتھ کھل گئے۔ وہ گرتے گرتے سنبھلا، اور لپک کر رضیہ کا گلا اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے

لیا وہ اس کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گرجائے۔ کیا بک رہی تھی حرام جادی" رضیہ نے گردن کو اور آگے بڑھاتے ہوئے چہرہ کو اوپر کی طرف اٹھا کر کہا "خدا کے لئے مجھے مار ڈال یہ زندگی مجھے نہیں چاہیئے۔ جس میں میں تاش کے پتوں پر چھپی ہوئی اس ننگی تصویر کی طرح ہوں جو کبھی اس کے ہاتھ ہے تو کبھی اُس کے ساتھ۔"

جعفر چاہتا تھا کہ وہ رضیہ کا گلا دبا دے مگر وہ خود بھی حیران تھا کہ اس کے ہاتھوں کی طاقت کہاں چلی گئی۔ اس نے پورے جسم کی طاقت انگلیوں میں سمیٹ کر اس کا گلا دبا دینا چاہا۔ مگر پھر بھی اسے اپنی گرفت ڈھیلی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ اور بولا "کمینی کی بچی میں نے تجھے پانچ سو روپے میں خریدا ہے۔ تجھے مار ڈالوں تو تیری کھال پانچ روپے میں بھی نہیں بکے گی۔ میری رقم تو جبھی تک ہے جب تک تو زندہ ہے۔"

دُلاری جو بت بنی تماشہ دیکھ رہی تھی باوجود کوشش کرنے کے کچھ نہ سمجھ سکی۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ باہر جانے لگی۔

جعفر نے دلاری کی طرف مڑتے ہوئے کہا "اب کہاں جا رہی ہے۔ اسے برقعہ لاکے پہنا" وہ بغیر جواب دیئے باہر نکل گئی۔ اور جب برقعہ لے کر اندر آئی۔ تو اس نے کہا "تجھے کوئی باہر بلا رہا ہے" جعفر بولا "اور کون ہوگا کلو ہوگا۔ تو اسے برقعہ پہنا" اور وہ بالکل ساکت اور خاموش کھڑی ہوئی رضیہ کو برقعہ پہنانے لگی۔ جیسے کسی کپڑے کی بہت بڑی دکان پر شوکیس میں کھڑے ہوئے ماڈل کو سجایا جا رہا ہے۔ اس میں اگر زندگی کا کوئی ثبوت تھا تو صرف یہ کہ اس کی آنکھوں سے نکل کر شفاف اور چکنے رخساروں پر سے پھسل کر سینے کے ابھار کی طرف یوں ڈھلک رہے تھے جیسے کسی مندر میں رکھی ہوئی سنگ مرمر کی مورتی کو گنگا جل سے اشنان کرایا جا رہا ہو۔ اور بکھرے ہوئے پانی کے قطرے آہستہ آہستہ نیچے کی طرف پھسل رہے ہوں۔ دلاری بھی رضیہ کے آنسو دیکھ کر رو پڑی۔ وہ اسے پوچھنا چاہتی تھی۔ "وہ بھیا تمہیں کہاں لئے جا رہا ہے۔ یہ پانچ سو روپے کا کیا ذکر تھا" مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز رندھ گئی۔ اور وہ کچی دیوار کی طرح نزدیک بچھی ہوئی ٹوٹی چارپائی پر دھم سے گر گئی۔

جعفر جو نظریں نیچی کئے بوٹ کی نوک سے کچے فرش پر لائن کھینچ رہا تھا۔ ایک دم چونک پڑا۔ اس نے آنسوؤں سے تر رضیہ کے چہرے کو دیکھا۔ پھر چارپائی پر میلی چادر میں منہ چھپائے روتی ہوئی

دلاری پر نظر ڈالی۔ اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دونوں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پھر وہ باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف لپکا۔ ابھی وہ دو ہی قدم آگے بڑھا تھا نیچے سے کلوا کی آواز آئی۔ وہ ایک لمحے کے لئے رکا۔ اس نے سر سے ٹوپی اتار کر اپنی آنکھوں کو نفرت سے رگڑتے ہوئے کہا "ہٹ تیرے کی نہ جانے کیا پڑ گیا سالیوں میں۔ پھر وہ رضیہ کی طرف تیزی سے مڑا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نیچے اتر گیا۔

دلاری ٹوٹی چارپائی پر لیٹے لیٹے چلائی "بھیا میں بھی سیر کو چلوں گی۔ میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں تم انہیں کہاں لئے جا رہے ہو"۔

جعفر نے دلاری کی آواز سنی مگر اس کے قدم بجائے رکنے کے اور تیز ہو گئے۔ جب وہ گلی میں داخل ہوا تو گلی کے موڑ پر کالی اور لمبی سی ایک کار کھڑی تھی۔ جس کے پاس ہی کلوا ایک ٹھنگنے سے خوش پوش آدمی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ جسے وہ سیٹھ کہتا تھا۔ کلوا نے جب جعفر اور رضیہ کو آتے ہوئے دیکھا تو وہ سیٹھ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جواب میں وہ بھی مسکرا دیا۔ جب جعفر اور رضیہ ان کے قریب پہنچے تو سیٹھ نے آگے بڑھ کار کی اگلی نشست والا دروازہ کھول دیا۔ جعفر نے ایک جھٹکے کے ساتھ رضیہ کو کار میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ سیٹھ کار کے سامنے سے گھوم کر دوسری طرف آ گیا۔ اور اسٹیرنگ والی نشست کا دروازہ کھول کر رضیہ کے برابر بیٹھ گیا۔ جب پچھلی نشستوں پر جعفر اور کلوا بھی بیٹھ گئے تو اس نے کار کی چھت والی بتی جلاتے ہوئے پیچھے کی طرف مڑ کر بازاری انداز میں کہا "ان کا دیدار تو ہو جائے ذرا"۔ جعفر تو خاموش رہا۔ مگر کلوا پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے بولا "سیٹھ صاحب گریب کی گدڑی سے ہمیشہ لال ہی نکلتا ہے۔ دو ماہ یہ چھوکری آپ کے اس کھدمت گار کے ہاتوں بھی بیتی رہی ہے اب جا پھر کو دیدی ہے جے بھی تو اپنا یار ہے" پھر وہ اگلی نشست کی طرف جھکا اس نے رضیہ کے چہرے سے ایک لمحے کے لئے نقاب اٹھی اور یہ کہتے ہوئے ڈھک دی۔ "نئی نئی چھوکری ہے سرماتی ہے حجور"۔

سیٹھ جو رضیہ کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ نقاب اٹھتے ہی ایسی مسکراہٹ مسکرایا جس میں ریاکاری بھی تھی اور بازاری پن بھی وہ بولا "یہ تو روسی ہے۔ شاید نیا پنچھی ہے" یہ کہہ کر اس نے موٹر اسٹارٹ کر دی۔ انجن نوگرفتہ پنچھی کی طرح پھڑ پھڑایا۔ گاڑی پہلے آہستہ آہستہ رینگی

پھر بھاگنے لگی۔

کلوا نے جعفر کی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "کیا بات ہے آج میرا سیر کھاموس کیوں ہے"۔ جعفر چونک پڑا اور اس کے ہونٹوں پر کچھ ایسی مسکراہٹ بکھر گئی جس کو دیکھ کر کلوا بولا "یار کوئی بات ضرور ہے تو پہلے تو کبھی یوں نہیں مسکرایا۔ جیسے آج مسکرا رہا ہے"۔ "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں یونہی تجھے سیا ہو گیا ہے"۔ جعفر بولا۔

کار ایک بہت خوبصورت سی کوٹھی کے باہر سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ کار سے اتر کر کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ جعفر اور کلوا بھی نیچے اتر آئے۔ اور ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر بیڑی پینے لگے۔ سیٹھ ایک اور آدمی کے ساتھ کوٹھی سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ منہ میں سگار تھا۔ اور جسم پر شب خوابی کا لباس وہ دونوں سیدھے کار کے پاس آئے۔ سیٹھ نے آگے بڑھ کر رضیہ کی سمت والا دروازہ کھول کر اس کے چہرے سے نقاب الٹ دی۔ سفید سر والے آدمی نے رضیہ کے چہرے کی طرف تھوڑا سا جھک کر دیکھا پھر منہ سے سگار نکال کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے اندر بھیج دو"۔ یہ کہہ کر جب وہ واپس جانے کے لئے مڑا تو سیٹھ نے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے پوچھا "حضور میرا کام" اس نے چلتے چلتے پھر سگار کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "کل صبح دفتر آ جانا ٹھیکا تمہیں مل جائے گا"۔ اور باوقار انداز میں قدم اٹھاتا ہوا کوٹھی میں چلا گیا۔

کلوا اور جعفر بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ سفید بالوں والے آدمی کے واپس جاتے ہی جعفر کی اداسی یک بیک اس کے چہرے سے غائب ہو گئی۔ اس کے اعضاء میں پھر سے سختی آ گئی۔ اس کا سینہ تن گیا۔ ٹانگوں کو اس نے ایسے زاویے سے پھیلایا کہ اردو کے آٹھ بن گئے۔ ایک ہاتھ اس نے کمر پر ٹکایا اور دوسرے ہاتھ سے جلتی ہوئی بیڑی کو سڑک پر زور سے ٹپک، خالی ہاتھ سے مونچھوں پر بل چڑھانے لگا.....!

سیٹھ اس کے قریب آیا تو وہ اور اکڑ گیا۔ جب اس نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر جعفر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سب کچھ ٹھیک ہے۔ لڑکی کو اندر بھیج دو"۔ تو اس نے نوٹ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "سیٹھ تم بھی یہ کام کرتے ہو؟" سیٹھ کچھ تو سوال سے کچھ جعفر کی آنکھوں سے

گِڑگڑاتے ہوئے بولی۔ "نہیں، نہیں میں تو بڑا ٹھیکیدار ہوں یہ ہمارے بڑے صاحب ہیں۔ ان سے مجھے ٹھیکہ لینا ہے۔" جعفر نے قہقہہ لگاتے ہوئے اور نوٹ اس کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "سیٹھ میں نے یہ کاروبار چھوڑ دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور کار کا دروازہ کھول کر رضیہ کو نیچے اتار لیا۔

سیٹھ جعفر کی طرف لپکا۔ مگر جعفر کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا اور وہ کہہ رہا تھا "چلا جا یہاں سے سیٹھ کے بچے ورنہ میرے چاقو کی کاٹ سارے شہر میں مشہور ہے۔" کار آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی جا رہی تھی۔ پچھلی سرخ بتی کی طرف جعفر نے سینہ تان کر دیکھا اور ایک پاؤں زمین پر پوری طاقت سے پٹکتے ہوئے کہا "ولّاہ"

رضیہ چہرے سے نقاب اُلٹے اور کلو منھ چھپائے جعفر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر رضیہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آؤ رجیا بہن گھر چلیں۔"

کلو دونوں کو جاتا ہوا دیکھ کر آہستہ آہستہ بڑبڑایا۔ "سالا جاسنی پی گیا ہے۔"

ایم اے شمشاد

فالتو آدمی

جونہی میں نے بھابی کے سامنے بھیا کو چڑانے کے لئے حسینہ کا نام لیا تو بھیا نے معذرت طلب نظروں کی بجائے مجھے اس بری طرح گھورا جیسے کھا ہی جائیں گے۔ میں پہلے تو گھبرایا لیکن پھر کچھ سوچ کر بھیا کی کڑی اور تنبیہی نظروں کو یوں نظر انداز کر دیا جیسے ایک خوبصورت ننھا بچہ مجھے زور سے چانٹا مار دینے کی دھمکی دے رہا ہو۔

دراصل بھیا کی نئی نئی شادی ہوئی تھی ان کی شادی تو بہت پہلے ہو چکی ہوتی۔ لیکن وہ تعلیم کا بہانہ بنا کر متواتر ٹال مٹول کرتے چلے آئے تھے۔ اب ان میں رشتہ داروں کی لعن طعن سہنے کی شاید مزید طاقت نہ رہی تھی۔ مجبوراً انہیں امی کے جذبات اور رشتہ داروں کی رائے کا احترام کرتے ہی بن پڑی۔ وہ بھابی کو ہر وقت بغل میں دبائے کمرے میں گھسے رہتے بھابی آخر میری بھی تو کچھ لگتی تھیں میں نے بھیا کی شادی کی خوشی میں بڑے ارمانوں سے محض اس لئے بہت سی الٹی سیدھی قلابازیاں کھائی تھیں کہ اور نہیں تو باتیں کرنے کے لئے گھر میں اچھی سی بھابی تو ملیں گی۔ جو میری ناز برداریاں کریں گی اور روٹھ جاؤں گا تو دیور سمجھ کر منائیں گی اور اس طرح میرے ہاتھ ایک خوبصورت اور بھلی سی تفریح لگ جائے گی گویا میرے خیال میں بھابی ایک ایسی منی سی گڑیا تھی جسے جب چاہا کان مروڑ کر رلا دیا اور جب چاہا پاؤں میں گدگدی کر کے ہنسا دیا۔

بھیا مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔ وہ بات بھی کرتے تھے تو اس طرح کہ مجھے زبردستی خواہ مخواہ ابا میاں یاد آ جاتے تھے کبھی کبھی تو اتنی ذرا سی بات پر اس بری طرح ڈانٹ

دیتے کہ بے ساختہ جی چاہتا کہ بھیا سے ٹکریں لڑا کر اپنا ہی سر پھوڑ لوں۔ ان کے برادرانہ جذبات شاذونادر ہی سر ابھارتے تھے۔ عید شبرات کے موقعوں پر بھی مستون پیشانی سے سنجیدگی برستی رہتی۔ بچپن میں جب کبھی میں پٹاخوں اور پھلجھڑیوں کے لئے ضد کرتا تو بھیا اس بری طرح چانٹے مارتے اس بری طرح کان اینٹھتے کہ مجھے اپنے ہی وجود میں بے شمار پٹاخے چھوٹتے اور پھلجھڑیاں چلتی جان پڑتی تھیں۔

وہ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جب ہم لاہور جیل روڈ پر رہتے تھے میں نے ایک دن بھیا کو کھڑکی کی دراز سے ساتھ والے مکان میں جھانکتے دیکھ لیا اور پھر میرے دوق تجسس نے بہت جلد مجھ پر واضح کر دیا کہ بھیا سامنے والے مکان میں" ون وے ٹریفک" کی نسبت باندھ کر ایک سانولی سی لڑکی کو گھورتے ہیں اور اسی سانولی اور سونی لڑکی کا نام حسینہ تھا۔ اللہ دوسروں کو تو چھپڑ پھاڑ کر دولت دیتا ہے لیکن مجھے اس نے چھپڑ پھاڑ کر بھیا کی ایک عدد کمزوری مرحمت فرمائی تھی میں نے بھی کفران نعمت کا سزاوار نہ ہوتے ہوئے بھیا کی اس کمزوری سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا تھا اور تو اور مسلسل دھمکیاں دے کر ان سے گول گپے تک کھائے تھے۔

اس بات کو مدت گزر چکی تھی۔ بھیا کی تانک جھانک خاطر خواہ نتائج برآمد نہ کر سکی اور بھیا نے خود ہی یہ تانک جھانک بند کر دی تھی انہیں ڈر تھا کہ کہیں میں ابا سے ان کی جواب طلبی ہی نہ کرا دوں۔ بس یہی ایک موضوع ایسا تھا جہاں میں آج تک بھیا کی خشک شرافت کو حسب منشاء نچوڑتا چلا آ رہا تھا اور وہ اپنے سگرٹوں کے خرچ میں سے پیسے بچا بچا کر شادی سے پہلے تک حسب دستور مجھے گول گپے کھلانے چلے آئے تھے ورنہ صاحب تو یہ کیجئے میں پیدائشی طور پر اس جرأت رندانہ سے محروم تھا کہ جیب کو اپنا سا بنا لوں۔ اگر کبھی طبیعت نے زیادہ زور مارا تو میں بھیا کو فلاسفر کہہ کر اپنے گرم جذبات کا سرِ جواز ڈھونڈ لیا کرتا تھا۔

ویسے کبھی کبھی تو میں انہیں فلاسفر کہہ کر بھی اپنے ذہن میں کچھ ایسا خلا سا محسوس کرتا جیسے اس لفظ نے میرے جذباتی مفہوم کو مکمل طور پر واضح نہ کیا ہو۔ بھیا کچھ عجیب سے تھے شادی سے پہلے ان کی شادی سے متعلق مسلسل انکار سن کر رشتہ داروں نے انہیں عجیب تو ایک طرف عجیب و غریب تک تسلیم کر لیا تھا۔ صبح نہانے کے لئے جو بھیا نل چلانا شروع کرتے تو بس چلاتے

ہی جاتے اور پھر جب گھر والوں کے یاد دلانے پر انہیں احساس ہوتا کہ انہوں نے نل کے نیچے بالٹی تو رکھی ہی نہیں تو وہ کھسیانے سے ہو کر رہ جاتے اور پھر جو بھیا ہاتھ دھونا شروع کرتے تو مجھے گمان گزرتا کہ ان کے ہاتھ دھونے دھونے میں لائف بوائے کی پوری ٹکیہ گول ہو جائے گی اور مجھے بغیر نہائے کالج کا رخ کرنا پڑے گا میں بھیا کو منہمک انداز میں بے ساختہ ہاتھ دھوتے دیکھ کر لیڈی میکبتھ کے متعلق سوچنے لگتا تھا جو ڈنکن کے قتل کے بعد ایک حد تک پاگل سی ہو گئی تھی لیکن بھیا تو پاگل نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے لیڈی میکبتھ کی طرح کوئی بہیمانہ جرم کیا تھا اور پھر اس پہلو پر سوچتے میں خود کو پاگل سمجھنے لگتا تھا

ایم ایس سی پی ایچ ڈی کرنے کے بعد تو بھیا اور بھی خشک ہو گئے تھے اتنے خشک کہ کبھی کبھی تو میں یہ سوچنے لگتا کہ اگر تازہ لکھی ہوئی سیاہی کو خشک کرنے کے لئے سیاہی چوس کی بجائے بھیا کا چہرہ استعمال کیا جائے تو میں کم از کم چار چھ آنے فی ہفتہ بچا کر سات سال میں ذاتی سائیکل خرید سکتا ہوں نیا نہ سہی سیکنڈ ہینڈ تو مل ہی جائے گا اور اس طرح میں سائیکل کی سواری کا لطف اٹھانے کے لئے بھیا کی اس خشکی سے بچ جاؤں گا جو ہر وقت خصوصیت کے ساتھ ان کی ناک پر دھری رہتی ہے۔

میں نے بھیا کی شادی کے وقت اپنے ذہن میں ہونے والی بھابی کا بڑا خوبصورت خاکہ تشکیل کیا تھا ایسا خاکہ جس میں ہر طرح ملائمت تھی سوچا کرتا تھا کہ جب میری بھابی زمین پر ہلکے ہلکے پھول ایسے قدم اٹھا کر چلیں گی تو ڈوبتا ہوا سورج پھر سے طلوع ہو جائے گا ان کے نرم پاؤں کی چاپ سن کر ایسا جان پڑے گا جیسے جلترنگ بج رہا ہو اور جب بھابی کے آجانے پر میں نے ان کی شکل دیکھی تو وہ میرے ذہنی خاکے سے ہو بہو ملتی تھیں میں نے اپنے طور پر ان کی آواز کے متعلق کچھ نہیں سوچا تھا لیکن اب جب انہیں بولتے سنتا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے دور پر و شلم کی عبادت گاہوں میں سحر دم گھنٹیاں بج رہی ہوں ان کے لہجے میں بلا کی جاذبیت تھی جب وہ بولتیں تو بے اختیار مجھے وہ بلبل یاد آجاتی جسے میں نے بچپن میں پنجرے میں بند کر کے بڑے چاؤ سے پالا تھا۔

میں ایسی اچھی بھابی سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتا تھا ان کے کان مروڑ کر رلانا چاہتا تھا

پاؤں میں گدگدی کر کے ہنسانا چاہتا تھا لیکن بھیا کی شادی کو کئی دن گذرنے کے باوجود میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی میں نے ان سے ڈھیر سی باتیں کیں لیکن جی نہ بھرا میں انہیں ابھی تک رلا بھی نہ سکا تھا میں چاہتا تھا کہ انہیں رلاؤں ہنساؤں گدگدی کروں مگر بھیا کی خشکی آڑے آتی رہی۔

لیکن آج میں نے حوصلہ کر ہی لیا تھا اور اس موقعے کی یادداشت میں مجھے ابھی تک بھیا کی غضبیلی اور کڑی نظریں، اپنے چہرے پہ محسوس ہو رہی تھیں شروع میں تو میں بھابی کو چھیڑتا رہا ان سے باتیں کرتا رہا لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ بھیا کو میری موجودگی ناگوار گزر رہی ہے میں اس وقت بھابی کے پاس سے اٹھنا بھی نہیں چاہتا تھا جو اتنی اچھی اچھی باتیں کر رہی تھی کہ مجھے نیند سی آتی محسوس ہوئی بھیا کی خشکی کو نمودار ہوتے دیکھ کر میں نے حسینہ کا نام لے کر دبانے کی کوشش کی تھی۔

میرا خیال تھا کہ یہ نام سنتے ہی بھیا حسب دستور چپ سادھ کر رہ جائیں گے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں آج وہ روایت کے خلاف ابھی تک تلملا رہے تھے میں نے ان نظروں کو بالکل نظر انداز کر دیا لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا جیسے باتیں کرتے کرتے اچانک بھابی کی آواز لڑکھڑا گئی ہو۔ بھیا نے مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دیئے بغیر کمرے سے باہر نکال دیا۔

میں رات گئے تک بھابی کے متعلق سوچتا رہا مجھے خود سے نفرت سی ہو گئی آخر مجھے بھابی کے سامنے حسینہ کا نام لینے کی ضرورت ہی کیا تھی وہ کیا سمجھ رہی ہوں گی۔ میں خود کو کوستا ہوا بستر پر لیٹ گیا کمرے کی بے پناہ تاریکی میں مدھم مدھم روشنی کے ہیولے سے دھبے ناچتے معلوم دے رہے تھے پھر مختلف سمتوں میں ناچتے ہوئے روشنی کے یہ دھبے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

"بھابی ——"

میری سرگوشی سارے کمرے میں گونج کر پھیل گئی دھبے پیدا ہوتے رہے مٹتے رہے اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتے رہے۔

دوسری صبح بھابی کی اڑی اڑی سی رنگت دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں میں ان سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہ کر سکا میرے ذہن میں پنہاں چور نے میری نظروں کو جھکا رکھا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔

آہستہ آہستہ بھابی خود ہی مجھ سے بولنے لگیں مجھ سے ہنسیں، کھیلیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بھابی حسینہ والی بات بالکل بھول چکی ہوں میں لمحاتی طور پر مطمئن ہو جاتا لیکن باتیں کرتے کرتے اچانک بھابی کھوسی جاتیں اور حسینہ ایک ناقابل برداشت پھانس بن کر میرے دل و دماغ میں چبھنے لگتی اس وقت میں بھابی سے نظریں چرا کر بھیا کی طرف دیکھتا وہ اپنی ہی دھن میں مگن ہاتھوں کو بے تحاشا دھوئے جا رہے ہوتے پتہ نہیں ان کے ہاتھوں کو کونسی غلاظت لگی تھی ان کے ہاتھوں نے ایسا کونسا ناقابل معافی جرم کیا تھا؟

اور پھر احساس جرم مجھ پر بری طرح غالب آگیا۔ رات کے تقریباً ۱۱ بج رہے تھے میرا ضمیر مجھے مسلسل کچوکے لگا رہا تھا مجھ میں یہ کچوکے برداشت کرنے کی اب مزید سکت نہ رہی تھی بے اختیار میرا دل چاہا کہ ابھی جاؤں اور حسینہ کے بارے میں کوئی یونہی سی بات بنا کر بھابی کے تمام شکوک رفع کر دوں میں نے نیم وا دروازے میں سے جھانک کر دیکھا بھیا ایک چارپائی پر بے سدھ سو رہے تھے اور دوسری چارپائی پر نیم دراز بھابی کوئی ناول پڑھ رہی تھیں ان کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔ انہوں نے پڑھتے پڑھتے ناول سے نظریں اٹھا کر خراٹے لیتے ہوئے بھیا کی طرف دیکھا اور پھر بھابی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ گیا میں اندر جانے کی جرأت نہ کر سکا اور نڈھال سا اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

بھابی کا چہرہ ہر وقت اتر ا رہنے لگا تھا ان کے لہجے کی شیرینی تلخی میں بدل گئی تھی وہ ہر بات پر بھیا کی مخالفت کرتیں جیسے کوئی بہت بڑا اخلاقی فریضہ سر انجام دے رہی ہوں بھابی سے متعلق بھیا کے رویہ میں خلاف معمول انکساری آگئی تھی وہ ہر طرح ان کا خیال رکھتے لیکن بھابی انہیں خاطر میں ہی نہ لاتی تھیں بھیا بڑے چاؤ سے بھابی کے لئے اچھی اچھی چیزیں لاتے مگر بھابی منہ پھلا کر انہیں جھٹک دیتیں بھابی کا مزاج بے حد چڑچڑا ہو گیا تھا وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ گھر والوں سے الگ تھلگ تنہائی میں گزارنے لگی تھیں۔

بھائی کے رویے اور بات بات پر بھیا سے تکرار نے مجھے پاگل بنا دیا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری زبان کی اتنی ذرا سی لغزش بھابی اور بھیا کے تعلقات پر اس بری طرح اثر انداز

ہو سکتی ہے میں بھابی کے اس مزاج کو دیکھتا اور دل مسوس کر رہ جاتا بھابی کی ہر وقت کی پریشانی میرے دل و دماغ پر مسلط رہنے لگی میں خود پیدا کردہ تلخی کو دور کرنے کے مناسب موقعہ محل کی تاک میں انگاروں پر لوٹنے لگا لیکن وقت کے تیز دھارے کے ساتھ ساتھ بھابی کا وجود ایک دہکتا ہوا انگارہ بن گیا اس انگارے کی تیز آنچ میرے جسم کو جلائے جا رہی تھی مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے بھابی کی اڑی اڑی سی رنگت اور ان کی آنکھوں میں مرجھائی ہوئی زردی نما سرخی کے ڈورے دیکھ کر میرا دماغ پگھلا جا رہا ہو کبھی کبھی جب میں اچانک بھابی کو اپنے سامنے دیکھ لیتا تو میرے دل و دماغ میں بہت سی چیونٹیاں بیک وقت کاٹتی ہوئی دوڑ جاتیں اور میرا وجود ایک دکھتا ہوا کچا پھوڑا بن جاتا میں اپنے طور پر اس پھوڑے کی اذیت سہنے کا متحمل تھا لیکن اس پھوڑے کی گہرائیوں میں بھابی ابلا ہوا نمک آلود گرم پانی بن کر ہر وقت دوڑتی رہتیں کاش میں بھابی کو سمجھا سکتا۔ کاش میں خود سمجھ سکتا ۔ ؟

میں نے کئی دفعہ مناسب موقع پا کر بھابی کے شکوک رفع کر دینے کا ارادہ کیا لیکن ہر بار مجھے اپنا عزم متزلزل نظر آتا تھا تنہائی میں جب کبھی بھابی میرے سامنے آتیں تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے میں آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہوں اور میرا آتش فشاں پہاڑ اور اس کے دہانے سے ابلتے ہوئے لاوے کے تصور سے ہی میرا وجود کانپ جاتا میرے قدموں کے نیچے پختہ فرش میں تھرتھری سی دوڑ جاتی اور میں کسی شکست خوردہ انسان کی مانند نظریں جھکائے بوجھل قدموں سے اپنے وجود کو دھکیلتا ہوا نکل جاتا پتہ نہیں اب میں بھابی کے تصور ہی سے کیوں خوف کھانے لگا تھا مجھے ڈر تھا کہ بھابی سے بات کرنے پر کہیں وہ مجھے بھیا ہی کی طرح شرمسار نہ کر دیں جب میں اپنے طور پر بھابی سے متعلق خوف کا جواز ڈھونڈنے کی کوشش کرتا تو مجھے تصور میں خود اپنی زبان نظر آنے لگتی ۔ کاش! میں بھابی کے سامنے حسینہ کا نام لینے سے پہلے ہی اپنی زبان کو لگام دے سکا ہوتا

بھابی ــــــــ بھابی

بھابی کی دگرگوں حالت ہر وقت مجھے پریشان کئے رہتی ۔ میرا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرتا میرے مضطرب جذبات کی واضح علامت بن چکا تھا وہ اطمینان مسرت اور سکون جو میں نے

بھابی کے تصور سے وابستہ کیا تھا میری زبان کی ذراسی غلطی سے ختم ہو چکا تھا۔

ہر طرف ہو کا سناٹا ہونے کے باوجود میرے ذہن میں خیالات کا طوفان سنسنا رہا تھا سردی بتدریج بڑھتی جارہی تھی اندھیرے لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتے جارہے تھے۔

دوسرے کمرے میں کلاک نے رات کے بارہ بجادیئے میں اپنے بستر پر کروٹ بدل کر رہ گیا بھابی سے متعلق میری سوچ تشویش میں بدل چکی تھی سوچتے سوچتے مجھے بھیا پر رحم آنے لگا۔ میرے ذہن میں بھیا کا کبھی تو کسی کام کو نہ کرنا اور کبھی اضطرابی طور پر بے تحاشا کرتے ہی جانا ابھر آیا اندھیرے اور بھی گہرے ہو گئے میری آنکھوں میں نیند زور کر آئی بھابی کے متعلق سوچتے سوچتے میرا ذہن الٹ پلٹ ہو گیا اس الٹ پلٹ میں مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرا دل ڈوبتا جارہا ہو۔

اس عالم میں نہ جانے مجھے کب نیند آگئی خواب میں مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے بھابی کا اداس چہرہ مجھے گھور رہا ہو۔

بھابی ——" میں انہیں دیکھتے ہی بے اختیار پکار اٹھا۔

بھابی اداس نظروں سے مجھے دیکھتی رہیں میں بھی چند لمحے انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر بے اختیار میرا ہاتھ ان کی انگلیاں چٹخانے اور انہیں گدگدانے لگا بھابی ذراسی تلملائیں، لیکن آہستہ آہستہ ان کے شکوہ نما ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی ان کا چہرہ کسی شگفتہ پھول کی مانند نکھر گیا ان کے مسکراتے ہوئے ہونٹ کسی قدر بھلے معلوم ہو رہے تھے اور پھر ان کے سنگترے کی قاشوں ایسے ہونٹوں سے رس ٹپکنے لگا میرے ہونٹ خود بخود چینے لگے میرا سارا جسم ایک دہکتا ہوا تنور بن گیا۔

اچانک بھابی کسی پر کٹی فاختہ کی مانند میرے بازوؤں میں جھول گئیں۔ ان کی سسکیاں۔ ان کا جلتا ہوا تنفس۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرا سارا وجود کسی بوجھ سے دبا جارہا تھا۔

بھابی ——انہیں ٹٹولتے ہوئے پکارا

"ہاں اکبر—— مجھے مار ڈالو—— میری ہڈیاں پیس ڈ ——————————

اکبر ——— للہ مجھ پر رحم کرو ——— اکبر

"بھابی ———"

اکبر ———"

"لیکن ——— بھیا ———"

مونہہ —— بھیا! ——— وہ بس

بھیا۔ ہاں!! "

جمیل الزماں

تفتیش

محلہ چہار باغ جالندھر کی پولیس چوکی کے انچارج خان شجاعت علی خاں ایک سہانی صبح موضع ڈروڑی کے گولڈن ہیئر کٹنگ سیلون سے حجامت بنوانے اور نیاز ہرنی کی دکان سے حلوا پوری کھانے کے بعد مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنے تھانے میں پہنچے ، کیا دیکھتے ہیں کہ حوالدار بشن سنگھ اپنی گود میں ایک نوزائیدہ بچہ کھلا رہا ہے اور دھارام کانسٹیبل جس کی پتنی کی ۲۰ برس کی ازدواجی زندگی میں گود ہری نہ ہو پائی تھی اس کے پاس کھڑا احمقوں ایسی صورت بنا بنا کر بچے کا دل بہلانے کی کوشش کر رہا تھا خان شجاعت علی خاں کے کان کھڑے ہوئے اور انہوں نے دھارام کے سیلوٹ کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"بشن سنگھ یہ بچہ کہاں سے اٹھا لائے؟"

"جانے پوستی کی دکان کے چبوترے پر رات کو کوئی چھوڑ گیا حضور۔ سادھو چوکیدار اس کی ریں ریں سن کر ہی صبح اسے یہاں لے آیا۔"

خان شجاعت علی خاں نے ایک "نستعلیق" گالی دی اور بولے "اب اس نطفۂ ناتحقیق کے والدین کا کھوج لگاتے پھریں۔ بدبخت اگر جھک مارنے سے باز نہیں رہ سکتے تو بازاؤ شمعاں میں رام پیاری ننھی کے پاس جاکر منہ کالا کیوں نہیں کرتے۔ شریف محلوں کو کیوں نخاس بنا رہے ہیں۔"

"بڑا خوبصورت بچہ ہے مہاراج" دھارام نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

خان شجاعت علی خاں نے روتے ہوئے بچے کے خد و خال کا بنظر عمیق جائزہ لیا اور حکم دیا کہ شہر بھر میں منادی کرادی جائے کہ ہمارے پوستی کی دکان پر رات کوئی نوزائیدہ بچہ چھوڑ گیا ہے جو کوئی

اس کے والدین کو کھوج لگانے میں مدد دے گا وہ انعام پائے گا۔ دھارام کی التجا پر خان صاحب نے یہ حکم بھی صادر فرمایا کہ جب تک تحقیق مکمل نہ ہو جائے بچہ دھارام کی بیوہ نانا دیتی کی تحویل میں رہے دھارام کی باچھیں کھل گئیں اس نے "دھن مولھاراج" کا نعرہ لگا کر متالش سنگھ سے بچہ چھین لیا اور اسے کھلاتے کھلاتے اپنے گھر چل دیا۔

خان شجاعت علی خان یہ احکام دینے کے بعد اپنے دفتر میں جا پہنچے اور اس دن عدالت میں پیش ہونے والے مقدمات کے کاغذات اور نقشہ پڑتال بدمعاشان لسبتہ الف کا ملاحظہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دن بھر عدالت میں چند ایک مقدمات میں پیش ہونے اور زیادہ وقت مجبوراً عدالت میں گزارنے کے بعد خانصاحب جب شام کو تھانے واپس پہنچے تو لبش سنگھ نے رپورٹ دی کہ مسلمان محلوں میں حمید گھنٹی اور غیر مسلم محلوں میں جگت بھو کھو نوزائیدہ بچے کے متعلق منادی کر چکے ہیں۔ کئی مشتاق دید مرد اور عورتیں منادی سننے کے بعد بچے کی شکل و صورت پہچاننے دو دھارام کی بیتنی کے ہاں جا چکے تھے اور دو ایک دنوں میں کوئی نہ کوئی کھوج مل جانے کی امید ہے۔ خان شجاعت علی خان نے لبش سنگھ کی سادہ لوحی پر پنجابی زبان میں ایک فصیح و بلیغ فقرہ چست کیا اور حکم دیا کہ معراج ڈونڈی کو رات کے کھانے کے بعد اور سبی بدمعاش کو اگلی صبح ان کی خدمت میں پیش کیا جائے

حافظ قرآن معراج ڈونڈی محلہ چہار باغ کا مقبول خاص و عام نائی تھا جو گاہکوں کی شیو اور حجامت بناتے وقت انہیں شہر بھر کی خبریں مزے لے لے کر سناتا اور ان سے ایک دوسرے کے ذاتی اختلافات اور راز ہائے درون خانہ اگلواتا۔ خان شجاعت علی خان جب بھی اسے حجامت بنوانے کی اجرت پیش کرتے تو پہلے وہ "خان صاحب حضور مائی باپ ہیں۔ میں بھلا آپ سے کیسے پیسے لوں" کہتا اور پھر چپکے سے نقدی لے کر دراز میں ڈال لیتا۔ معراج وقتاً فوقتاً ان سے دبی زبان میں سفارش کر دیتا۔ خان صاحب اس سے کئی مفید اطلاعات حاصل کرتے اور کبھی کبھی اس کی بات مان لیتے۔

مغرب کی نماز کے وقت سیویوں ہی کھانا کھانے کے بعد معراج ابھی دکان بند کرنے کے متعلق سوچ رہا تھا جب اسے بشن سنگھ نے خانصاحب کا پیغام دیا تو وہ تکیہ پنج پیر میں تیجی پہلوان سے مالش کرانے کے بجائے تھانے آ پہنچا۔ خانصاحب اس وقت تھانے میں اندرونی صحن میں ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے حقہ نوش فرما رہے تھے۔ معراج نے انہیں فرشی سلام کیا اور

زمین پر بیٹھنے لگا۔ خاں صاحب نے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی بغیر بازو والی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور بولے

"آؤ بھئی معراج ادھر بیٹھو۔"

"حضور نے یاد فرمایا تھا۔ بندہ حاضرِ خدمت ہے" معراج نے ہونٹ پھیلاتے ہوئے عرض کی۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ ایسے ہی گپیں ہانکنے کو جی چاہتا تھا۔ لو حقہ پیو"

معراج نے حقے کے چند ایک کش لئے اور حقے کی نے واپس کر کے گردن اکڑاتے ہوئے بولا

"خاں صاحب اس حرامی بچے والی منادی نے سارے شہر کو چونکا دیا ہے۔ آج ہر جگہ اسی کا چرچا ہوتا رہا"

"ہاں بھئی مصیبت ہمیں آن پڑی ہے۔ نہ جانے کس الو کے پٹھے کی کرتوت ہے"

"اگر محلے میں کسی کی شرارت ہوئی تو ایک دو دن میں پتہ چل جائے گا حضور۔ آپ کی دعا سے کس کے لچھن مجھ سے چھپے ہوئے ہیں۔ چند ایک پر تو مجھے شبہ بھی ہے۔ لیکن ایسے معاملے میں الزام سے پہلے گواہی کی ضرورت ہوگی" قربِ سلطانی کے نشے میں مخمور معراج نے ٹر ہانکی۔

"یہ چھوکرے جو محلے کے چوراہے میں سرِ شام بجلی کے کھمبے کے نیچے اکٹھے ہوتے ہیں ان میں سے تو کسی پر شبہ نہیں تمہیں؟"

"یہ الّھڑ بچے ہیں حضور۔ ان کے ہاتھ پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ یہ تو لڑکیوں کی فہرستیں جیب میں لئے پھرتے ہیں اور زلفیں بنا کر انہیں سکول کالج تک چھوڑنے اور واپس لانے اور فلم لگانے گنگنانے میں ہی مست رہتے ہیں"

"مگر اکرم اور حبیب تو کل کے بچے نہیں۔ ان کا اڈا بھی تو یہی بجلی کا کھمبا ہے"

"وہ دونوں قصے تو عورتوں کے سناتے ہیں حضور اور ڈورے اک کنجوس لباطی کے شوقین لڑکے پر ڈالتے ہیں۔ پچھلے دنوں اکرم چوکا ای لڑکے کو سینما دکھانے لے گیا۔ واپسی پر دھوبیوں کی اندھیری گلی میں چاقو نکال کر بولا ــــــ "یا مجھے مار ڈالو یا حبیب دلی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا چھوڑ دو"

"اور وہ مشتاق کے چوبارے پر جو کالج کے لونڈے دھما چوکڑی مچاتے ہیں؟"

"وہ دو پہر کو برج کھیلتے ہیں حضور، اور شام کو ملیشیا کی پتلونیں پہن کر ریلوے اسٹیشن پر سنجیدہ لطیفے اور فٹ ہیں سواریاں تاڑنے چلے جاتے ہیں"۔

"یہ رتنا تو ڈپٹی کا لڑکا تو ابھی کنوارا ہے"

"جی ہاں وہ اکبر علی نال والا کسی لڑکے کو برقع پہنا کر اسے لڑکی کا جلوہ دیتا اور پھر اس سے مفت کی دودھ جلیبیاں کھاتا ہے۔ بے چارے کی بڑی بہنوں کی شادی ہو تو اس کی باری بھی آئے"۔

"کتنی بہنیں ہیں اس کی؟"

"دو۔ جنتے دائی کہتی تھی کہ ایک کا رشتہ تقریباً طے ہوگیا ہے"

"ہاں بھئی خوب یاد دلایا۔ آج کل جنتے کہاں رہتی ہے۔ کئی دنوں سے ہماری گھر والی کو ملنے نہیں آئی"۔ خان صاحب نے حقے کا ایک طویل کش لے کر اپنا اشتیاق چھپانے کی کوشش کی۔

"حضور کے ہاں ننھے بچے کی امید ہو تو حاضر ہو جناب۔ آپ نے تو جوانی ہی میں تین بچوں پر توبہ کرلی معلوم ہوتی ہے"۔

"کمسنی کی شادی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں میاں" خان صاحب کے منہ سے بے اختیار یہ بات نکل گئی۔ معراج نے خان صاحب کے ذاتی ملازم امانو سے سن رکھی تھا کہ ان کی گریجویٹ بیوی سے بہت بازی ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ اسے ان کی دکھتی رگ چھیڑنے بری ہوئی اور وہ اجازت طلب کرتے ہوئے بولا۔

"میں جنتے دائی کو اپنی بیوی کے ہاتھ سندیسہ بھجوا دوں گا حضور۔ کل شام تک وہ بیگم صاحبہ سے مل لے گی"۔

"خوش رہو معراج۔ تم بڑے کام کے آدمی ہو۔ اگر تمہیں کوئی کھوج ملے تو مجھے تو اطلاع کرنا"۔

"حضور ہنس کر بات کرنے والے افسر کے اشارے پر تو میں جان پر بھی کھیل جاتا ہوں"

معراج یہ کہہ کر کرسی سے اٹھا اور فرشی سلام کرنے کے بعد اکڑتا ہوا تھانے کے باہر نکل گیا

اگلی صبح رات کی گشت پوری کرنے کے بعد تھانے کے سپاہی نے فجر کی اذان سے کچھ پہلے جیسی

بدمعاش کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اس کی بوڑھی ماں کو خاں صاحب کا سندیسہ دیا۔ حسنی کی ماں نے پوچھا خیر تو ہے اور بیاہی کی دعائیں کیے باوجود فجر کی نماز کے بعد متواتر نفلیں پڑھتی رہی۔ جب کافی دیر پڑے شب بیدار حسنی کی آنکھ کھلی اور اسے خاں صاحب کی دعوت ملاقات کا علم ہوا تو اس نے اپنی پچھلی ملاقات کے بعد کے واقعات پر احتیاط سے غور کرنا شروع کر دیا اور تیار ہو کر تھانے روانہ ہوا حسنی میٹرک تک پڑھا ہوا تھا اور شہر بھر میں بدمعاش کے نام سے مشہور تھا۔ اگر کوئی اس کی پتنگوں والی دکان یا اکھاڑے میں چوری کا ذکر کرتا تو وہ مسکراتا اور کہتا "کسی سے بات نہ کرنا اپنے ہی آدمی تھے" اگر ڈکیتی یا مار کٹائی کا واقعہ ہو جاتا تو حسنی رازدارانہ انداز میں سرگوشی کرتا "مجھے کیا بتاتے ہو داؤ پیچ تو لڑکے مجھ سے سیکھ کر گئے تھے"۔ اس شیخی بگھارنے کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کبھی محلے کے ارد گرد کوئی سنگین واردات ہوتی تو پولیس والے حسنی کو تھانے طلب کر لیتے حسنی پولیس کے آگے بیر شہادتیں دیتا اور پھر ہفتوں میونسپل کمشنر کے بیٹے کے اڈے پر تھانیدار سے تعلقات اور حوالات میں نظربند ملزموں کے قصے سناتا۔

تھانے پہنچتے ہی حسنی کی حوالدار کشن سنگھ سے ملاقات ہو گئی اور وہ اسے سخت سرزنش کرنے کے بعد خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ خاں صاحب نے اس کی مزاج پرسی کے بعد اس منادی کا ذکر چھیڑا۔ حسنی کی دل گھبراہٹ دور ہو گئی اور اس نے رائے دی کہ یہ محلے کے کسی لڑکے کی کرتوت نہیں ہو سکتی۔ خاں صاحب نے وجہ پوچھی تو حسنی مسکرا کر کہنے لگا

"خاں صاحب آج کل کے پڑھے لکھے علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ بےدین بھی بن جاتے ہیں اور عورت کا ہاتھ پکڑنے کی بجائے اسے چٹھیاں لکھتے ہیں۔ ان پڑھ محلے کی عزت کا خیال کرتے ہیں اور تماش بین بھی اس قسم کی حرکتیں محلے سے باہر کرتے ہیں"

تمہارا خیال ہے یہ کسی دوسرے محلے کی پیداوار ہے؟

"بالکل جناب، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم محلے کی سب لڑکیوں کو ماں بہن سمجھتے ہیں۔ پچھلے سال ماسٹر دین کے مکان جو نیا کرائے دار آیا تھا۔ وہ مائی جیوندی کے مکان کی دیوار پر کھڑا ہو کر پڑوسنوں کو تاکا جھانکی کرتا تھا۔ مجھے جب اس بات کا پتہ چلا تو میں نے اسے حسینے خاں کے اکھاڑے کے پاس گلی سے پکڑ لیا اور دو دن میں وہ مکان چھوڑ بھاگا"

"مگر وہ افضل خاں جس کا باپ کچھ مر لیے چھوڑ مرا ہے وہ تو بے لحاظ آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"حضور یہ درست ہے کہ اس کی گردن ابھی تنی ہوئی ہے۔ لیکن عزت کے معاملے میں وہ بھی محلے داری اور دن کی روشنی کا لحاظ کرتا ہے۔"

"میری اطلاع تو یہ ہے کہ اس نے عیاشی شروع کر دی ہے"

"جی ہاں وہ علاش اور لعل پری کے چکر میں پڑ گیا ہے اور نئی موٹر اور انکم ٹیکس دینے والی بہنوں عیدو و بھوندال کے کوٹھے پہ ناچ گانے سے اپنا اور اپنے نئے دوستوں کا دل تفریح کر رہا ہے۔"

"اور وہ اجمل بیگ جو لاہور میں ملازم ہو گیا ہے۔"

"جناب وہ ہفتے کو شام کی گاڑی سے یہاں پہنچ کر رات پالا رام تانگے والے کے ریلوے شیڈ والے پرائیویٹ اڈے پہ گزارتا ہے۔ اور گھر صبح گھر آ کر کہتا ہے کہ صبح چار بجے والی گاڑی سے آنا پڑا کیونکہ شام کی گاڑیوں میں لاہور سے تھرڈ کلاس کے ڈبے نہیں لگتے۔"

"پالا رام کے اڈے والی عورتیں تو اس حرکت کی ذمہ دار نہیں۔"

"یہ پتہ لگانا تو آسان ہے حضور۔ ایسا واقعہ ہو تو ان کی غیر حاضریاں لگ جائیں۔"

"تمہاری ہیلی وورگی کی صحت کیسی ہے؟" خانصاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"حضور آپ سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی" حسّی گردن ہلا کر بولا۔ "ورگی جب اپنی کاسنی سلوار کے پائینچے ٹخنوں پر اٹکا کر شلوار کا گھیر اگھماتی ہوئی ٹھک کر چلتی ہے تو محلے کے سب گھبرو دل پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ مگر آپ کی دعا سے اگر کوئی اس سے الٹی سیدھی بات کرے تو وہ اسے "رماڈ" کہہ کر جھاڑ دیتی ہے اور مجھ سے شکایت کرتی ہے"

"اب تو لجیا بھی جوان ہو گئی ہے۔"

"حضور اس کی تو شادی ہو رہی ہے۔" حسّی نے اظہارِ تاسف کیا

"اتنی جلدی؟"

"سنا ہے جناب وہ معاملہ بھی کچھ تفتیش طلب ہے۔ لیکن اس کے عقلمند باپ نے اکھما بوڑھے جمعدار کو منا لیا اور اب جلدی سے لجیا کے ہاتھ پیلے کر رہے ہیں۔"

"اس لڑکی کے والدین بھی کچھ کر لیتے تو ہمیں درد سر کیوں ہوتی؟"

"یہ تو کسی بزدلی اور البہڑ لڑکی رڑکے کی کرتوت ہے جناب ۔ اگر لڑکے میں حق ہوتی بے چاری لڑکی سے شادی کر لیتا ۔ دونوں کی غلطی چھپ جاتی ۔ اور قصہ ختم ہوتا" جستی نے دانشمندانہ رائے دی اور خاں صاحب خاموش ہو گئے ۔ اتنے میں دفتری دروازے کی چق کے باہر خاں صاحب کے ذاتی ملازم امانوں کی صورت نظر آئی اور خانصاحب نے جستی کو فارغ کرتے وقت مشورہ دیا کہ اگر اس کے کان میں کوئی بھنک پڑے تو وہ بلا پس و پیش انہیں اطلاع دے ۔ جستی "حضور ہم تو آپ کے حکم کے غلام ہیں" کہہ کر انہیں دست بستہ سلام کرنے کے بعد چھاتی پھیلاتا ہوا تھانے سے باہر چل دیا ۔

جگتے دائی خاں صاحب کے گھر آئی بیٹھی تھی اور امانوں پوچھنے آیا تھا کہ اگر خاں صاحب حکم دیں تو تھانے میں حاضر ہو جائے ۔ خاں صاحب خوبرو جگتے کے مداحوں میں سے تھے اور وہ بیچاری محنت اور مشقت کر کے اپنے دو بچوں کو کالج کی تعلیم دلوا رہی تھی ۔ لیکن وہ اسے سب کے سامنے تھانے میں بلانا نہ چاہتے تھے ۔ چنانچہ امانوں جگتے کو کھانے کے وقت پھر بلانے کا حکم پا کر واپس لوٹا اور خاں صاحب تھانے کے کام سے فراغت پا کر ظہر کے وقت گھر پہنچ گئے ۔

جگتے اس وقت ان کی منتظر تھی اور کچھ پریشان بھی ۔ کھانے کے بعد خانصاحب کی بیوی اسے اپنے ساتھ بیٹھک میں لے آئی تاکہ اس کی موجودگی ہی میں خاں صاحب اور جگتے کی باتیں ہو جائیں ۔ خاں صاحب نے جگتے کی مزاج پرسی اور اس کے بچوں کی تعلیم کا حال پوچھنے کے بعد اسے اپنی مشکل کشائی کی دعوت دی

جگتے اطمینان سے سر کھجاتے ہوئے بولی ۔

"خاں صاحب ہمارے محلوں میں تو کوئی ایسی ظالم عورت نہیں جو اپنے بچے کو اس طرح سڑک پر ڈال دے ۔ اوّل تو محلے کی سبھی لڑکیاں شرم و حیا والی ہیں اور اگر خدانخواستہ ایسی ویسی بات ہو جائے اور دوا گنڈا بھی بروقت مدد نہ کر سکے تو شادی بیاہ سے بات چھپا لی جاتی ہے ۔"

"محلے کی سب عورتیں تو شرم و حیا کا پتلا نہیں ؟" بیگم صاحبہ نے لقمہ دیا ۔

"بی بی جی جب سے وہ بیگم پارہ جیسے والی فلم کمپنی میں جا گھسی ہے ہماری لڑکیاں بھی زلفیں ترشوانے لگی ہیں اور ریڈیو پر فلمی گانوں کے ساتھ اپنا نام سنواتی ہیں ۔ مگر ہر قصے میں سے آنکھ مٹکے یا خط پتر سے آگے تو کوئی کوئی ہی بڑھتی ہے ۔"

"وہ حاجی یوسف کی بیوی کا کیا قصہ ہے ؟" بیگم صاحبہ نے سوال کیا ۔

"بی بی جی شادی شدہ عورتوں کے قصے اس وقت نہ چھیڑیئے خاں صاحب بیٹھے ہیں۔ یہ کوئی اور محلے کی ان بیاہی لڑکی کے بھولپن کا نتیجہ ہوگا۔ ہمارے محلے میں بچہ جنا جائے اور مجھے پتہ نہ چلے نہ بی بی جی یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

خاں صاحب جو اب تک جنتے کو کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ خاموشی سے دونوں عورتوں کی باتیں سنتے رہے اور بیگم صاحبہ نے اندازہ لگایا کہ وہ جنتے کے بیان سے مطمئن ہیں چنانچہ وہ بولیں۔

"اچھا جنتے پھر بھی خیال رکھنا۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات تمہارے کان میں پڑے تو مجھے آ بتانا۔"

"بہت اچھا بی بی جی۔ خدا آپ کا سہاگ قائم رکھے۔ میں دوسرے محلے کی دائیوں سے بھی پتہ لگانے کی کوشش کروں گی۔" یہ کہہ کر اپنا برقعہ سمیٹا اور سلام کرتی ہوئی اٹھ کر چل دی۔

خاں صاحب کو مزاج بستی اور جنتے کی باتوں اور اپنے محلے کی رپٹ سے اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ یہ بچہ محلے میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ کسی اور علاقے سے آدمی اسے جاکے پوستی کی دکان کے باہر چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن وہ آدمی کون تھے۔ اس بچے کی ماں کون ہے اور باپ کون؟ خاں صاحب ابھی مخمصے میں پھنسے ہوئے تھے۔ کہ خاں صاحب کی گریجویٹ بیوی نے رائے دی کہ اگر ان بیاہی لڑکیوں کو جسمانی ساخت کے متعلق مناسب ہدایات دی جائیں تو اس قسم کے واقعات بہت کم ہو جائیں۔ بیگم صاحبہ نے خاں صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ ودھارام کے ہاں آنے جانے والی عورتوں کی نگرانی کرائیں انہیں یقین تھا کہ بچے کی ماں کو منادی سے اس کا ضرور پتہ مل گیا ہوگا۔ اور ممتا کی ماری وہ ضرور اسے دیکھنے آئے گی۔ خاں صاحب بیگم کے ان مشوروں پر مسکرائے اور اسی خوشی میں تھانے جاتے وقت اس سے بغلگیر ہونے لگے تھے کہ ان کا فرزند ارجمند فلمی شو دیکھنے کے لئے ایک روپیہ دو آنے لینے آ گیا اور خاں صاحب کا ہاتھ بیگم کے کندھے سے اٹھ کر اپنی جیب میں آ گیا۔

شام کو ودھارام حسب حوالات کی ڈیوٹی دینے تھانے حاضر ہوا تو خاں صاحب نے اسے اپنے پاس بلوا کر بچے کی خیریت دریافت کی۔ ودھارام نے خلوص قلب سے خاں صاحب کی درازی عمر کی دعا کی اور

بولا: "حضور پرماتما کی کرپا سے بچہ گھر والی سے گھل مل گیا ہے۔ کرشنا کل ساری رات خوشی سے جاگتی رہی اور ہمیں لوریاں سناتی رہی۔ بھگوان نے ہماری بھی سن ہی لی آخر اور ہمارے گھر میں بھی دیپک جلا دیا۔"

خانصاحب مسکرائے اور دو دھارام کے چہرے پر مشفقت پدری جھلکتی دیکھ کر بولے

"اچھا بھئی دو دھارام خوش رہو۔ مگر آتی جاتی عورتوں کا خیال رکھنا اور اگر کوئی عورت بچے کو تمہاری گھر والی سے چھیننا چاہے تو مجھے اطلاع دینا۔"

حضور اب تو اس بے قصور بچے کو میرے پاس ہی رہنے دیجئے اور میری تبدیلی کسی اور جگہ میں کروا دیجئے آپ کی بڑی دیا ہوگی۔ میں اسے ابھی سے اچھی تعلیم دلاؤں گا اور جوان ہوگا تو اس کی شادی کروں گا۔"

"ابھی تو تم اس کا خیال رکھو۔ پھر دیکھا جائے گا۔" خاں صاحب نے دو دھارام کے جذبات کو فوری ٹھیس لگانا مناسب نہ سمجھی اور سرکاری سائیکل سنبھال کر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو سلام کرنے ان کے بنگلہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اے۔ ایس۔ پی آنند ساگر نئے نئے پولیس میں بھرتی ہوئے تھے اور شہر کے تھانوں کے انچارج تھے۔ خانصاحب اگرچہ دل میں نابالغ افسروں کی ماتحتی پر چنداں خوش نہ تھے۔ لیکن چونکہ یہ نوجوان افسر اپنی قابلیت کے بل بوتے پر مقابلے کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کرتے تھے اس لئے ان سے چھٹکارا بھی ناممکن تھا۔ ویسے بھی آنند ساگر ایک روشن خیال پروفیسر کے صاحبزادے تھے اور حلیم الطبع افسر اس لئے خاں صاحب ان کے بنگلے پر سلام کرنے وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہتے تھے ابھی خاں صاحب اے۔ ایس۔ پی صاحب کے بنگلے میں سائیکل سے اتر ہی رہے تھے کہ آنند ساگر کلب سے ٹینس کھیل کر واپس آ گئے اور اپنی چھوٹی سی کار سے گیراج کے باہر اترتے ہی بولے "ہیلو خانصاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"حضور کی بندہ پروری ہے۔"

"کہئے آج کل تو میونسپل کمشنر لفنگو کی سفارشیں نہیں کرتا" آنند ساگر نے ٹینس کا ریکٹ گھماتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں جناب۔ ابھی تو الیکشن کافی دور ہے۔"

"اور کوئی خاص واقعہ؟"

"بس جناب دو تین روز سے ایک نوزائیدہ بچہ ہمارے پلے پڑ گیا ہے۔ اس کے والدین کا کھوج میرے علاقے میں تو نہیں ملا۔ باقی تھانوں کو ابتدائی اطلاعی رپورٹ کی کاپی بھجوا دی گئی ہے اور شہر میں منادی ہو چکی ہے"۔

"آج شام اڈہ ٹکورر کے تھانے سے اسی قسم کی ایک اطلاع آئی ہے۔ میں نے اسے پڑھا نہیں آئیے آپ بھی دیکھ لیں"۔

اے۔ ایس۔ پی صاحب نے کوٹھی کے برآمدے میں کرسیاں لگوائیں۔ اپنا کالا ڈاک بکس کھولا اور متعلقہ رپورٹ نکال کر بلند آواز میں پڑھنے لگے

"ساڑھے گیارہ بجے شب بروز پیر وار امام دین سپاہی نمبر ۱۲۳ رات کو گشت کر رہا تھا جب اس نے کوٹ پشکہ کی فیکٹری والی گلی میں اچھرو بھنگی کو ایک دوسرے بھنگی مکھن لال سے ہاتھا پائی اور غل غپاڑہ کرتے ہوئے دیکھا اور مداخلت کر کے ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ اچھرو نشے کی حالت میں تھا۔ اور دوسرے بھنگی مکھن لال کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ مکھن لال نے تھانے میں بیان دیا کہ اچھرو جوئے میں پچاس روپے ہار گیا تھا اور جھگڑا کر کے اس سے رقم واپس لینا چاہتا تھا ملزم سے جب پوچھا گیا کہ اس کے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے تو اس نے بحالت نشہ اقرار کیا کہ بڑی حویلی والے رائے بہادر رامیشور دیال کی بیٹی پشپا کا بچہ چھپانے کا اسے سو روپے معاوضہ ملا تھا۔ ملزم کو حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ حکم حاکم ہو تو مزید تفتیش کی جائے"۔

یہ رپورٹ سن کر خاں صاحب سکتے میں آ گئے۔ رائے بہادر رامیشور دیال ان کے پرانے ہم جماعت تھے اور پشپا ان کی منہ بولی بیٹی۔ اس بیچاری کے لئے پانچ برس سے موزوں بر نہیں مل رہا تھا اور جس کرائے دار کے لڑکے سے اسے محلے میں عشق ہوا تھا وہ غریب بھی تھا اور کھتری بھی اس لئے رائے بہادر نے رشتہ نامنظور کر دیا تھا۔

خاں صاحب نے سن تو رکھا تھا کہ اس حادثے کے بعد پشپا ان کے ساتھ کئی مرتبہ دیکھی پکڑی گئی تھی۔ لیکن انہیں امید نہ تھی کہ وہ یہ گل کھلائے گی

"کیا بات ہے خاں صاحب۔ آپ ایک دم خاموش کیوں ہو گئے؟" آنند ساگر نے پوچھا۔

"کوئی بات نہیں حضور۔ آپ تو جانتے ہیں کہ رائے بہادر رامیشور دیال برہمن برادری کے پردھان اور شہری کانگریس کے نیتا ہیں"۔

"ہاں بھئی ان کی بنی بنائی عزت تو خاک میں مل جائے گی"۔ اے۔ ایس۔ پی صاحب کو ہندو بھائی سے ہمدردی تھی۔

"حضور اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ معاملہ سلجھا دیتا ہوں۔ ان کی بھولی بھالی لڑکی سے قصور ہو گیا ہے"۔

"مگر اس بچے کو کون قبول کرے گا؟"

"اس کا انتظام میں کر دوں گا حضور"۔

"یہ بات ایس۔ پی صاحب تک پہنچ گئی تو؟"

"ایس۔ پی صاحب بھی رائے بہادر کی عزت کرتے ہیں حضور اور یہ شہر والوں کا معاملہ ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا تو میں ایس۔ پی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا"۔

"مگر رائے بہادر سے بات کون طے کرے گا"۔

"یہ سب کچھ آپ اس خادم پر چھوڑ دیں حضور اور میری صرف ایک درخواست قبول فرمائیں"۔

"وہ کیا؟"

"وودھارام کانسٹیبل کا تبادلہ تحصیل راہوں میں کر دیں"۔

"وودھارام اور تحصیل راہوں کا اس قصے سے کیا تعلق ہے"

"حضور رائے بہادر کی راہوں میں جدی زمینیں ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے رہے گا اور شہر کی نظروں سے دُور!"

حفیظ احسن

دشمن

اونچی حویلی سے ملحقہ میدان میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے علاوہ چاچا شاہو کی جھونپڑی بھی تھی زمین کے اس ٹکڑے پر اونچی حویلی کے مالک حیات خاں اور اس کے ماموں زاد بھائی سجاول خاں کے درمیان عرصہ سے مقدمہ بازی ہو رہی تھی۔ اس مقدمے کا فیصلہ حیات خاں کے حق میں ہو گیا تھا۔ حیات خاں اپنے منشی اور چند کارندوں کے ہمراہ اس پلاٹ کی پیمائش کرا رہا تھا۔ اس کی موٹی موٹی نیلی آنکھوں میں مجنونانہ مسرت ناچ رہی تھی اور وہ بار بار بپھرے ہوئے بھینسے کی طرح زمین پہ پاؤں پٹخ رہا تھا اور سجاول خاں اور اس کے حواریوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ مجھ سے ٹکر لینے آئے تھے کمینے۔ میں تو ان کا پیچھا قبر کی دیواروں تک کروں گا۔ پھر وہ اپنے منشی رحمت سے مخاطب ہوا۔ "یہ گند اٹھا کر سارے احاطے کو صاف کراؤ اور محلے والوں سے کہہ دو کہ آئندہ کوئی اس جگہ کوڑا کرکٹ نہ پھینکے۔" حد بندی ختم ہوتے ہی خان کے کارندوں نے زمین کے اس ٹکڑے کے گرد لوہے کے خاردار تاروں کی باڑ لگا دی۔ جب منشی رحمت نے خان کی توجہ شاہو چاچا کی جھونپڑی کی طرف دلائی تو وہ حسب عادت اپنی مونچھوں کو ہونٹوں میں مروڑتا ہوا بولا۔ "اسے کہو دو تین روز میں اپنا بندوبست کر لے۔ یہاں چند دنوں میں مہمان خانہ کی تعمیر ہونے والی ہے۔" منشی رحمت کچھ کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

شاہو چاچا اس خالی میدان میں جو کوڑا کرکٹ پھینکنے اور ڈھور ڈنگر باندھنے کے کام آتا تھا ایک مدت سے بسیرا کیے ہوئے تھا۔ اس کا ایک بازو اور دو ٹانگیں مفلوج اور سوکھی ہوئی تھیں۔ اس معذوری

کے علاوہ وہ عام طور پر بیمار رہتا تھا۔ مرگی کے دوروں کی وجہ سے اس کا سوکھا ہوا جسم کتنی کتنی دیر زمین پر لوٹتا رہتا۔ اور وہ درد سے کراہتا رہتا۔ شاید اس تکلیف کی وجہ سے اس کی قوت گویائی ختم ہو گئی تھی۔ جب اس کی طبیعت معمول پر ہوتی وہ باتیں کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن سننے والے کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہ آتی تھی۔ پھر وہ ہاتھ کے اشارے سے اپنا مافی الضمیر سمجھانے کی کوشش کرتا اور اس کے زرد اور استخوانی چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ "اوٹوں اوٹوں" بس یہی ایک لفظ تھا جو بار بار اس کے منہ سے نکلتا اور وہ مسکراتا رہتا۔ چند قدم آگے فاصلے پر تنور والی کا مکان تھا۔ وہ روز شام کی بچی ہوئی دال یا سبزی اور چند روٹیاں اسے دے جاتی محلے کے اکثر لوگ گھروں سے ایک نہ ایک وقت کا کھانا بھی پہنچ جاتا تھا۔ جمعرات کو تو اس کی جھونپڑی میں روٹیوں کا ایک چھوٹا سا انبار لگ جاتا۔ اور دوسری صبح حیات خاں کی بھوری بھینس کی کھرلی تک اپنے لاغر پچکے اور الجھے ہوئے جسم کو گھسیٹتا ہوا باسی روٹیوں کی چنگیر لے جاتا۔ شاہو چاچا کو دیکھتے ہی بھوری کی گردن میں لوہے کا چمکتا ہوا سنگل بجنے لگتا۔ شاہو چاچا کھرلی میں روٹیاں ڈالتے ہوئے کہتا۔ اوٹوں۔ اوٹوں مگر بھوری اس کی بات سننے سے پہلے ہی روٹیوں پر پل پڑتی۔

یوں تو شاہو چاچا کی آنکھیں جھونپڑی میں آنے والے ہر انسان کو دیکھ کر مسرت اور شکر گزاری کے احساس سے چمکنے لگتی تھیں۔ لیکن جب کوئی بچہ اپنے ننھے اور گدگدے ہاتھوں میں برتن اٹھائے اسے نظر آتا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔ وہ گردن اور بازو ہلا ہلا کر کئی مرتبہ "اوٹوں۔ اوٹوں" کہتا اور کبھی کبھی ادھر ادھر دیکھتے اور ڈرتے ہوئے کسی بچے کے سر منہ پر پیار سے ہاتھ بھی پھیر لیتا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے گویا بے حد خوشی ہوتی۔

اس شام جب منشی رحمت نے اسے خان کی طرف سے جگہ خالی کرنے کے لئے کہا تو وہ حسب عادت مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلانے لگا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں میرے پاس سر چھپانے کے لئے اور کوئی جگہ نہیں ہے۔

"مجبوری ہے چاچا! میں نے خان سے کہا تھا۔ کہ اس بیچارے کو چھوٹی حویلی کے احاطے میں جگہ دے دو پڑا رہے گا۔ مگر وہ نہیں مانا۔ پرسوں تک اپنا کوئی انتظام کر لو۔"

شام کو تنور پر برکت بہشتن جس کی ہمدردیاں سجاول خاں کے ساتھ تھیں۔ لوگوں سے کہہ رہی تھی

"ممتاج پر ظلم کر رہے ہیں کیا وقت آگیا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف ہی باقی نہیں رہا"

تیسرے روز اینٹوں سے لدے ہوئے اونٹوں سے بوجھ اترواتے ہوئے حیات خاں نے شاہو چاچا کی جھونپڑی کی طرف دیکھا اور منشی رحمت سے بولا "تم نے اسے جگہ خالی کرنے کو کہہ دیا تھا؟"

"جی ہاں۔ کہہ دیا تھا۔ لیکن ——————"

"لیکن کیا؟"

سجاول خاں کے آدمی فساد پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اپیل کا فیصلہ ہونے سے پہلے شاہو کو یہاں سے کوئی نہیں ہٹا سکتا"

"اچھا یہ بات ہے۔ تم ابھی اس بڈھے کا سامان اٹھا کر احاطے سے باہر کرو۔ اگر سجاول کے دل میں اتنی ہمدردی ہے۔ تو اسے اٹھا کر اپنے گھر لے جائے" منشی رحمت نے خاموشی سے چند کارندوں کی معیت میں شاہو چاچا کی جھونپڑی سے برتن اور چیزیں اٹھا کر باہر رکھنا شروع کر دیں۔ شاہو چاچا خاموشی سے انہیں سامان اٹھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب انہوں نے اس کا میلا اور چیتھڑا سا بستر اٹھایا تو بیاختہ اس کے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی "اوئوں۔ اوئوں" مگر اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ اس کی جھونپڑی کا مختصر سا سامان جو چند ٹوٹے پھوٹے برتنوں اور پھٹے پرانے کپڑوں پر مشتمل تھا۔ اٹھا کر باہر رکھ دیا گیا۔ منشی رحمت ہاتھ جھاڑتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ سجاول خاں باڑھ کے اس پار چند آدمیوں کے ہمراہ ان کی طرف آ رہا تھا۔ حیات خاں پہلے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ غصے سے اس کی بھنویں تنی ہوئی تھیں۔ دشمن کے آدمیوں کو قریب دیکھ کر حیات خاں کے کارندے اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ سجاول خاں تاروں کی باڑھ کے پاس آ کر بولا "حیات خاں تم حد سے باہر ہوتے جا رہے ہو۔ جب تک مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ تمہیں اس جگہ پر کچھ تعمیر کرنے کا کیا حق ہے۔ ہم یہ اینٹیں اس احاطے میں نہیں رکھنے دیں گے۔ اور یہ سن لو کہ اگر تم نے یہاں کوئی دیوار کھینچنے کی کوشش کی تو خون خرابہ ہو جائے گا"

حیات خاں نے سجاول خاں کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بجائے وہ اپنے کارندوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم یہاں کیوں جمع ہو گئے۔ کام کرو"

اس کے کارندے حویلی کی دیوار کے ساتھ اینٹوں کی کوڑیاں لگانے لگے۔ سجاول خاں کچھ دیر کھڑا نخری ہوئی آنکھوں سے یہ سب کچھ اس طرح دیکھتا رہا۔ جیسے خون کے گھونٹ پی رہا ہو جب دو تین آدمی شاہو چاچا کا سامان اٹھا کر باہر نکلے تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ چیخ کر بولا

"خبردار جو کسی نے شاہو کے سامان کو احاطے سے باہر رکھا۔"

"کس میں ہمت ہے جو میرے آدمیوں کو روک سکے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ مقدمہ ہارنے کے بعد ان اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے ہو۔ اگر بڈھے کا اتنا خیال ہے۔ تو اسے اپنے گھر لے جاؤ۔"

"بکواس بند کرو۔ یہ زمین میری ہے اور شاہو میری زمین پر رہتا ہے۔ کسی نے اسے ہاتھ لگایا تو میں اس کی گردن الگ کر دوں گا۔"

"اچھا دیکھتا ہوں" حیات خاں دانت پیستے ہوئے منشی رحمت سے مخاطب ہوا۔ "رحمت علی شاہو کو اٹھا کر باہر گلی میں رکھ دو۔" منشی رحمت، شاہو چاچا کی جھونپڑی کی طرف پلٹا۔ اس سے پہلے شاہو چاچا خود ہی گھسٹتا ہوا جھونپڑی سے باہر آگیا تھا۔ چشم زدن میں سجاول کے آدمی نوکیلی تاروں کی باڑھ پھلانگ کر احاطے میں داخل ہو گئے۔ اور ایک آدمی نے منشی رحمت کو گردن سے پکڑ لیا۔ "شاہو چاچا کو ہاتھ لگایا تو انتڑیاں باہر کر دوں گا۔" منشی رحمت کانپتے ہوئے لپکا۔ حیات خاں کچھ دیر پھٹی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح شاہو چاچا کی طرف بڑھا اور دونوں ہاتھوں میں اسے ایک ہلکی پھلکی گٹھڑی کی طرح اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا سجاول کے آدمی اس کا راستہ روکنے کے لئے آگے بڑھے تو اس نے انسانی جسم کو اٹھا کر ہوا میں لہرایا اور دوسرے لمحے شاہو چاچا نوکیلی تاروں کی باڑھ میں کسی بوسیدہ چیتھڑے کی طرح ٹنگ رہا تھا دونوں طرف کے آدمی غصے اور دیوانگی کے عالم میں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ شاہو چاچا کا کالا کالا خون باڑھ کی نوکیلی تاروں کو سیراب کرتا رہا۔ درد اور تشنج سے اس کا جسم تاروں سے لپٹتا گیا اور اس کی اکھڑی ہوئی سانس "اوئوں اوئوں" کی گردان کرتی رہی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں آس پاس کے بہت سے آدمی اکٹھے ہو گئے۔ جنہوں نے ان لوگوں کو جو پاگلوں اور وحشیوں کی طرح ایک دوسرے کو مار اور کاٹ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے

علیحدہ کیا۔ دونوں خاں لوگوں کی گرفت سے اچھل اچھل کر ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے دو تین آدمیوں نے شاہو چاچا کے جسم کو تاروں سے الگ کیا تو اس کا منہ کھلا تھا اور پتھرائی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی تھیں۔

"یہ تو مر گیا بیچارا۔" کوئی بولا۔

"مر گیا —— چلو یہ بھی اچھا ہوا۔" سجاول خاں اپنے ہونٹوں سے جھاگ کی تہہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ یکایک اس کی آنکھوں میں انتقامی اور حیوانی مسرت کے ہیولے ناچنے لگے۔

"مقدمہ جیت کر بڑا اترا رہا تھا کمینہ۔ اب دیکھوں گا اسے پھانسی کے پھندے سے کون بچاتا ہے"

حنیف چودھری

باولی ماں تا

آسیہ کے پاؤں بھاری تھے۔ اسے آرام کی سخت ضرورت تھی۔

اس کا شوہر خالد مرزا سارا سارا دن لیگی کارکنوں کے ساتھ جلسوں میں تقریریں کرتا اور ساری ساری رات لیڈروں کے ساتھ مل کر اگلے روز کے پروگرام مرتب کرنے میں مشغول رہتا۔ آسیہ کئی کئی دن تک اپنے شوہر کی شکل نہ دیکھ پاتی۔

آسیہ کے خیالات کی معصوم کلیاں جو شادی سے پہلے ایک انجانی خوشی سے مہک اٹھی تھیں ایک ایک کر کے مایوسی و نامرادی کی آگ میں بھسم ہونے لگیں۔ اس کے ہاتھوں کی خوشگوار حنا میں آگ کی سی جلن پیدا ہو گئی۔ وہی ذہن جو پہلے زندگی کے رنگین اور خوشنما خاکوں سے مزین تھا اب نا امیدی کی آندھیوں سے اجڑ گیا۔ زندگی کے سنہرے تاج محل میں اداسی کا غبار پھیل گیا۔ آسیہ اپنے شوہر کی بے اعتنائی سے بہت خوفزدہ ہو چکی تھی وہ جب بھی خالد مرزا سے شکایت کے لہجہ میں کہتی۔

"قوم کی اتنی خدمت بھی کیا کہ انسان اپنی زندگی کے فرائض کو بھی بھول جائے۔"

تو جواب میں وہ مسکرا کر کہتا۔

"بیگی، مادر وطن کے پاؤں تلے کون انگارے دیکھ سکتا ہے؟ کون یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس کا وطن جہاں ماؤں بہنوں اور بیٹیوں نے اپنے دودھ کی نہروں سے ہریالی پیدا کی ہو وہاں محکومیت کی زندگی کے جلتے ہوئے گلستان کو راکھ کر دے۔ اچھی آسی! اگر ہم لوگ اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد نہ کریں تو اور کون کرے گا۔"

یہ سن کر آسیہ کے دل کے نہاں خانے میں اندھیرے کی ایسی دیوار روشن ہو جاتی جس

سکے خیالات کو چاندنی راتوں کا سا سکون مل جاتا۔ اس کے ویران اور خزاں زدہ تصور میں سدا بہار مسکراہٹوں کے شگوفے کھل جاتے اور وہ اپنے ہونے والے بچے کی محبت بھری راہوں میں کھو جاتی اور مسرت انگیز چاہت اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتی۔ تب اس کے خیالوں کی شاہراہوں پر ان گنت چراغ مسکرا اٹھتے۔

پھر ایک روز ملک آزاد ہو گیا

مادرِ وطن کے پاؤں تلے انگارے بچھ گئے۔

آزادی کی کنواری کرنوں سے ابھی دھرتی کا چہرہ چمکنے بھی نہ پایا تھا کہ چار سو سفاکی اور بربریت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں عظمتِ آدم کجلا گئی۔ انسانیت کے علمبردار شیطانی ناچ ناچنے لگے۔ ماؤں کی ممتا کو درندوں نے بری طرح مجروح کر دیا۔ کنواریوں کے تقدس کے آبگینے عذاب کے جاموں میں ڈھل گئے۔ سہاگنوں کے جھومر اداس ہو گئے۔ خالد مرزا اس فساد میں شہید ہو گئے ــــ! آسیہ شاخ سے ٹوٹے ہوئے کچے پھل کی طرح روندی گئی۔

ملک تو آزاد ہو گیا۔ مگر لاکھوں سیتاؤں اور زلیخاؤں کی مانگ راکھ سے اٹ گئی

ہر طرف اندھیارے ٹوٹ پڑے

آسیہ کے چکا چوند پیدا کر دینے والے حسن نے خود اس پر وہ ظلم ڈھائے کہ سیلے گگن کی اوٹ سے جھانکنے والے چاند ستارے بھی اپنی پلکیں کس کر رہ گئے۔ سماج کے وحشیوں نے اسے وہ وہ اذیتیں پہنچائیں کہ اس کی روح پر خراشیں پڑ گئیں۔ وہ حالات کا مستعدی سے مقابلہ تو کرتی رہی مگر پر کٹے پرندے کی طرح قفسِ آزادی میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

ــ:ــ

پاکستان میں اس کے حصے میں قدموں کا ایک معمولی جھونپڑی آئی۔

ننگے پاؤں کو پتھروں پر چلنا پڑا۔ ان پتھروں کے اس کے خیالات اور احساسات کو کچھ اس طرح زخمی کیا کہ اس کی حیات افروز تمنائیں اور چاہتیں

جیتے جی مر گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اس مرن کے پیچھے بھی ایک

زندگی اس کے شوہر کی آخری نشانی ۔ آسیہ کی زندگی کی ساری خوشیاں شاکر کے ننھے ننھے سرخ ہاتھوں کی جنبش میں تھیں۔ اس کی معصوم ہنسی میں تھیں۔ جب شاکر سوتے میں اچانک مسکراتا تو آسیہ کی آنکھوں میں سپنے جاگ اٹھتے۔ روح کے زخم نو عمر کے لئے مٹ جاتے۔ اور وہ انہی لمحات کی خاطر زندہ تھی۔

دن گزرنے لگے۔

گاؤں کے لوگ آسیہ کو دیکھتے تو ان کے دلوں کے سنسان جزیرے جاگ اٹھتے۔ برفانی چاندنی کی کہانیاں دھڑکنے لگتیں۔ خشک لبوں کو معطر شگوفے چومنے کا ارمان تڑپنے لگتا۔ مگر آسیہ پھول کی طرح کانٹوں کے درمیان مسکراتی رہی اور نورالدین نمبردار کے گھر کام کاج کر کے اپنا پیٹ پالتی رہی۔

گاؤں کے لوگ جب آسیہ سے شاکر کے ابا کے بارے میں پوچھتیں تو جواب میں آسیہ کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو ابھر آتے۔ اور اس کے خشک رخساروں پر لکیریں بکھیر کر آنچل میں ڈوب جاتے۔ اور وہ رندھی ہوئی آواز میں کہتی۔

"وہ اور وطن کے پاؤں تلے انگارے نکالتے نکالتے خود اس آگ میں بھسم ہو گئے۔"

بوڑھی عورتیں تو آسیہ کے افسوؤں میں آنسو ملا کر چلی جاتیں۔ مگر کچھ جوان عورتیں ایسی بھی تھیں جو گھروں میں جا کر کہتیں۔

"آسیہ بیوہ ہرگز نہیں ہے۔"

شاکر کا کوئی باپ نہیں!!"

"یہ اپنی بد اوائی کا خمیازہ بھگت رہی ہے!!"

ان باتوں کو دیواروں نے سنا۔ دیواروں نے راہگیروں تک پہنچایا۔ سبھی نے آسیہ کی پاک دامنی کو داغدار کیا اور گاؤں کے لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔

ایک دن نورالدین نمبردار کی بیوی نے آسیہ کو اپنے پاس بلا کر کہا

بیٹی تو ابھی جوان ہے۔ تیرے ہاتھوں میں اتنی قوت ہے کہ ایک بار پھر زندگی کے سپنے سے سکتی ہے کب تک شاکر کے لئے در در کی ٹھوکریں کھاؤ گی۔ سبھی لوگ تیرے

بارے میں ۔۔۔۔۔۔۔ خیر ایک بار پھر ان ہاتھوں کو پیلا کر لے"۔

یہ سن کر آسیہ بہت روئی خون کے آنسو !

پھر روتے روتے اتنا کہہ سکی۔

"ماں جی - میں شادی نہیں کروں گی"۔

"کیوں"۔

"میں دنیا کی ہر خوشی کو شاکر کے قدموں کی دھول سمجھتی ہوں۔ چاہے زمانہ تہمتوں سے میرا سینہ چھلنی کیوں نہ کر دے۔ خواہ سرخ پتھروں کی بارش کیوں نہ ہو - میں جیئوں گی شاکر کے لئے ۔۔۔ اور صرف شاکر کے لئے دنیا میرے تقدس کی چادر کو کبھی داغدار نہ کر سکے گا۔ ۔۔۔۔ ماں! تم جانتی ہو کہ میں ۔۔۔۔۔۔"

اور روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی۔

نور الدین کی بیوی نے اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے اور سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! تمہارے یہ ملائم ہاتھ گوبر تھاپنے کے لئے نہیں۔ مہندی رچنے کے لئے بنے ہیں ان ہاتھوں میں ریشمی آنچل ہونا چاہیئے۔ تم کیوں جوانی کو برباد کر رہی ہو پھر گاؤں کے لوگ بھی طرح طرح ۔۔۔۔۔۔۔"

"مجھے ان کی کچھ پرواہ نہیں۔" آسیہ تقریباً چیخ اٹھی۔ "شاکر کی زندگی میری زندگی ہے ایسا کبھی نہ ہوگا"۔

یہ کہہ کر آسیہ چلی آئی۔

آسیہ کے دل نے کہا۔ رو نہیں آسی۔ زندگی کی سحر میں صرف چند راتوں کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ معاشرہ اگر تمہارا ساتھ نہیں دیتا تو کیا ہوا۔ تمہارا شاکر جوان ہو کر اس معاشرے کا مقابلہ کرے گا

شاکر کی اٹھان کے ساتھ ساتھ آسیہ کے تصورات میں بھی نکھار پیدا ہوتا گیا۔

دن رات کے چھوڑے ہوئے نشانات کو ٹٹولتا آگے بڑھتا رہا۔

شاکر کی ذہانت کے ساتھ ساتھ آسیہ کے خواب جوان ہونے لگے۔

پندرہ سال بعد

شاکر شہر میں ایک کارخانہ میں ملازم ہو گیا تھا۔

ساٹھ روپے ماہوار کا سن کر آسیہ کے خیالات کے گمنام جزیرے جگمگا اٹھتے۔ اس کی پتلیوں ہی کی مانند الجھی ہوئی لٹیں ایک مرتبہ پھر لہرا جاتیں۔ آنکھوں کے گرد جہاں ماضی کے سلگتے چراغوں کا دھواں جما ہوا تھا۔ شفق مسکرانے کو مچلنے لگتی۔

زندگی ایک بار پھر لوٹ آئی۔

شاکر اپنی ماں کو ماہانہ تیس روپے بھیجنے لگا۔ آسیہ کے خواب دریچوں میں مسکرانے لگے اب ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ نکھرنے لگا۔ اب وہ شاکر کی شادی کے بارے میں سوچنے لگی وہ اس دن کے خواب دیکھنے لگی جب شاکر اپنے ساتھ ایک پھول ایسی دلہن لائے گا۔ وہ دلہن گھر کا سارا کام کاج کیا کرے گی۔ اور خود وہ گھر میں چرخہ چلائے گی۔ اس وقت وہ سارے دکھ سارے ستم اور ساری اذیتیں بھول جائیگی۔

اور۔۔۔۔۔۔۔

ایک سال بعد اچانک شاکر کے روپے آنا بند ہو گئے۔ آسیہ کے دماغ میں خیالات کے ہزاروں طوفان سنسنانے لگے۔ وہ ساری ساری رات جاگ کر اپنے بچے کی خیریت کے لئے دعائیں مانگنے لگی۔ اس کے کان ہر وقت دہلیز پر شاکر کے قدموں کی آہٹ سننے کے لئے بے قرار رہتے

آسیہ نے شاکر کو تین خط لکھے۔ پھر ایک تار بھی بھیجا۔ جب کوئی جواب نہ آیا تو اس کو اپنی امیدوں کا سورج ڈوبتا نظر آیا۔ وہ فوراً شہر گئی۔ جب کارخانے پہنچی تو شاکر کے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ ایک لڑکی کو بھگا کر کراچی لے گیا ہے یہ سنتے ہی آسیہ کی امیدوں کا سورج ڈوب گیا اس کے خیالات کا سنہرا تاج محل جو ابھی نامکمل تھا دھڑام سے اس پر آ گرا۔ وہ اس کے نیچے دب کر رہ گئی وہ ایک مرتبہ پھر بیوہ ہو گئی اس نے تو شاکر کے بارے میں کبھی بھی اس طرح نہ سوچا تھا۔ اس کا دماغ سُن ہو گیا۔

آسیہ جب کارخانے سے باہر نکل رہی تھی تو ٹھوکر کھا کر گر پڑی اور اس وقت اس کو اٹھانے والا کوئی نہ تھا

علیم اکبر

دلدل

"کلمۂ شہادت!"

مجمع میں سے کسی نے مردہ آواز میں ہانک لگائی جس کے جواب میں کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کی بھنبھناہٹ ایسی تھکی تھکی نڈھال آوازوں کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ......" کلمہ کا پہلا حصہ بڑے جوش، خروش سے ادا کیا گیا تھا لیکن پھر بتدریج آوازوں میں کمی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ آخری حصہ منہ ہی میں دب کر رہ گیا۔ اور لوگ پھر اپنی دنیا داری کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ وہ کوئی لمبا چوڑا جلوس نما جنازہ نہ تھا۔ اصغر نہ تو کوئی مذہبی راہنما تھا اور نہ ہی مشہور سیاسی لیڈر۔ حتیٰ کہ وہ اپنے حلقہ کی بنیادی جمہوریت کا رکن تک بھی نہ تھا۔

وہ تو چھ ماہ کا ننھا منا تھا جو اس وقت سفید کپڑے میں لپٹا اپنے باپ کے بازوؤں پر دھرا تھا۔

گرمی ایسی زیادہ نہ تھی لیکن فضا میں گھٹن اور حبس تھا۔ چپچپاتے جسموں پر کپڑے ایک بوجھ تھے۔ آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے چھ ماہ کے ننھے بچے کے کفن ہی معلوم ہوتے تھے۔

جبار ہمیشہ سے ہی آہستہ آہستہ چلنے کا عادی تھا۔ لیکن اس وقت تو جیسے اس کے قدم اٹھ ہی نہ رہے تھے۔ اصغر کا بوجھ کچھ ایسا زیادہ نہ تھا وہ شروع سے ہی بیمار تھا۔ مریض ماں کی بیمار کوکھ نے ایک پتلے دبلے اور دائمی مریض بیٹے کو جنم دیا تھا وہ بیٹا جو ان کی محبت بھری زندگی کا مظہر تھا ـــــ وہ بیٹا جو کشتِ الفت کا اولین پھول تھا اور وہ بیٹا جو ازدواجی

مسرت کی شاہراہ پر ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اس دنیا میں چھ ماہ تک مریضانہ سانس لینے کے بعد آج اپنے باپ کے بازوؤں پر ایک بے جان جسم کی صورت میں اپنا آخری سفر طے کر رہا تھا۔ چھ ماہ کی مریضانہ حیات نے اس کمزور بچے کو اور بھی کمزور کر دیا تھا اور آخری ایام میں تو کمزوری کی یہ حالت تھی کہ تین فٹ کے فاصلہ سے اس کے رونے کی آواز بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکا تھا۔ مگر جبار کو اس کا پھول ایسا بوجھ بھی ناقابلِ برداشت محسوس ہو رہا تھا۔ بعض اوقات اس کے ہاتھوں میں اچانک ہی لرزش کی لہر سی دوڑ جاتی اور ٹانگیں جیسے لڑکھڑا جاتیں بلکہ ایک دفعہ تو ساتھ چلتے ہوئے اس کے ایک دوست نے اسے بازو کا سہارا دے کر سنبھالا۔

"لاؤ مجھے دے دو"

"نہیں!" جبار کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

جنازہ کے ساتھ کوئی زیادہ لوگ نہ تھے۔ بس جبار کے دو چار دوست اور چند پڑوسی وہ لوگ اس حبس میں ماتھے کے پسینے پونچھتے چیونٹیوں کی چال چلے جا رہے تھے جب وہ ادھر اُدھر کی باتوں سے اکتا جاتے تو پھر جبار کے بارہ میں گفتگو کرنے لگتے۔

"بے چارہ! بڑا غم زدہ ہے"

"ہاں بھئی کیوں نہ ہو۔ دس سال بعد خدا نے بیٹا دیا اور وہ بھی چھ ماہ بعد چھین لیا"

"ہاں!" ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "موت سے کس کو رستگاری ہے ۔۔۔۔"

جبار کا دھیان کسی خاص چیز کی طرف نہ تھا۔ حتیٰ کہ اپنے ہاتھوں پر دھری ہوئی بیٹے کی نعش کا احساس بھی بعض اوقات اس کے شعور سے پرواز کر جاتا۔ بس اسے یہ احساس تھا کہ وہ چل رہا ہے اور اس کے پیچھے محلہ کے کچھ لوگ بے معنی اور بے تکی باتیں کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس نے ان کی باتیں نہ سنی تھیں مگر بغیر سنے ہوئے بھی اسے ان کے فضول ہونے کا اندازہ تھا۔

اتنے میں اس کے ایک دوست نے بڑھ کر کفن میں لپٹا بچہ اس سے لے لیا۔ اس دفعہ جبار نے انکار نہ کیا۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ ہی قدم ملائے چل رہا تھا مگر اب خالی ہاتھ اسے اپنے جسم کا ایک حصہ نہ معلوم ہو رہے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی اور انسان کے بے جان ہاتھ اس

کے ساتھ جوڑ دیئے گئے ہوں۔ اس کا ایک بازو سوگیا تھا اور اب اس میں عجیب قسم کی سرسراہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے بے خیالی میں اپنے چہرہ پر ہاتھ پھیرا تو۔ احساس ہوا کہ اس کی شیو بڑھی ہوئی ہے۔ اس کے ایک دو دوست ساتھ آملے تھے اور وہ اسے اپنے اپنے انداز میں تسلیاں دے رہے تھے۔ اس نے ویران ویران سی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور خاموش رہا۔

سڑک پر کسی انگریزی فلم کے اشتہار پر اس کی نگاہ پڑی اور ایک لمحہ کو اس کی نظریں جیسے اشتہار والی حسینہ کی نیم عریاں چھاتیوں کے درمیان اٹک کر رہ گئیں۔ لیکن صرف ایک سیکنڈ کو اس کے بعد جیسے اس کے ذہن میں کسی بچھو نے ڈنگ مارا اور اس نے پھر نعش کو اپنے بازوؤں پر دھر لیا۔

سامنے چوک پر ٹریفک کے سپاہی نے انہیں دیکھا اور جلدی سے اشارہ بدل دیا۔ انہیں چوک میں سے گزرتے دیکھ کر اکثر موٹریں اور تانگے رک گئے بعض سائیکل والے جنازہ کے احترام کی خاطر سائیکلوں سے اتر گئے۔ اور یہ سب آہستہ مگر یکساں رفتار سے ہاتھوں پر بچہ کی نعش لئے چوک سے یوں گزر رہے تھے جیسے قدیم دور کا کوئی پروہت دیوتا کی بھینٹ لئے بڑے ادب اور احترام سے معبد کی طرف رواں ہو ۔ اور ایسے میں کوئی چلایا۔

"کلمۂ شہادت"

جبار کی زندگی بڑی سیدھی سادی تھی اگر اسے کولہو کے بیل کی زندگی نہ سمجھا جائے تو کم از کم وہ ایسی زندگی ضرور تھی جو خط مستقیم پر چلتی ہو۔ اس کی ماں بچپن ہی سے مر گئی تھی۔ وہ اس وقت شاید پانچ برس کا تھا۔ پتلا دبلا اور کالا کلوٹا سا، جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی اور جس کے ہاتھ میں گڑ کی ڈلی رہتی تھی۔ وہ جبار مردہ ماں کے سرہانے بیٹھ کر خوب ہی رویا تھا۔ یہ سمجھے بغیر کہ موت کیا ہوتی ہے۔ اس کی ماں کی چارپائی کے گرد روتی ہوئی عورتوں نے بھیڑ لگا رکھی تھی۔ اس کی بڑی بہنیں بھی رو رہی تھیں۔ اس کا باپ بھی رو رہا تھا۔ اور گڑ کی ڈلی ہاتھ میں لئے جبار بھی رو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک ایک ہی رفتار سے بہہ رہی تھیں۔ اور اسے مکھیوں نے اپنے نرغہ میں لے رکھا تھا۔

کچھ عرصہ بعد جبار کو ماں کی کمی کا صحیح معنوں میں احساس ہوا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا اور

اس کی ماں اسے باقی سب بچوں کے مقابلہ میں زیادہ چاہتی ہی نہ تھی بلکہ رات کو اسے اپنے ساتھ بھی سلاتی تھی سردی ہو یا گرمی وہ ہمیشہ اس کے ساتھ لپٹ کر سوتا تھا۔ ماں کے جسم کی نرم نرم گرماہٹ اس کے لئے گویا نیند کی گولیوں کا کام کرتی تھی۔ اور اس لئے وہ ماں کی موت کے بعد اولیں راتوں میں خوب ہی رویا اسے نیند نہ آتی۔ گھر بھر پر سوگ کی کیفیت مسلط تھی۔ بات بات پر اس کے باپ اور بہنوں کے آنسو نکل آتے تھے اس لئے کسی نے اس کے رونے کی طرف توجہ نہ دی۔ چنانچہ جبار ہر رات کو روتے روتے ہی سو جاتا۔ ایک رات اس نے خواب میں ماں کی کفن میں لپٹی نعش دیکھی اور ڈر کر اُٹھ بیٹھا۔ اندھیرے کمرہ میں وہ بستر پر بیٹھا یک بیک کر رو رہا تھا "ماں! میری ماں! " اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں رو رہا ہے! میری ماں! "

اس کی بڑی بہن کی آنکھ کھل گئی "کیا ہے بارے؟" اس نے پوچھا۔ جواب میں جبار اس کی چارپائی پر چلا گیا اور بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ لپٹ کر سو گیا۔ بہن کی آنکھیں بھیگ گئیں اور دل میں اس کے لئے پیار کا چشمہ ابل پڑا۔ اس کے بعد وہ بہن کے ساتھ سوتا رہا لیکن کچھ عرصہ بعد ہی وہ گویا ایک دم جوان ہو گئی اور اس نے جبار کو ساتھ سلانا بند کر دیا۔

"نہیں جبار! تم اکیلے لیٹو —— تم ساتھ لگتے ہو تو مجھے گدگدی ہوتی ہے"!

جبار اکیلا سونے لگا تھا اب اسے اکیلے نیند بھی آجاتی تھی اور ماں کی موت ایک بھولا بسرا سپنا معلوم ہوتی۔ کچھ وقت گزرا تو اس میں بعض نئی قسم کی جسمانی تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں جن سے اس کے ذہن میں خیالات کے عجیب سے تانے بانے بنے جانے لگتے۔ وہ کوشش کرتا کہ مکڑی کے جالوں کی طرح ذہن کو ان خیالات سے پاک کرے مگر وہ ناکام رہتا۔ وہ جس عورت کو بھی دیکھتا اس کی نگاہ سینہ کے ابھار پر جم کر رہ جاتی۔ رات کو وہ خواب میں خود کو پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرتے پاتا، بعض اوقات ناشپاتیاں سیب یا انار اس کے ہاتھ میں آتے آتے رہ جاتے اور وہ پتنگ لوٹنے والے لڑکوں کی مانند ان پھلوں کے پیچھے پیچھے دیوانہ وار مارا مارا پھرتا۔ ایک دو مرتبہ اس نے خواب میں اپنی مرحوم ماں اور بڑی بہن کو اس حال میں دیکھا کہ لاحول پڑھتا ہوا جاگ اٹھا۔ وہ کوئی ایسا قابل نہ تھا مگر جب سے ان پریشان خوابوں اور خیالوں کے بھنور میں اس کے ذہن نے ایک بے بس تنکا کی طرح ہچکولے کھانے شروع کئے تھے اس وقت سے تو وہ بالکل

ہی کوڑھ مغز ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ شروع سے ہی خاموش طبع تھا۔ مگر اب تو وہ ہر وقت ہی گم سم رہتا ۔ وہ سر جھکائے سکول جاتا راستہ بھر کبھی نہ نظر اٹھاتا کیونکہ جب کبھی بھی وہ کسی عورت یا لڑکی کو دیکھتا تو اس کی نگاہیں اس کے سینہ پر مرکوز ہو جاتیں وہ ہر وقت خود کو چور چور اور مجرم سا محسوس کرتا۔ سکول میں سارا دن وہ خلا میں نظریں گاڑے بیٹھا رہتا۔ کئی دفعہ ماسٹر سے اس بات پر پٹائی ہو چکی تھی۔

اس نے مرجھ کر میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اور ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔ نہ اس کے باپ کی اتنی استطاعت تھی کہ وہ اسے پڑھاتا اور نہ ہی جبار نے کالج جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کے باپ نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ ایک بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور باقی بہن کا فکر اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔

ملازمت اور اپنی کمائی کے پیدا کردہ احساسِ مسرت نے بھی کائی کی طرح چھائی ہوئی خاموشی کی چادر کو نہ پھاڑا۔ اور وہ ویسا ہی خاموش اور کھویا کھویا سا رہا۔

جب سے وہ مکمل طور سے بالغ ہوا تھا اس کی حالت اور بھی بری تھی۔ اکثر ساتھیوں کے برعکس وہ لباس وغیرہ کے معاملہ میں پہلے کی طرح اب بھی لاپرواہ تھا۔ اسے سیر تفریح کا بھی شوق نہ تھا۔ دفتر سے گھر آتا اور جاسوسی ناول پڑھتا رہتا۔ پھر انگریزی فلمیں اس کی کمزوری بن چکی تھیں ان کے رومانی مناظر اسے انگیٹھی پر دھری کیتلی کے پانی کی طرح کھولا کر رکھ دیتے۔

یوں ہی زندگی گزر رہی تھی کہ اس نے نفیسہ کو دیکھا۔ نفیسہ اس کی بہن کی شادی پر آئی تھی۔ اور کسی دور کے رشتہ سے اس کی بہن لگتی ہوتی تھی۔ نفیسہ کوئی ایسی نفیس چیز نہ تھی۔ گورا رنگ اور عامیانہ نقوش تھے۔ وہ بے تحاشا ہنسنے کی عادی تھی۔ اس کے دانت بھی کوئی خاص خوبصورت نہ تھے۔ البتہ اس کی چھاتیاں بہت بڑی تھیں۔ اتنی بڑی کہ وہ اس کی عمر سے زیادہ عمر کی معلوم ہوتی تھیں اور اس کے جسم کا حصہ نہیں بلکہ کسی ایسی عورت کے جسم کا حصہ لگتی تھیں جو کئی بچوں کو دودھ پلا چکی ہو۔

—— اور جبار نے اچانک خود کو ایک چھوٹا سا بچہ محسوس کیا۔ وہ پانچ سالہ بچہ جو اپنی مردہ ماں کے سرہانے بیٹھا بلک بلک کر رو دیا تھا۔

آج تک اس نے اپنی شادی کے بارہ میں سنجیدگی سے کبھی نہ سوچا تھا لیکن اب اسے احساس ہوا کہ نفیسہ اس کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ لڑکیوں میں دلچسپی نہ لیتا تھا لیکن اس نے نفیسہ کے ساتھ باتیں کرنے کے کئی موقع پیدا کر لئے۔ وہ اپنی دانست میں مطمئن تھا کہ بحیثیت بیوی نفیسہ اسی کے لئے ٹھیک رہے گی۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو اس نے موقع پاکر اپنی شادی کا تذکرہ چھیڑتے ہوئے نفیسہ کے بارے میں اپنی پسندیدگی ظاہر کی اور تھوڑی رد و کد کے بعد اس کا باپ مان گیا۔ دونوں غریب گھرانے تھے اس لئے لمبے چوڑے اہتمام کے بغیر ہی بات پکی ہو گئی۔

شادی کے دن قریب آ رہے تھے وہ بظاہر پہلے ہی کی مانند خاموش اور پرسکون تھا لیکن اب اسے پہلی رات کے بارہ میں پریشانی تھی۔ اس نے دوستوں سے مشورے لئے۔ کتابیں پڑھیں اور کچھ اشتہاروں میں غرق ہو گیا۔

خدا خدا کر کے شادی والا دن بھی آ گیا وہ نفیسہ کو بیاہ کر گھر لے آیا۔ وہ کمرہ میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اور باہر دوست اسے چھیڑ رہے تھے۔ کوئی اس کے کان میں خاص اسرار و رموز پھونکتا تو کوئی اپنے زریں تجربات دہراتا۔ کافی رات گئے اسے فراغت نصیب ہوئی اور وہ دلہن کے کمرہ میں گیا انہیں بے تکلف ہونے میں دیر نہ لگی اور جلد ہی جسمانی بے تکلفی شروع ہو گئی۔

وہ ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے سے ہیروں نے اٹھا رکھا ہو۔ وہ عجیب زیر و بم تھا۔ ایک پرسرور ہم آہنگی کا پیدا کردہ زیر و بم ـــــ اور پھر آسودگی کے گہرے احساس نے اسے اپنے نرم نرم پروں میں لپیٹ لیا۔ وہ اندھیرے میں نفیسہ کے سینہ پر سر رکھے لیٹا تھا۔ وہ خاموش تھی۔ وہ بھی خاموش تھا۔ اس کا چہرہ نرم چھاتیوں میں دھنسا ہوا تھا۔ اور پھر اسے ایسے محسوس ہوا گویا اس کی زندگی کا خلاء پر ہو گیا۔ وہ خود کو ایک نیا جیا محسوس کر رہا تھا اور نفیسہ کے لئے ایک انوکھا پیار اس کے سینہ میں موجزن ہو رہا تھا۔

.... ـــــ لیکن آنسو کیسے ؟

اسے احساس بھی نہ ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن ضبط کی سعی کے ساتھ ہی آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے۔ حتیٰ کہ وہ سسکیاں

لے لے کر رونے لگا۔ اس کا سارا جسم شدتِ گریہ سے کانپ رہا تھا۔

"آپ رو رہے ہیں؟"

نفیسہ نے حیرت سے پوچھا۔ مگر اس نے جواب نہ دیا۔ نفیسہ نے اس کا سر ہٹانا چاہا مگر اس نے نفیسہ کو اپنے بازوؤں سے جکڑ رکھا تھا۔

وہ حیران اور پریشان تھی۔ اس نے اسے بلانا چاہا۔ مگر وہ نہ بولا۔ یہ پچیس سالہ جبار نہ تھا یہ تو پانچ سالہ جبار تھا جو خواب میں ماں کو دیکھ کر اندھیرے کمرہ میں چارپائی پر بیٹھا رو رہا تھا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی اور اس کے بعد سوکھی سوکھی سسکیاں لیتے لیتے ہی وہ ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح اپنی بیوی کے سینہ پر سر رکھے ہوئے سو گیا۔ نفیسہ کا سارا جسم اکڑ گیا تھا۔ مگر اس نے تمام رات اس لئے کروٹ نہ بدلی کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔

شادی کے بعد جبار کی زندگی بڑے مطمئن طریقہ سے بسر ہو رہی تھی۔ دفتر میں اس کی ترقی ہو چکی تھی۔ اور اب وہ معقول پیسے کما رہا تھا۔ اسے نفیسہ سے بے انتہا پیار تھا اور نفیسہ بھی اس پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ ساری تنخواہ اس کے ہاتھ پر دھر دیتا اور اس کے بعد سارے مہینہ کے فکروں سے بے نیاز ہو جاتا۔ نفیسہ پر اس کا انحصار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ وہ ــــ کپڑوں سے لے کر بلیڈ تک ــ اس کی تمام چیزیں خرید کر لاتی تھی۔ اسے یہ پتہ نہ ہوتا کہ کون سے کپڑے کہاں رکھے ہیں۔ وہ خود ہی دھیان رکھتی۔ اس کے کپڑے میلے ہوتے تو وہ صاف کپڑے نکال کر رکھ دیتی۔ اپنے بعض احباب کی مانند اس کی جرابیں یا بنیان گندی نہ رہتی تھیں۔

وہ دونوں بڑے مسرور تھے۔ اگر نفیسہ کو کوئی غم تھا تو وہ اولاد کا۔ اس نے اپنے طور پر ادھر ادھر منتیں مانگیں۔ ایک دو کامل بزرگوں سے تعویذ بھی لے کر آئی۔ لیکن بات نہ بنی۔ ادھر جبار تو ویسے ہی اولاد کے نام سے بدکتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد نفیسہ بھی حالات پر صابر اور شاکر ہو کر بیٹھ رہی۔

ان کی شادی کو دس سال گزر گئے تھے اور جبار کو یہ گذشتہ دس سال ایک خواب ایسے محسوس ہو رہے تھے۔ ایک رات وہ دونوں حسب معمول اکٹھے لیٹے تھے کہ نفیسہ نے خوشی خوشی اسے وہ بات بتائی۔

"میں ماں بننے والی ہوں" جبار حیرت سے بولا۔

"جی!" وہ قدرے جھینپتے ہوئے بولی۔

"مگر — مگر — تم کیسے کہہ سکتی ہو"۔

"کیا مطلب؟"

"ارے بھئی! تمہیں کیسے یقین ہے کہ تم — تم ....." وہ منہ سے لفظ "ماں بننے والی ہو" نہ نکال سکا اور فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔

"واہ! میں نہ جانوں گی تو اور کون جانے گا؟"

پھر وہ سمجھ گیا اور خاموش ہو گیا۔

"آپ کچھ چپ سے ہو گئے ہیں" نفیسہ بولی "کیا آپ کو خوشی نہیں؟"

جبار نے اس کی طرف ایک دو دفعہ آنکھیں جھپکا کر دیکھا۔ اور پھر بولا "خوشی — ؟ کچھ کہہ نہیں سکتا"

"کیوں؟"

"دراصل یہ سب اتنا اچانک ہے کہ ...."

"اتنا اچانک کیسے"۔ وہ تنک کر بولی "شادی کو دس سال ہو چکے ہیں۔ میں نے منتیں مانیں۔ تعویذ کئے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اچانک سا ہے"۔

"نہیں! نہیں!!" وہ جلدی سے بولا "میرا یہ مطلب نہ تھا"۔

"تو پھر؟" وہ اس کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس نے کوشش کی کہ چہرہ پر مسکراہٹ لا کر اسے اپنی خوشی کا یقین دلائے۔ مگر اس کوشش میں ہونٹوں کے کونے محض پھیل کر رہ گئے۔ اور جب اس نے کچھ کہنا چاہا تو صرف ہکلا کر رہ گیا۔ وہ اپنی بیوی کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور سر جھکا لیا۔ نفیسہ رونے لگ گئی۔ جبار کا دل تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے اسے خاموش کرانے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا مگر اس کا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ وہ اٹھ کر دوسری چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے اسے منانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن جب دیکھا کہ وہ نہیں مانتی تو وہ خاموشی سے اپنے بستر پہ لیٹ گیا۔

اس کی نگاہیں چھت کی کڑیوں میں الجھی ہوئی تھیں اور ذہن خیالات سے بالکل خالی

تھا لیکن پھر بھی وہ ایک غیر مرئی سا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ چارپائی کی طرف دیکھا مگر وہ ویسے ہی اس کی طرف پیٹھ کئے لیٹی تھی۔ اسے آج نہ جانے کیوں اپنا بچپن پھر یاد آ رہا تھا۔ وہ کالا کلوتا لڑکا جو بہتی ناک کو الٹے ہاتھ سے پونچھتے ہوئے بھنبھناتی مکھیوں کے دائرہ میں گڑ کی ڈلی چوستا رہتا تھا —— وہ بچہ جسے صرف ماں کے ساتھ لپٹ کر ہی نیند آتی تھی۔

آج بھی اس کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ دراصل اسے اکیلے لیٹنے کی عادت ہی نہ تھی۔ کافی دیر تک وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے بعد وہ دوسری چارپائی پر چلا گیا اور نفیسہ کو اپنے ساتھ لپٹا کر ہر ممکن طریقہ سے اپنی خوشی کا یقین دلایا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے نفیسہ کی حالت خراب تر ہوتی گئی۔ آج کل جبار کو ایک ہی کام تھا وہ ہر وقت بی کمپلیکس پروجیسٹین اور سٹامن کے انجکشن اور وٹامن کی ٹکیاں خریدتا رہتا۔ نفیسہ بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ سر چکرانا، دل ڈوبنا اور بعض اوقات تو وہ پریشان ہو کر پہروں روتی رہتی۔ کبھی یہاں درد ہے تو کبھی وہاں تکلیف۔ نفیسہ سارا سارا دن مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑی رہتی۔ اور جبار کو ایک مخصوص ڈگر پر چلتی زندگی میں عجیب سی افراتفری محسوس ہوتی۔ بعض اوقات وہ آنے والے بچے کے بارہ میں بڑی تلخی سے سوچتا۔ جو بچہ پیدائش سے قبل ہی اپنا وجود اس شدت سے تسلیم کرا رہا ہو وہ پیدائش کے بعد کیا کیا گل نہ کھلائے گا۔

پیدائش کا وقت آنے تک نفیسہ بالکل ہی مرجھا کر رہ گئی۔ زرد رنگت اور سوکھے بازوؤں اور ٹانگوں کے درمیان اس کا پیٹ ہی نمایاں ترین چیز تھی۔ اب وہ ایک عجیب سی مضحکہ خیز چیز بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اچار کھاتی اور چکنی مٹی چاٹتی۔ جبار اسے اور اس کی حالت کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا۔ اسے دبانے کے لئے ایک دائی مستقل طور سے آتی تھی اور ہر چوتھے روز وہ ہسپتال جانا پڑتا۔

جبار تنگ آ چکا تھا نہ چین نہ آرام — وہ سوچتا پتہ نہیں لوگ کیسے بچوں کی فوج کی فوج پیدا کر لیتے ہیں۔ یہاں تو ایک ہی نے طبیعت صاف کر کے رکھ دی ہے اگر ان بکھیڑوں

میں پڑنے ہی کا نام باپ بننا ہے تو باز آئے اس باپ بننے سے۔

جب نفیسہ کے دن بڑھ گئے تو جبار کو علیحدہ سونا پڑا۔ اور یہ اس کے لئے ناقابل برداشت سزا کے مترادف تھا۔ بعض اوقات وہ تمام رات کروٹیں بدل بدل کر گزار دیتا۔ اس اعصابی بوجھ نے اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا کر دیا تھا۔ اور کچھ نہ کر سکتا تو نفیسہ سے ہی اُلجھ پڑتا۔ اور پھر جب وہ روتی تو پشیمان ہو کر اس کے آگے پیچھے دوڑا پھرتا۔ اب اسے اپنی قمیصوں وغیرہ کے ٹوٹے ہوئے بٹن خود ہی لگانے پڑتے۔ ادھر وہ دیکھتا کہ نفیسہ چھوٹے چھوٹے کپڑے سینتی رہتی ہے تو اس پر جیسے جھنجھلاہٹ کا دورہ پڑ جاتا۔ جواب میں بعض اوقات نفیسہ بھی اس پر برس پڑتی اور پھر جب وہ روتی تو یہ اسے مناتا ــــــ غرض کہ ان دنوں گھر کی فضا کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔

اسی طرح روتے پیٹتے نو ماہ پورے ہوئے۔ نفیسہ کی خراب صحت کے پیش نظر اسے ہسپتال میں لے گئے۔ وضع حمل کے دوران جبار وارڈ کے سامنے پریشانی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ اس نے نہ جانے کتنے سگریٹ پھونک ڈالے اور آخر ایک طویل وقفہ کے بعد ــــــ جو جبار کے لئے صدیوں سے کم نہ تھا ــــــ نرس نے اسے مسکراتے ہوئے مبارکباد دی "بیٹا!" اس نے بتیسی نکال کر اسے بتایا۔ اور گزشتہ نو ماہ میں پہلی مرتبہ جبار کو ایک عجیب و غریب مسرت اور فخر کا احساس ہوا۔ وہ ایک بچہ کا باپ بن چکا تھا۔ وہ بچہ جو اس کی نسل چلانے کا باعث بنے گا۔ محمد اصغر ولد عبدالجبار ــــــ یہ نام نفیسہ ہی کا سوچا ہوا تھا۔ اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ محمد اصغر ولد عبدالجبار ــــــ ولد عبدالجبار ــــــ ولد عبدالجبار۔ اب وہ ایک باپ تھا!

لیکن یہ فخر و انبساط دیرپا نہ ثابت ہوئے۔ جب نرس نے ایک کالے اور سوکھے سے بچے کی طرف اشارہ کیا "یہ [illegible] بچہ"، اس نے نرس سے نہیں بلکہ خود سے سوال کیا۔ اس کے لئے اتنی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ بچہ کے سر پہ سیاہ گھنگھرالے بال تھے آنکھیں بند تھیں اور گول منہ کے ہونٹ نیم وا تھے۔ پیشانی اور گالوں پر بھی بالوں کی ہلکی سی تہ تھی۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

———محمد اصغر ولد عبدالجبار!

یہ وہ محمد اصغر ہے جس کے لئے نفیسہ اور عبدالجبار نو ماہ تک سکھ کا سانس نہ لے سکے۔ اسے کراہت کا عجیب و غریب سا احساس ہوا۔ اس نے منہ پھیرا اور نفیسہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے چہرہ پر نقاہت اور تکان کے باوجود بھی طمانیت کا گہرا احساس کندہ تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"کیسا ہے؟"

نفیسہ نے اس مصور کی مانند پوچھا جو اپنی شاہکار تصویر کے بارہ میں رائے طلب کر رہا ہو "بہت پیارا"، جبار نے بمشکل جھوٹ بولا۔

اصغر پیدائش کے بعد بھی ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ اس کی صحت پہلے دن سے ہی خراب تھی۔ ادھر نفیسہ کی حالت یہ تھی کہ وہ جبار اور خود کو بھولے ہوئے صرف ننھے اصغر کے لئے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے کبھی حرارت رہتی۔ حرارت ٹھیک ہوتی تو جلاب لگ جاتے۔ ان دونوں سے نجات ملتی تو کوئی تیسرا بکھیڑا اکھڑا ہو جاتا۔ غرضیکہ اس کے مٹھی بھر وجود نے میاں بیوی کے سکھ چین کو اپنی ننھی مٹھی میں گویا بند کر رکھا تھا۔ بعض اوقات بلکہ عموماً وہ راتوں کو اس بری طرح چیخ چیخ کر روتا کہ جبار کے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے۔ نفیسہ رات رات بھر جاگتی اور دن کو سرخ آنکھوں سے اسے بہلاتی رہتی۔

لوگ جبار کو اس کی خوش قسمتی پر مبارکباد دیتے کہ دس سالوں بعد خدا نے اسے ایک بیٹے سے نوازا۔ اس نے بھی لڈو بانٹے اور دوستوں کی ٹی پارٹی کی تھی لیکن اس کے دل پر عجیب سی بے زاری مسلط تھی۔ اور جیسے جیسے اصغر کی عمر اور اس کے ساتھ اس کی بیماری بڑھتی گئی۔ اس کی بے زاری میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

اسے نفیسہ کے ساتھ لیٹے اور اسے پیار کئے ہوئے گویا صدیاں بیت چکی تھیں۔ نفیسہ بھی اب اس کی طرف پہلی سی توجہ نہ دیتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے کھانے پینے کی تکلیف نہ تھی نہ ہی بٹن لگانے پڑتے۔ اور نہ ہی جرابیں دھونی پڑتی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ نرم گرم قرب اسے میسر نہ تھا۔ اور وہ اس بچہ کی طرح روٹھا روٹھا اور اینٹھا اینٹھا سا

نئے بھائی کی پیدائش کے بعد ماں کی عدم توجہی کا شکار ہونے کے بعد دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔

ایک رات وہ خود ہی اس کے بستر پر آگئی وہ تو سو چکا تھا لیکن نفیسہ نے اسے جگا لیا۔ اسے ایک مرتبہ پھر جسمانی لحاظ سے اپنے قریب دیکھ کر اس کے جسم میں دفورِ شوق سے کپکپی کی لہر دوڑ گئی لیکن ابھی شوق کی تکمیل ابتدائی مراحل پر ہی تھی کہ اصغر اس زور شور سے رویا کہ ایک لمحہ میں نفیسہ چھلانگ مار کر اپنی چارپائی پر جا پہنچی۔ اور پھر اسے چُپ کراتے کراتے وہ خود بھی سو گئی لیکن جبار کی نیند تو اڑ چکی تھی۔ وہ کافی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے اپنا تمام جسم شعلوں کی آنچ سے پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اُٹھا اور ٹھنڈے پانی کے دو گلاس پی کر پھر چارپائی پر آلیٹا۔ لیکن چین کہاں ؟

وہ اُٹھ کر صحن میں آ گیا۔ نصف شب کا چاند چمک رہا تھا مگر اسے دودھیا چاندنی میلی میلی سی لگ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے تپتے گالوں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ بے تابی سے اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ اسے وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب ان کے درمیان اصغر ایک خلیج کی صورت میں حائل نہ ہوا تھا۔ اسے اپنا ننھا بیٹا ایک غاصب مہمان معلوم ہو رہا تھا اور مہمان بھی بن بلایا! اس سے قبل ان کی زندگی ایک ایسی ندی کی مانند تھی جو پیار کی ندی میں ہر دم رواں دواں ہو۔ مگر اب تو حال ہی اور تھا!

اس مریض بچہ نے اس کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ وہ کافی دیر یوں ہی ٹہلتا رہا نہ مرتا ہے نہ چین لینے دیتا ہے۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ کیوں نہ — کیوں نہ .....

مگر وہ اس سے آگے اور کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کا ذہن جیسے بحران کا شکار تھا۔ وہ خود کو پاگل اور وحشی محسوس کر رہا تھا۔ یہ میں کیا سوچ رہا تھا — اس نے بے بسی سے سوچا اور پھر پیشانی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ سردی نہ تھی لیکن اب وہ سردی محسوس کر رہا تھا۔ وہ ٹھنڈی ہوا جو کچھ دیر پہلے اسے خوشگوار لگی تھی اب چھری کی طرح کاٹتی ہوئی برفیلی ہوا معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھا اور اندر کمرہ میں آ گیا۔ اس کا بیٹا اس کی بیوی کے بازو پر سر رکھے میٹھی نیند سو رہا تھا۔ مسلسل بیماری نے

اس کے چہرہ کو پچکا دیا تھا۔ اور اب وہ ایسے لگتا جیسے ہڈیوں کے ڈھانچے پر پتلا سا گوشت منڈھ دیا ہو۔ وہ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس نے میری نسل چلانی ہے۔ اس نے باپ دادا کا نام روشن کرنا ہے۔ اسے میری بیوی نے میرے تخم سے جنم دیا ہے — محمد اصغر ولد عبدالجبار —— محمد اصغر ولد عبدالجبار —

اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اصغر کی حالت نہ ٹھیک ہونی تھی اور نہ ہوئی۔ اور ایک دن وہ دوا پی کر سویا تو پھر نہ جاگا۔ کافی دیر تک تو پتہ ہی نہ چلا۔ لیکن نفیسہ نے جب اس کی نبض اور دل کی دھڑکن دیکھی تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ جبار نے اسے چپ کرانا چاہا مگر وہ اس کے کندھے سے لگی روتی رہی۔ لیکن وہ کوشش کے باوجود بھی آنکھوں سے آنسو نہ نکال سکا۔ اس کی آنکھوں میں صحراؤں ایسی ویرانی تھی اور صحراؤں کی مانند ہی وہ بے آب تھیں۔

—— .... اور پھر اس نے کفن میں لپٹی اپنے بیٹے کی نعش کو اٹھایا اور روتی ہوئی نفیسہ کو گھر میں چھوڑ محلہ والوں کے ساتھ قبرستان کو روانہ ہو گیا۔

اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات اور احساسات سے عاری تھا۔ حتیٰ کہ جب اس نے اصغر کے مردہ جسم کو اپنے بازوؤں میں لیا تو اس وقت بھی اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ ہو سکتا ہے یہ خود ضبطی کا نتیجہ ہو۔

نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے بعد وہ سب پہلے سے کھدی ہوئی قبر کی طرف چل دیئے۔ ننھی منھی سی قبر تھی۔ جسے دیکھ کر باقی لوگ بلا کہے ہی کلمۂ شہادت پڑھنے لگے۔ اس نے اصغر کو قبر میں اتارا۔ ایک دوسرے آدمی نے پتھر کی ایک سل سے اس کا منہ پاٹ دیا۔ اور پھر وہ سب کلمے اور آیات پڑھتے ہوئے مٹی کے ڈھیلوں سے قبر کو بھرنے لگے۔ جلد ہی قبر بن گئی۔ چھوٹے سے بچہ کی چھوٹی سی قبر!

وہ سب قبر کے سامنے کھڑے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ اس نے خالی خالی آنکھوں سے مٹی کے اس ڈھیر کو دیکھا جس کے نیچے اس کی بیوی کی کوکھ سے جنم لینے والا اس کا بیٹا ابدی نیند سو رہا تھا —— اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے

عاصی کرنالی

پکھراج

پکھراج کئی دن سے بھاگ نکلنے کا موقع دیکھ رہی تھی اور ایک رات۔ جب گھٹا سے زمین آسمان تاریک تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح چکلے سے بھاگ نکلی۔ تھانے میں اور پھر عدالت میں جو بیان دیا اس کا آخری حصہ یہ تھا۔ کہ وہ گناہ اور مسلسل گناہ کی بھیانک زندگی سے تنگ آگئی ہے اور اب اس ذلیل پیشے سے تائب ہو کر شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ عدالت نے اسے ادارۂ اصلاح کے سپرد کر دیا۔ اور ادارۂ اصلاح نے شہر کے ایک شریف آدمی نجیب سے اس کی شادی کر دی۔

پکھراج علاقے کی ایک مشہور طوائف تھی۔ نوجوان۔ حسین اور تھوڑا بہت ناچنے گانے والی جب وہ تین سال کی تھی تو اسے بردہ فروشوں نے اغوا کر لیا تھا اور چکلے کے چوہدری کے ہاتھ بیچ کر دام کھرے کر لئے تھے۔ جب پکھراج نے شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایک دکان پر سجا ہوا پایا۔ جس طرح حلوائی مٹھائی گوشت کو چاندی سونے کے ورق لگا کر سجاتے ہیں —— —— خریدار آتے۔ اجرت دیتے اور مال خریدتے —— اور یہ سلسلہ، یہ چکر برابر جاری رہتا —— پکھراج کچھ دیر یہی سمجھتی رہی کہ عورت کا مصرف یہی ہے —— وہ اسی لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد یہی ہے کہ وہ بکتی رہے —— وہ بکتی رہے —— کوّے اور گدھ آتے رہیں۔ اسے نوچتے، چچوڑتے اور نگلتے رہیں —— —— یہ بات اس کے دل میں بٹھا دی گئی۔ کہ عورت کی تقدیر یہی ہے اور تقدیر پر شاکر رہنا چاہیئے —— اور ساری دنیا ایک بازار ہے —— اور ساری عورتیں کھلونے

ہیں مردوں کا دل بہلانے کے لئے اور چکنا چور ہونے کے لئے ——— پکھراج حالات پر شاکر رہی۔ لیکن جب اسے وہ چار جیبوں میں گانے ناچنے کے لئے بلایا گیا۔ تو اسے پتہ چلا کہ عورت کا پایہ یہی ہوتا ہے۔ وہ پردے میں سمٹی سمٹائی ایک ڈولی میں بیٹھتی ہے۔ وہاں ایک مرد ہوتا ہے جو ڈولی پر اس طرح اپنا سایہ پھیلائے رکھتا ہے۔ جیسے مرغی اپنے کمزور بچوں پر اپنے پر پھیلاتی ہے اور یہ سایہ عورت کے سر پر رہتا ہے ——— ایک سایہ طاقتور اور گنجان سایہ اور اس سائے کے خنک ماحول میں عورت بیوی بنتی ہے اور ماں بنتی ہے۔ پکھراج محسوس کرنے لگی کہ میری زندگی میں بے شمار مرد ہیں۔ آتے جاتے مرد، ڈھلتے سایوں کی مانند ——— میں کسی سائے میں سکھ کی نیند نہیں سو سکتی۔ ہر سایہ مجھے تپتے ہوئے صحرا میں دھکیل جاتا ہے۔ ہر پرچھائیں مجھے دھوپ کے حوالے کر جاتی ہے۔ ہر مرد مجھے سونگھ کر نوچ کر اور داغ کر تیزی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ کوئی سایہ طاقتور اور پائیدار نہیں!! ——— ——— وہ سوچنے لگی۔ اگر ساری دنیا بازار ہے اور ہر عورت ایک بکتا ہوا سودا ہے تو پھر عورت کے مختلف نام کیوں ہیں۔ بیٹی۔ بہن۔ بیوی اور ماں! ——— عورت جب ان رشتوں سے وابستہ ہوتی ہے تو مرد اس کا احترام کیوں کرتے ہیں۔ اس کے قدم کیوں چومتے ہیں۔ اس کے ساتھ نظر کیوں نہیں اٹھاتے۔ عورت ناموں کے یہ لیبل چپکا کر شرافت کا مرکز کیوں بن جاتی ہے ——— شاید عورت کا ایک نام طوائف بھی ہو۔ لیکن طوائف کا لیبل چپکا کر عورت کھلا دسترخوان اور بہتی نالی کیوں بن جاتی ہے! ——— یہ سوالات آخر اس کے ذہن میں سلگتے رہے اور ایک بار جب چوہدری نے اسے حکم دیا کہ آج اسے بارہ گھنٹے ڈیوٹی پر رہنا ہے اس لئے کہ اس کی پڑوسن کو کوئی مرد خطرناک بیماری لگا گیا ہے اور وہ کافی صحت مند ہے اور اس کا نقصان پورا کر سکتی ہے۔ اور اس روز میلہ تھا اور چکلا انسانی درندوں سے لبریز تھا۔ پکھراج کو محسوس ہوا کہ وہ عورت نہیں ہے۔ لوہے کی ایک مشین ہے تو اس نے اچانک فیصلہ کر لیا کہ وہ اس چکر سے نکل کر رہے گی جب اپنی ڈیوٹی بھگتا کر اس نے کرسی اٹھائی اور کواڑ بند کیے تو وہ تین گھنٹے بے سدھ پڑی رہی۔ بے حس و حرکت۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا جسم اس سے الگ ہو گیا ہے اور جیسے وہ پتھر کا ایک بُت ہے۔۔

—— لیکن اس کا دماغ متحرک تھا اور اس کے خیالات شعلوں کی طرح اس کے ذہن میں چمک رہے تھے اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسے فریب دیا جا رہا ہے —— عورت ہرگز ہرگز کھلونا اور مشین نہیں ہے۔ خدا اس قدر ظالم نہیں ہے کہ وہ مرد کو چکی کا پاٹ بنا دے اور عورت کو پِسا ہوا گھُن۔ خدا اتنا رحیم ضرور ہوگا کہ اس نے مردوں اور عورتوں پر یکساں بوجھ ڈالا ہوگا —— اور دُکھ میں دونوں کو مناسب حصہ دیا ہوگا —— اور پھر اسے وہ ڈولیاں —— وہ سمٹی سمٹائی دلہنیں اور وہ طاقتور اور پائے دار ساتھی یاد آ گئے —— اور ایک رات وہ بھاگ نکلی —— اور ادارہ اصلاح نے نجیب خاں سے اس کی شادی کر دی۔

نجیب خاں کسی دفتر میں سینئر کلرک تھا —— نیک۔ نمازی۔ با اخلاق اس کے گھر میں اس کا چھوٹا بھائی حبیب خاں تھا اور بس!

ماں باپ ۱۹۴۷ء میں حادثے کی نذر ہو گئے تھے۔ بہن سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ حبیب خاں۔ نجیب خاں کا بالکل الٹ تھا۔ آوارہ۔ کھلنڈرا۔ اوباش طبع نوجوان شہر کے چکلے میں اس کی آمد جا رہتی تھی۔ اور پکھراج سے بھی اس کی آشنائی تھی۔

نجیب خاں کی شادی پر سب سے زیادہ خوش وہی تھا۔ اس نے سوچا اب مجھے بازار جانے کی ضرورت نہیں۔ جوانی کی سجی سجائی دکان خود گھر میں چلی آئی ہے —— نجیب خاں جب نکاح کر کے پکھراج کو گھر لایا تو حبیب خاں سے اس کا تعارف کراتے ہوئے اس نے کہا۔

"حبیب یہ تمہاری بھابی ہیں —— پکھراج ہے ان کا نام شاید تمہیں معلوم ہو۔ میں خود بھی چھپانا نہیں چاہتا۔ ان کی زندگی کا کچھ وقت انسانی بھیڑیوں کی شکارگاہ میں گزرا ہے —— یہ تین سال کی تھی۔ فرشتوں کی طرح معصوم اور بھیڑ کے بچے کی طرح ناتواں۔ جب بھیڑیوں نے پہلی بار ان پر ہاتھ ڈالا اور ان کا بے بس وجود —— میں فقرہ ختم کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا۔ حبیب خاں —— بس اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم انہیں بھابی کہہ کر پکارو اور بہن سمجھ کر ان کی عزت کرو۔"

حبیب خاں نے پکھراج سے معانقہ کیا اور زور سے ہاتھ دبایا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ نجیب خاں جا چکا تھا۔ حبیب خاں نے کہا ——

" بھابی مجھے پہچانتی ہو۔ کئی بار تو آیا ہوں تمہارے پاس "۔

" میں نہیں پہچانتی " —— پکھراج نے کہا " میں نے اپنا ماضی اپنے ذہن سے نوچ کر پھینک دیا ہے۔ میں آج محسوس کر رہی ہوں جیسے میں نے دوبارہ جنم لیا ہے "۔

وہ طنز آمیز ہنسی ہنسا " اچھا یہ فلسفہ چھوڑو —— لو یہ سگریٹ پیو "۔

میں سگریٹ پینا چھوڑ چکی ہوں۔ شکریہ۔

حبیب خاں نے ایک معنی خیز قہقہہ لگایا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اگلی شام وہ نذر نگار ہوٹل میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا دوست اسے اس کے بھائی کی مبارک باد دے رہے تھے۔ وہ حبیب خاں کے دوست تھے اس لئے اسی قماش کے لوگ تھے۔

" پھلجڑی اڑا لی تمہارے بھائی نے " ایک دوست نے کہا

" تتلی کو قبضے میں کر لیا ہے۔ بڑا خوش نصیب ہے یار تمہارا بھائی "۔ یہ دوسرا دوست تھا۔ تیسرے نے بات کو بڑھایا " پکھراج کے اڑنچھو ہونے سے چکلہ سنسان ہو گیا ہے۔ جیسے ساری بتیاں ایک دم گل ہو گئی ہوں "۔

حبیب خاں نے کہا " کیوں نہ گل ہوں۔ سارا پاور ہاؤس تمہارے گھر آ گیا ہے "۔

دوست قریب کھسک آئے اور طے جلے فقرے کانوں سے ٹکرانے لگے

" حبیب خاں بہتی گنگا گھر ہی آ گئی ہے۔ خوب ہاتھ دھو۔ میرے یار "۔

" جب درخت پھلدار ہو اور شاخیں جھکی ہوئی ہوں تو اس وقت موقع کو گنوانا سب سے بڑی حماقت ہے "۔

" ہمیں بھی یاد رکھنا حبیب خاں! دوستوں کے حقوق ہمیشہ قائم رہتے ہیں —— "

حبیب خاں نے کہا تم ہی بولتے رہو گے۔ مجھے بھی تو کچھ کہنے دو۔ سو وہ کمبخت کچھ بدلی بدلی سی نظر آتی ہے۔ کل میں نے ذرا سا پرکھا تھا۔ کہتی تھی آج میں نے دوبارہ جنم

لیا ہے"۔

اس بات پر قہقہے گونجتے رہے۔ طنز آمیز قہقہے اور پھر وہ آوازیں ——— :

"——— حبیب خاں۔ رنڈی ہمیشہ رنڈی رہتی ہے۔ زمانہ بدل جائے۔ اس کی فطرت نہیں بدلتی ———"

"——— جو بازار میں بیٹھ چکی ہو۔ اور ہزاروں کی بغل میں سو چکی ہو وہ گھریلو بن ہی نہیں سکتی"۔

"یہ چاٹ اور ذائقہ عجیب بلا ہوتا ہے۔ چھوٹتا ہی نہیں کبھی" ——— میرے دوست حبیب خاں! خود بھی کام نکالو۔ دلالی بھی کرو ——— تمہارے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں ———"

"——— چند دن کی بات ہے جو اس نے شرافت کا بھیس بدلا ہے۔ دیکھ لینا خود تمہیں پٹائے گی ———"

"——— خود میرا بھی خیال ہے دوستو!" ——— حبیب خاں نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا "طوائف ہمیشہ طوائف ہے ——— چور۔ چوری سے جائے۔ ہیرا پھیری سے نہیں جاتا ———"

"——— تو پھر کیا پروگرام ہے؟" ——— ایک دوست نے اشتیاق سے بے تاب ہو کر کہا۔

"بھائی بات یہ ہے"۔ حبیب خاں نے کہا "پھل کھانے کا حق تو اسی نیاز مند کو ہے"۔

اور ایک دوست باآواز بلند کہا ———

"بھائی وہ تو پھلوں بھری پلیٹ ہے۔ چلو پہلے تم ہی سہی۔ ہم بعد میں سہی۔ بات تو ایک ہی ہے۔ وہی پھل کھانا ———"

اس پر سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ حبیب خاں سے مصافحہ کرتے ہوئے سب کی آنکھیں ایک ہی بات کہہ رہی تھیں ———

"ہمیں بھول نہ جانا بھائی ———

چند دنوں بعد کی بات ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ نجیب خاں اپنے دفتر میں تھا۔ حبیب خاں اپنے کمرے میں۔ پکھراج کھانا کھا کر لیٹی ہی تھی کہ حبیب خاں اس کے کمرے میں آگیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

"آؤ حبیب خاں۔ وہاں کرسی پر بیٹھو۔ کہو کیسے آئے ؟"

"پکھراج۔ یہ لبادہ اتار دو۔ یہ بھیس جو تم نے بدل رکھا ہے اسے ترک کر کے اصلی روپ میں آجاؤ"۔

"میں سمجھی نہیں"۔

"تم ایک طوائف ہو نا !"

تھی۔ اب نہیں ——"

"طوائف ہمیشہ طوائف ہی ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے تم نے میرے بھائی سے شادی کر لی ہے۔ اس طرح تمہیں ایک مستقل سہارا مل گیا ہے۔ یا یوں سمجھو تم نے ایک مرد سے بڑی اجرت پر سودا کر لیا ہے۔ لیکن تم یہاں بھی شرافت کی آڑ لے کر چھوٹے پیمانے پر ایک چکلہ شروع کر سکتی ہو —— گاہک پھانسنے کا ذمہ لے سکتا ہوں —— وہاں چوہدری تمہیں پیٹ بھر روٹی نہ دیتا تھا۔ یہاں منہ مانگی قیمت شریف اور معزز گاہک اور تم در پردہ وہی پکھراج اور بظاہر نجیب خاں کی بیوی ——! لیکن میری جان پکھراج۔ ایک شرط ہے کہ میرا تمہارا سودا فری رہے گا۔ آخر کمیشن بھی تو ملنا چاہیئے مجھے —— تو پھر معاملہ ٹھیک ہے نا ——؟ تم خاموش ہو۔ گویا متفق ہو۔ کیوں نہیں۔ تمہارے مطلب کی جو کہہ رہا ہوں —— آخر طوائف پھر طوائف ہے —— وہ شریف کیسی ہو ہی نہیں سکتی —— اچھا تو میں دروازہ بند کر لیتا ہوں اور اندر سے زنجیر چڑھائے دیتا ہوں۔ اس پلیٹ کا پھل سب سے پہلے ......"

وہ فقرہ پورا نہیں کر سکا تھا کہ اس کے جسم سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ پکھراج نے اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا تھا

پکھراج نے جو عدالت میں بیان دیا اس کا ایک فقرہ یہ ہے ——

"میں نجیب خاں کی ایک شریف اور باعفت بیوی ہوں۔ حبیب خاں نے مجھے طوائف بنانا چاہا ! ...

...... میں نے اسے قتل کر دیا"

(بشکریہ حرم لاہور)

عرش صدیقی

کُتّے

لڑکیاں گھر شادی ہونے پر چھوڑتی ہیں۔ لیکن پروین کو اپنا، اپنے پیارے پاپا کا گھر پاپا کے اک دنیا سے روٹھ جانے پر چھوڑنا پڑا۔ یہ کوئی شادی تو نہ تھی کہ ماں باپ کے گھر سے رخصت ہوتے وقت وہ قیمتی جہیز ساتھ لے کر جاتی۔ اس کا اسے ہوش ہی کب تھا ——— مگر ڈولی اسے اتنی عزیز تھی اس قدر پیاری تھی کہ جب وہ چچا کے گھر پہنچی تو ڈولی اس کے ساتھ اس کی گود میں تھی۔

اب اس واقعہ کو دس ماہ ہونے کو آئے تھے۔

ممی تو اسے قطعاً یاد نہیں تھیں۔ ماں باپ کی یہ اکلوتی بچی ابھی دو برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ ممی اس جہانِ فانی سے بہت دور جا بسی تھیں۔ ہاں ممی کا ذکر اس نے بارہا سنا تھا۔ پاپا اکثر ان کی تسبیح پڑھا کرتے تھے اور گھر کی پرانی خادمہ ان کے ذکر سے کبھی نہ تھکتی تھی۔ ان کی کتنی ہی تصویریں پاپا کے البم میں محفوظ تھیں اور وہ دو بڑے سائز کی تصویریں جو پاپا نے اپنے کمرے میں سجا رکھی تھیں اتنی پیاری تھیں کہ دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہو۔ پروین نے بارہا چاہا کہ ممی کی ان تصویروں میں جان پیدا ہو جائے مگر یہ کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تصویر بہرحال تصویر ہے۔ اس میں رنگ ہو سکتا ہے، حسن ہو سکتا ہے، زندگی تو نہیں ہو سکتی۔ تصویر کی انتہائی تعریف یہ ہے کہ یہ تصویر تو بس جیسے منہ سے بولنے لگی ہے گویا اصل تعریف یہاں بھی زندگی کی حرکت کی ہے رنگوں کی نہیں کہ محض رنگ تو بے جان چیزیں ہیں۔

اس شے کا غم جو، بچی ہونے کے باوجود کبھی اپنے قبضے میں نہ رہی ہو اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا اس شے کے چھن جانے کا ہوتا ہے جو برسوں اپنے پاس رہ چکی ہو اور دل کو بے حد عزیز بھی ہو

بچہ بے جان کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ چند لمحے یا چند دن ان کو اپنے پاس رکھتا ہے تو ان سے اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ کسی کھلونے کے ٹوٹ جانے یا گم ہو جانے پر وہ گھنٹوں بلک بلک کر روتا ہے۔ ماں کو تو یوں سمجھو کہ پروین نے دیکھا ہی نہ تھا کیونکہ دو سال کی بچی کو کیا یاد رہ سکتا ہے کہ اس کی ماں کون تھی کیسی تھی۔ لیکن پاپا تو ایک عمر اس کے ساتھ رہے تھے۔ ان کے جانے کا جس قدر بھی غم ہوتا، کم تھا

وہ چچا کے گھر آئی تو پاپا کی موت کا روح فرسا منظر اپنے ذہن میں محفوظ لائی تھی۔ گھر میں کہرام مچا تھا یہ اس کی باقاعدہ زندگی کا اولین اور عظیم ترین صدمہ تھا اور اب اس کے بعد کوئی اور صدمہ، صدمہ نہ تھا۔ جب لوگ اس کے پیارے پاپا کو کندھوں پر اٹھائے لئے جا رہے تھے تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے آرام سکھ اور چین کا جنازہ لئے جا رہے ہوں۔

گھر کی حالت بالکل ابتر تھی۔ وہاں سوائے اس کے اور اس کی بڑی آپا کے اور کون تھا جو گھر کا خیال رکھتا مگر پروین کو اس بات کا ہوش ہی کہاں تھا۔ پھوپھی روتی دھوتی آئی تھیں مگر جلد ہی شاید اس خیال سے کہ گمشدہ چیزوں کا غم کرنا بے کار ہے خود کو سنبھال کر موجودہ اشیاء میں دلچسپی لینے لگیں اور قبل ازیں کہ کوئی گھر کی طرف دھیان دینے کے قابل ہو سلائی کی دونوں مشینیں، ریڈیو، چاندی کا پاندان اور ڈنر سیٹ جو پروین کے پاپا نے ابھی ابھی منگوایا تھا اور جو ابھی استعمال میں بھی نہ آیا تھا، اپنے ہاں چلتا کئے ---- خالہ قرابت سے بہنیں جہاں دیدہ عورت تھیں۔ سمجھ گئیں کہ پروین کی پھوپھی کوئی کارہائے نمایاں سرانجام دے چکی ہیں۔ صاف صاف کہنا مناسب نہ سمجھا اس لئے جملہ عورتوں کو یکجا کر کے عربی کے الفاظ سے پُر اردو میں ایک تقریر کی جس میں دنیا کی بے ثباتی کے احوال کے بعد انہوں نے بتایا کہ یتیم بچوں کے مال کو ہاتھ لگانا جرم ہے ---- اور پھر انہوں نے بغیر کسی چیز کو ہاتھ لگائے ملازمہ کے ذریعے اپنی بہن کے تمام قیمتی ملبوسات و زیورات اپنے گھر بھجوا دیئے۔ ان کا جواز یہ تھا کہ ان کے بہنوئی کے خاندان کے لوگ ان کی بہن سے متنفر تھے، اس لئے صرف وہ خود ہی اس قابل تھیں کہ بہن کی یادگاروں کی حفاظت کر سکیں۔ کہتے ہیں کہ جب بھی انہیں اپنی بہن یاد آتی وہ اس کے ملبوسات و زیورات زیب تن کر کے سہیلیوں سے ملنے چلی جاتیں تاکہ غم غلط ہو جائے اور یہ یاد ان کو اکثر ستاتی رہتی تھی۔

پروین بظاہر سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن فی الحقیقت اس کی آنکھیں اور کان اور تمام دوسری

حسیات پاپا کے خیال کے علاوہ ہر دوسرے خیال کے لئے مردہ ہو چکی تھیں۔ آنکھیں منتظر تھیں کہ وہ چلتا پھرتا، ہنستا بولتا نظر آئے اور کان چاہتے تھے کہ "بینو بیٹی، بینو بیٹی" کہنے والے لب پھر صدا آشنا ہو جائیں!

خادمہ نے اسے گھر کے حالات سے باخبر کرنا چاہا مگر اس عالم بے خبری سے رہائی اس کے بس کی بات نہ تھی۔

اس اثنا میں پروین کے چچا کو بھی اس سانحے کی اطلاع ہو چکی تھی وہ دور رہتے تھے، اس لئے ذرا دیر سے پہنچ سکے اور گھنٹوں بھائی کی قبر سے لپٹ لپٹ کر روتے رہے اور جب انہوں نے پروین کو سینے سے لگایا تو جو لاوا دونوں جانب سے پھوٹا تھا، قلم اسے بیان کرنے سے قاصر ہے۔ وہ آخر مرد تھے، انہوں نے خود کو سنبھالا اور پروین کو تسلی دینے لگے۔

پروین نے صرف سُن ہی رکھا تھا کہ اس کا ایک چچا ہے لیکن اُسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے کشیدہ خاطر تھے اور آپس میں تعلقات بالکل منقطع تھے اصل میں پروین کے پاپا نے ایک اجنبی عورت سے شادی کر لی تھی۔ خاندان کے سبھی لوگ مخالف تھے، چچا نے خاص طور پر بھائی کے اس اقدام کو بُرا محسوس کیا تھا وہ دن تھا اور بڑے بھائی کی موت کا دن! انہوں نے پھر ایک دوسرے کا منہ نہیں دیکھا۔ بیچ میں چچی بہن تھی۔ کبھی کبھار مل لیتی تھی اور اب کوئی سولہ برس کے بعد بھائی بھائی کے گھر آیا تھا مگر ملنے نہیں بلکہ بھائی کی بیٹی کو جو تنہا رہ گئی تھی سہارا دینے۔ پروین نے جب چچا کو پہلی بار دیکھا اور اس کی زبان سے بھی وہی "بینو بیٹی" کے الفاظ سنے تو اسے یوں لگا جیسے پاپا پھر زندہ ہو گئے ہوں۔ لیکن یہ محض خیال تھا جو زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکا۔ پاپا کی موت اتنی تلخ حقیقت تھی کہ اس سے توجہ ہٹانا ناممکن تھا۔

دو دن رک کر چچا نے بھائی کے تمام معاملات کو سمیٹا اور پروین کو لے کر اپنے گھر آ گئے چچی کو پروین کے آرام کا بڑا خیال تھا۔ ان کے کوئی بیٹی نہ تھی۔ صرف پانچ بیٹے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کوشش کی کہ اپنی وہ تمام محبت جو ابھی تک بیٹی کے ارمان میں محفوظ رکھی تھی۔ اسے دے دیں۔ ان دونوں بزرگوں کی محبت کے زیر اثر پروین ایک حد تک خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو ہی گئی ——— لیکن پاپا ہر وقت اس کا محبوب ترین موضوع تھے ادھر کسی نے ان کا ذکر چھیڑا۔ اور

اُدھر وہ ہمہ تن گوش ہوئی جیسے اس کو اپنا محبوب ترین موضوع مل گیا ہو۔

ممی کے انتقال کے بعد پاپا نے شادی نہ کرکے جو عظیم قربانی دی تھی۔ اس کی عظمت کا احساس پروین کو ہو چکا تھا۔ پاپا صرف پاپا نہ تھے وہ تو اس کی ممی بھی تھے۔ بچپن کا زمانہ جو صرف پاپا کے زیر سایہ گزرا تھا۔ اسے خوب یاد تھا اور چچی کے ہاں ماضی کے اوراق اُلٹتے رہنا ہی اس کا سب سے بڑا کام تھا۔

وہ چھوٹی سی تھی تو پاپا کے لائے ہوئے بے شمار کھلونوں سے کھیلتی رہتی تھی۔ بے جان کھلونے اس کا دل بہلاتے تو وہ کتنے پیار سے ہنستے تھے اور پھر کبھی کبھی ایک دم وہ اداس بھی ہو جاتے تھے پروین کو اس تبدیلی کے معنی اب سمجھ آ رہے تھے —— کبھی کبھی وہ مصالحے کی ہنڈیا، چینی کی بلی یا لکڑی کے گھوڑے کو کہتی "بھاگو" اور وہ کھلونا ذرا بھی حرکت نہ کرتا تو اُسے بے حد غصہ آتا۔ چینی کے کئی طوطے اس نے ہوا میں اڑانے کی کوشش میں توڑ دیئے شاید وہ لاشعوری طور پر اس بات کی خواہشمند تھی کہ گھر کی خاموش فضا میں ایک ہنگامہ پیدا ہو جائے۔ اُسے باہر جا کر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی پاپا کا خیال تھا کہ یوں بچوں کا اخلاق بگڑ جاتا ہے گھر میں ممی کے نہ ہونے کی وجہ سے خواتین اور لڑکیوں کی آمد تقریباً بالکل بند تھی۔ کبھی کبھی اس کی پھوپھی یا خالہ آجاتی تھیں۔ بس۔ ایسے میں ہمیشہ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے سب کھلونے، کبوتر، مرغ، گھوڑے، بکریاں، ہاتھی زندہ ہو کر اس کے ساتھ کھیلنے لگیں۔ بے جان کھلونوں سے بیزاری کا اظہار اس روز زیادہ ہوا جب پاپا نے اسے ایک بلی لا دی اس کا نام اس نے پُسّی رکھ لیا کیونکہ کہانیوں میں اس نے یہی نام پڑھا تھا اس کے لئے وہ ایک کھلونا تھی جس میں جان پڑ گئی ہو، وہ دوسرے کھلونوں کی طرح سرد نہ تھی۔ اس میں زندگی کی حرارت تھی جب وہ اس کو اپنی رانوں پر بٹھاتی تو وہ اپنی نرم اور گرم کمر اس کے پیٹ سے لگا دیتی یہ اسے بہت بھلا لگتا۔ وہ خود بھی تو ایسے ہی پاپا کی گود میں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ پھر پاپا اس کے لئے پنجرے میں بند ایک طوطا بھی لے آئے۔ اب اس نے ایک بار پھر چاہا کہ اس کے باقی کھلونے بھی جاندار بن جائیں اس نے انہیں مار مار کر حکم دیا "بولو، کھیلو، کودو، ادھر آؤ، ادھر جاؤ" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے آخر اس نے تمام کھلونے الماری میں اور آتشدان پر سجا دیئے، جیسے وہ سب تصویریں ہوں، پیاری مگر بے جان ممی کی تصویروں کی طرح!

لیکن وہ بے فکر نہ ہو سکی تھی بلکہ ان کھلونوں میں جان ڈالنے کے ذرائع سوچتی رہتی تھی۔ ایک بار اس نے پاپا سے ذکر کیا تو وہ بہت ہنسے اور پھر انہوں نے بتایا کہ جان ڈالنا صرف اللہ میاں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ مٹی سے انسان بنا دیتا ہے۔ وہ جسے چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے اور جس سے چاہے چھین سکتا ہے۔ پروین نے یہ بات گرہ میں باندھ لی اور رات سونے سے قبل اس نے دیر تک خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ اس کے تمام کھلونوں میں یا کم از کم چڑیوں، طوطوں اور لکڑی کے بڑے گھوڑے میں ضرور جان پڑ جائے۔ سونے سے قبل اس نے طوطوں اور چڑیوں کو پنجروں میں بند کر دیا اور گھوڑے کے گلے میں رسی باندھ دی تاکہ زندہ ہو کر وہ کہیں غائب نہ ہو جائیں۔ لیکن صبح اپنی دعا کو بے اثر پا کر اُسے سخت دکھ ہوا۔

ایک روز یوں ہوا کہ طوطے کا پنجرہ کھلا رہ گیا اور وہ سبز پوش کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اچانک اس نے طوطے کی ٹائیں ٹائیں اور پھڑپھڑاہٹ سنی اور دوسرے ہی لمحہ دیکھا کہ وہ بے چارا لیپی کے دانتوں میں دبا دم توڑ رہا تھا۔ اسے بہت رنج ہوا۔ اس نے لیپی کو بہت مارا۔ کئی دن وہ لیپی سے ناراض رہی لیکن پھر صلح ہو گئی۔ صلح کو ابھی چند روز ہی گذرے تھے کہ لیپی خون میں لت پت ایک چوہا دانتوں میں دبائے اس کے سامنے آ موجود ہوئی۔ اب پروین کو لیپی سے سخت نفرت ہو گئی۔ اس نے لیپی کو خوب مارا اور گھر سے نکال دیا۔ لیکن وہ پھر واپس چلی آئی مگر پروین کو اب اس کی معیت ہرگز گوارا نہ تھی۔ اس نے پاپا سے کہہ کر اسے کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے وہ پھر واپس نہ آ سکی۔

لیپی سے جدائی کے بعد اس کی توجہ ایک بار پھر کھلونوں کی جانب مبذول ہوئی۔ لکڑی کا بنا ہوا اونچے کوہان والا اونٹ جو پاپا صرف چند روز پہلے لائے تھے کتنا پیارا تھا جیسے بس قدم اٹھانے ہی والا ہو۔ چینی کی بلی اور چوہے جو ساتھ رکھے تھے لیپی کی جلاوطنی کے بعد دور دور کر دیئے گئے لیکن اس کے ذہن میں عجیب سا خوف کچھ یوں طاری رہا کہ چند ہی روز بعد اس نے بلی کو اٹھا کر گودام میں ڈال دیا ——— بڑی مشکل یہ تھی کہ اب وہ اتنی چھوٹی نہ رہی تھی کہ بے جان کھلونوں سے بہل سکے بالخصوص اپنے مرحوم طوطے اور لیپی کی معیت میں کچھ وقت گزار کر یہ بات مشکل تر ہو گئی تھی۔ کھلونوں میں اب اس کی توجہ کا سب سے بڑا مرکز آنکھیں گھمانے والی گڑیا بن گئی۔ گو اس کا جسم بے جان تھا مگر آنکھوں میں تو جان تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی آنکھوں کی جان کو اس کے پورے جسم میں پھیلا دے گی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ خوراک پہلے پیٹ میں جاتی ہے اور وہاں سے جسم کے ہر حصے تک پہنچ جاتی ہے چنانچہ اس نے سوچا کہ گڑیا کی جان آنکھوں میں

سے نکال کر اس کے پیٹ میں ڈال دے گی۔ لیکن اس کوشش میں گڑیا کی آنکھیں بھی بے جان ہو گئیں گڑیا مر گئی اور وہ کئی روز تک اداس رہی۔

پاپا اس کے شوق کو پہچان گئے تھے۔ وہ اس کے لئے چابی سے چلنے والے کئی کھلونے لائے اسے کھلونے بہت اچھے لگے اور یوں چند برس اور بیت گئے۔

پھر وہ وقت بھی آگیا جب کھلونوں سے کھیلنے کے دن بہت پیچھے رہ گئے۔ اور چابی سے چلنے والی اور جاندار چیزوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو گیا۔ اب پاپا اس کے لئے ایک چھوٹا سا پیارا پلا لائے جو رفتہ رفتہ بڑا ہو کر ایک بڑی پیاری سی کتیا بن گیا۔ یہی ڈولی تھی۔ یہ نام اسے پاپا نے ہی دیا تھا۔ ڈولی پروین کو بے حد عزیز تھی۔ وہ اسے کم ہی نظروں سے اوجھل ہونے دیتی تھی —— اور اب تو یہ پاپا کی نشانی بن کر رہ گئی تھی اس لئے پاپا کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں اسے وہ سب سے زیادہ پیار کرتی تھی۔

چچی کو جانوروں سے کوئی پیار نہ تھا لیکن سب سے بڑے بیٹے مجیب نے اسے کتوں کو برداشت کرنا ضرور سکھا دیا تھا۔ پروین سے اس نے کہا تھا "میرے مجو کو بھی کتوں سے بڑا پیار ہے۔" مجیب کو مجو اس نے یوں کہا تھا۔ جیسے مجو کوئی بچہ ہو۔

مجیب کو پیار سے مجو ہی کہا جاتا تھا۔ وہ فوج میں کپتان تھا اور صرف عید کے عید گھر آتا تھا۔ فوج سے باہر اس کا جی ذرا کم ہی لگتا تھا۔ عمر ۳۰ کے لگ بھگ تھی مگر ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ ماں کو اپنے کپتان بیٹے پر بڑا ناز تھا۔ اس کے خیال میں وہ ولی تھا ورنہ دوسرا بیٹا اسد ماں باپ کی اجازت کے بغیر ہی دو شادیاں برائی بھی کر چکا تھا اور اب تیسری کا تہیہ کئے بیٹھا تھا۔ کپتان بیٹے کی ایک بہت بڑے سائز کی تصویر بڑے کمرے میں لگی تھی۔ جس میں موٹے موٹے ہونٹوں، گھنی مونچھوں اور بھاری جسم والا کپتان مجیب دو السیشی کتوں کی زنجیریں تھامے وردی پہنے کھڑا تھا۔ کتے کو زور لگا رہے تھے اور زنجیریں لوہے کی سلاخوں کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دو السیشی کتے ایک بل ڈاگ کو گھسیٹنے کی بے کار کوشش کر رہے ہوں۔ یا جیسے پرانے یونان کا کوئی سورما، دو منہ زور گھوڑوں کی لگامیں تھامے رتھ پر کھڑا ہو۔

پروین جب اس گھر میں آئی تھی اس وقت صرف سب سے چھوٹا بیٹا سعید ہی گھر پر تھا اس کی عمر ۱۴ برس کی تھی۔ وہ ماں کا بے حد لاڈلا تھا اور زیادہ وقت گھر پر ہی رہتا تھا۔ شاہزادوں کے

نازک اندازِ ادا یہ البیلا نوجوان شاعر بھی تھا اور ابھی تک اپنے سپنوں کی شاہزادی کی تلاش میں تھا اس کا خیال تھا کہ جہاں اس کا دل عشق کی تنویر کا گہوارہ تھا وہاں وہ بھٹکی ہوئی دنیا کے لئے خضرِ راہ بھی بن سکتا تھا۔ جبھی تو اس نے اپنا تخلص خضر رکھا تھا۔

پروین کو اس کی باتیں بہت بھلی لگتی تھیں اور وہ اس کی رفاقت میں خاصا سکون بھی پاتی تھی وہ جب اپنے ارادوں کی دنیا کے دروازے اس پر کھولتا تو وہ ایسا محسوس کرتی جیسے باغِ عدن سے عطر بیز ہواؤں کے جھونکے آ رہے ہوں۔ شکل و صورت کا وہ اتنا پیارا تھا کہ بار ہا اسے یہ گمان گزرا کہ اس کے بچپن کا کھویا گڈا جاندار ہو گیا ہے اور بڑا ہو کر سعید خضر بن گیا ہے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ چپکے اس کھلونے کو اٹھا کر ہوا میں اچھال دے مگر اس خیال پر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتی۔ اس کے سوا اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

احمد کپتان حبیب سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ یعنی کبھی کبھی وہ عبید کی ملاقات بھی گول کر جاتا تھا۔

ان کے علاوہ چچی کے دو بیٹے اور تھے افتخار اور امجد۔ افتخار افریقہ میں کوئی بڑا کاروبار کرتا تھا اور سال کے سال ایک اچھی بڑی رقم ماں کو روانہ کر دیتا تھا۔ وہ ہر سال آنے کا وعدہ کر کے بھول جاتا تھا۔ امجد سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بچپن سے ہی سب سے زیادہ لاڈلا رہا تھا اور اب جوانی میں بھی وہ کوئی فکر یا گھر کا کوئی کام کرنے کا قائل نہ تھا۔ اس لئے سب اس کو پیار سے انجو۔ حرام خور کہتے تھے۔ وہ صرف باپ کے سرمایہ پر سیر و تفریح اور شکار کو ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا تھا۔ پہاڑوں کی سیر اس کا محبوب مشغلہ تھا کیونکہ یوں سیر و تفریح اور شکار کے تمام لطف ایک ساتھ حاصل ہو جاتے تھے وہ کسی تہوار پر گھر سے غیر حاضر نہیں ہوتا تھا اسے خوشی کی کسی تقریب کی اطلاع مل جاتی تو وہ جہاں بھی ہوتا سب کام چھوڑ کر اس تقریب میں شرکت کے لئے آ موجود ہوتا۔ اس کی بھی ایک تصویر بڑے کمرے میں آویزاں تھی۔ بندوق کی نالی کندھے کے عقب سے آ کر اس کے بائیں رخسار کو چھوتی ہوئی سر سے اوپر نکل گئی تھی۔ تصویر میں وہ بھی ڈولی کی طرح نرم و نازک سا لگا۔ اس نے ڈولی کو گود میں لے کر بھینچا تو اسے تصویر پر ترس آنے لگا کہ کہیں بیچارہ بندوق اٹھائے اٹھائے تھک نہ جائے اور پھر وہ مسکرا دی۔ اس کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جو چیز یا بالخصوص جو شخص اسے پسند آتا وہ اس کا مقابلہ

اپنے بچپن کے کسی کھلونے سے ضرور کرتی تھی اور یہ تعلق اسے اتنا دلچسپ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے کبھی اس عادت کو ترک کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

پروین کو یہاں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سعید خضر کو محسوس ہونے لگا جیسے اس کے اشعار ملک و قوم اور معاشرہ و سیاست کے موضوعات سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور غزل کی وہ پرانی روایت جسے اس نے فرسودہ اور بے کار سمجھ کر درخورِ اعتنا نہ سمجھا تھا اس کے ذہن و قلم پر قبضہ کیے جا رہی تھی اُسے پیانو بجانا خوب آتا تھا لیکن اب سے پہلے وہ پیانو پر صرف غالب کی غزلیں گایا کرتا تھا کیونکہ اس کی اپنی نظمیں ایک خاص مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں جن کا پیانو پر گاتے جانا ممکن نہ تھا۔ مگر اب وہ غزلیں کہتا تھا اور سوائے انہیں پیانو پر گاتا تھا۔ کئی بار اُسے یوں بھی محسوس ہوا کہ اگر وہ اپنی تازہ غزل پیانو پر نہیں گائے گا تو پاگل ہو جائے گا اور اسے یہ بوجھ ہلکا کرنا ہی پڑتا تھا۔ دل میں وہ جب نافذ کردہ غزلیں پیانو پر کیوں گاتا ہے، کہ اس کی توجہ معاشرتی موضوعات سے کیوں ہٹ گئی ہے اور کہ اب اس کے قلم پر کس کی حکمرانی ہے لیکن وہ کوئی بات کہتے ہوئے ڈرتا تھا یہ ڈر بھی رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ آخر اس نے اپنے جی میں ایک فیصلہ کیا اور موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

پروین کو خضر بھلا لگتا تھا مگر صرف ایک کھلونے کی طرح جسے اٹھا کر طاق میں یا آتشدان پر رکھ کر دور سے بھی دیکھا جا سکے اس کے لئے وہ ڈولی سے کم اہم تھا۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ وقت گزرتا بھی اسی کے ساتھ تھا۔ وہ اکٹھے ناشتہ کرتے تھے۔ اکٹھے کھانا کھاتے تھے اور ایک دوسرے کو لطیفے سناتے تھے۔ پروین اس کے چھوٹے موٹے کام بھی بخوشی کر دیتی تھی، لیکن جب بھی اس نے ڈولی کو اپنے ساتھ کہیں لے جانے کی خواہش ظاہر کی پروین راضی نہ ہوئی۔ ڈولی سے اس کو اتنا پیار کیوں تھا یہ جاننا اب کچھ مشکل نہیں رہا۔ گزشتہ واقعات نے اُسے باپ کی طرح عزیز بنا دیا تھا ایک بار اس کے انکار پر سعید خضر بہت رنجیدہ ہوا۔ پروین کو ترس آ گیا اور اس نے ڈرتے ڈرتے ڈولی کو اس کے ہمراہ بھیج دیا۔ ڈولی تو چلی گئی لیکن وہ خود متفکر ہو گئی۔ وہ بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتی یوں جیسے کوئی ماں اُس ننھے بچے کے لئے فکرمند ہو جائے جو تنہا باہر نکل گیا ہو۔ آخر خضر واپس آ گیا۔ پروین نے دیکھا کہ وہ خونخوار سے لگتے دو در کھڑے ڈولی کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے اُسے کھا جانا چاہتے ہوں —— سعید خضر پر پروین کی بے چینی واضح ہو گئی تو اس نے پھر کبھی ڈولی کو پروین سے جدا کرنے کی خواہش نہیں کی اور شاید

اب اسے بہ رعایت دوبارہ مل بھی نہ سکتی پروین کو ڈر تھا کہ کہیں وہ سکتہ ڈولی کی جان بھی یوں نہ نکال دیں جیسے اس نے بچپن میں اپنی گھومتی آنکھوں والی گڑیا کی جان نکال دی تھی۔

عید قریب تھی۔ پروین کو اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ وہ دوسرے بھائیوں سے بھی ملے گی اُسے اپنے بھائیوں سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے وہ گیت سنے تھے۔ جن میں بہنیں اپنے بھائیوں سے پیار کا اظہار کرتی ہیں۔ ایسی کہانیاں پڑھی تھیں جن میں بھائی بہنوں کی سب سے بڑی خوشی بن جاتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کا بھی کوئی بھائی ہوتا اور اب جو ایک دم کئی بھائی مل گئے تھے۔ تو وہ بڑی خوش تھی۔

ایک روز وہ کپتان مجیب کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی اُسے اپنا چینی کا بُل ڈاگ یاد آ رہا تھا اور اس مشابہت پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی تھی اچانک سعید خضر بھی وہاں آ نکلا۔ یہ منظر دیکھ کر خضر کچھ ایسا پریشان ہوا کہ خود پر قابو کھو بیٹھا۔

"تمہاری طبیعت بھی ایک عجوبہ ہے" اس نے کہا "یا تو جانوروں سے پیار کرتی ہو یا تصویروں سے یا پھر غیر حاضر لوگوں میں دلچسپی لیتی ہو۔ اپنی امی کو یاد کرتی ہو، پاپا کو ڈھونڈتی ہو اور پوچھتی ہو کہ مجیب بھائی کب آئیں گے، انہیں افتخار بھائی نے شادی تو نہیں کر لی، افریقہ میں؟ آسد گھر میں کیوں نہیں رہتے امجد کو آپ لوگ حرامخور کیوں کہتے ہیں۔ یہ سب بھائی کب آئیں گے۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں؟"

اس کی سانس اُکھڑنے لگی۔

"اس میں جلنے کی کیا بات ہے؟" پروین نے خضر کا سلسلہ گفتگو توڑتے ہوئے کہا "ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا۔"

"تو تمہیں کیا اچھا لگتا ہے؟ کیا اچھا لگتا ہے تمہیں؟" خضر ایک دم جذباتی ہو گیا۔ جیسے ماحول کو بھول گیا ہو "کیا اچھا لگتا ہے۔ تمہیں؟ ——— یہ ڈولی؟ یہ جانور، کھلونے، تصویریں، السیشی کتے اور یہ بُل ڈاگ یہ جنگلی جانور، کپتان مجیب جس کی تصویر کو دیکھ دیکھ کر تمہارا جی کبھی نہیں بھرتا؟"

پروین حیران تھی کہ خضر کی تمام نرمی ایک دم کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور نقوش میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ذرا اپنا چہرہ تو دیکھو" اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"میرا چہرہ؟" خضر نے غصہ اور شدت جذبات سے اور زیادہ مغلوب اور زرد ہوتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں میرے چہرے کو کیا ہوا ہے۔ یہ تم ہو جو پھر تمہیں دیکھ رہی ہو، جس کی آنکھیں بند ہیں ——— مگر تمہیں کیا، تمہیں تو دلچسپی ہے جانوروں سے یا جانور نما انسانوں سے ——— پپی، ڈولی، السیشن کتے، ربی ڈاگ مجو، یہ ہیں تمہارے محبوب، تمہیں انسانوں سے کیا واسطہ!" اتنا کہہ کر اچانک اس کے لہجے میں پھر نرمی آگئی شاید اس لئے کہ اس کے ان الفاظ کو سن کر پروین ایک دم زرد ہو گئی تھی۔ "کاش تم شاعر کے دل میں جھانک سکتیں پروین! کاش تم جان سکتیں کہ خضر کے شعروں میں کون چھپا بیٹھا ہے! کاش تمہیں معلوم ہو سکتا کہ خضر کو بھی آج ایک راہنما کی ضرورت ہے ——— میں نے اپنے جذبات کو کتنی دیر دل کے نہاں خانے میں قید رکھا مگر یہ سرکش گھوڑے آخر بے قابو ہو ہی گئے ——— آج خضر گمراہ ہے ——— کاش تم اسے راستہ دکھا سکو!"

خضر کی آواز میں اتنا کرب تھا کہ پروین خوفزدہ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے۔ آخر اس نے ڈولی کو اٹھا کر سینے سے یوں لگا لیا جیسے اب وہ خود وہاں محفوظ ہو گئی ہو۔

ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ خضر کے چہرہ کی نرمی ایک بار پھر شکست کھا گئی اور وہ بولا۔ "خضر کو تمہاری ضرورت ہے اور تم خضر سے زیادہ اس کتیا کو چاہتی ہو ——— اس کو سینے سے لگائے پھرتی ہو ——— اس ڈولی کو ———" اور اس نے ڈولی کی طرف یوں ہاتھ بڑھایا کہ پروین اور زیادہ ڈر گئی۔ خضر اسے بہت خوفناک نظر آنے لگا بالکل پپی کی طرح ——— پروین ایسی گھبرائی کہ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور ڈولی آزاد ہو کر کمرے سے باہر بھاگ گئی اور سعید خضر کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ اس کے سینے پر آ رکا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی چوہیا ہے اور خضر بلی وہ سمجھتی تھی کہ اس میں چیخنے کی بھی ہمت نہیں رہی لیکن کسی نہ کسی طرح وہ وہاں سے بھاگ ہی نکلی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر تکیے میں منہ دے کر دیر تک روتی رہی ——— اسے یوں لگا جیسے وہ خضر سے نفرت کرنے لگے گی۔

رات کو اسے بخار ہو گیا۔ خضر کسی کام کا بہانہ کر کے کئی روز گھر سے غائب رہا۔ جب وہ واپس آیا تو بہت خاموش، افسردہ اور شرمندہ سا تھا۔ پروین کا بخار تو جلد ہی جاتا رہا۔ لیکن وہ برابر سہمی سہمی

سی نظر آتی رہی۔

ابھی یہ واقعہ تازہ ہی تھا کہ اچانک اسد آ پہنچا۔ وہ ہمیشہ غیر متوقع طور پر آتا تھا اور پھر اسی طرح اچانک رخصت بھی ہو جاتا تھا۔ وہ بادل کا ایک بڑا ٹکڑا تھا جو آتے ہی چھپ کر سارے گھر پر چھا جاتا تھا اور برس کر واپس چلا جاتا تھا خاموش بیٹھا اس کے لئے گناہ تھا۔ پروین سے تو اس نے زیادہ باتیں نہیں کیں لیکن ماں کا دماغ خوب چاٹا گیا اس کا زیادہ وقت یہ ثابت کرنے میں صرف ہوا کہ وہ دو عورتیں جنہیں وہ بیویاں بنا کر چھوڑ چکا تھا اس کے اہل نہیں تھیں اور کہ گذشتہ تجربات کی روشنی میں اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ انتخاب میں کوئی غلطی نہ کرے۔ ماں نے پیار آمیز غصہ میں جواب دیا "تجھے تو شاید زندگی بھر اپنی پسند کی بیوی نہ مل سکے گی۔" مگر اسد نے مسکرا کر کمرے کے اندر داخل ہوتی ہوئی پروین کی طرف دیکھ کر کہا "آپ غلط سوچ رہی ہیں امی اب کے میں نے بڑی اعلیٰ ہستی منتخب کی ہے"

پروین نے یہ بات سن لی اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم دروازے کی چوکھٹ پر ہی رک گئے وہ اسد بھائی سے ملنے چلی تھی لیکن ابھی وہ اسے بھائی کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نفرت کا بیج اس کے دل میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ یہ کس قسم کے بھائی تھے۔ جن کا کردار یہی کا کردار تھا بھائیوں سے ملنے کی خواہش کی شدت کی جگہ اب ایک دبے ہوئے احساس خوف نے لے لی تھی۔

امجد آیا تو گھر کی رونق میں بڑا اضافہ ہوا۔ پروین نے اسے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ وہ واقعی پیارا تھا۔ بالکل ڈولی کی طرح نرم۔ تیز اور چالاک۔ اس نے سیاہ چشمہ آنکھوں سے اتارا اور مسکرا کر پروین کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنی ممی کی طرف بڑھایا۔

"پروین ——— پروین ——— تمہاری تایا زاد بہن"، ماں نے تعارف کرایا۔

"تایا زاد بہن!" امجد نے بات کاٹ دی "آہا ——— آہا ——— بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر ——— یقین جانئیے ——— اتنی ——— اتنی" اس نے یوں ہاتھ پھیلائے جیسے پورے کرۂ ارض کو ہاتھوں میں تھام لینا چاہتا ہو۔ ——— "میرا مطلب ہے ——— کہ اسلام علیکم" اور اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔

پروین گھبرا گئی۔

"امی!" امجد چلایا "یہ کیسی تایا زاد بہن ہے۔ نہ سلام نہ سلام کا جواب، نہ مصافحہ نہ بات!"

"پروین، ہاتھ ملا لو بیٹا، یہ تمہارے بھائی ہیں، امجد" چچی نے کہا۔

"امجد حرامخور؟" غیر ارادی طور پر پروین کے منہ سے نکلا۔ گھر میں جب بھی کسی نے امجد کا نام لیا ساتھ حرامخور کا استعمال ضرور ہوا۔ پروین کے کان اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اب یہ غیر شعوری طور پر یہ خطاب اس کی زبان پر آ گیا۔

"دیکھا امی، یہی ہے میری آپ کی برائی" امجد نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ ہر شخص کو آپ پہلے سے ہی میری بے عزتی کرنے پر تیار رکھتی ہیں۔ آخر لوگ کیا کہیں گے ——— اور یہ ہماری نئی نویلی پیاری سی بہن کیا سوچے گی"

"تو کیا تو حرامخور نہیں ہے؟" اسد نے سوال کیا۔

پروین کو اس سوال پر ہنسی آ گئی۔ امجد کو شور مچانے کا ایک اور موقعہ ملا "امی لو دیکھو یہ محترمہ ابھی سے ما بدولت پر ہنسنے بھی لگیں۔ خیر بھائی کے ساتھ یہ سلوک! میں نے بھی اگر ان محترمہ کو اپنے جیسا حرامخور نہ بنایا تو نام بدل لوں گا"

"تو کیا حرامخور کی جگہ کام چور یا بے شرم رکھو گے؟" اسد نے پھر چٹکی لی۔

"بھیا" امجد نے کہا "کاش آپ مجھ سے ایک سال بڑے نہ ہوتے۔ برابر کے ہوتے۔ کاش ہم دونوں جڑواں بھائی ہوتے پھر میں آپ کو آزادی سے ان باتوں کا مزا چکھاتا"

"تو مجھے برابر کا ہی سمجھ لے"

"اچھا؟"

"ہاں!"

"اچھا!"

"ہاں!"

"پھر سوچ لیجئے، معاملہ خطرناک ہے"

"سوچ لیا ہے، بس باتیں مت بنا!"

"لیجئے، پھر سنبھلئے ——— سنبھلئے" یہ الفاظ کہتا ہوا امجد، اسد کے گلے سے لپٹ گیا اور دونوں قہقہے لگاتے ہوئے باہر صحن میں چلے گئے۔

"دیکھا تم نے پروین، کتنے اچھے ہیں میرے بچے، کتنے زندہ دل ہیں!" ماں نے نہال ہوتے ہوئے کہا۔

پروین کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ کم از کم امجد نے اسے دوبارہ بہن کہا تھا۔ اس کے دل کو بڑی تقویت ملی۔ امجد کا رتبہ اس کے دل میں بڑھ گیا۔

بہت دیر نہ ہوئی تھی کہ امجد واپس آگیا اور بڑی بے تکلفی کے انداز میں پروین سے گویا ہوا۔

"پروین ——— تمہارے بھائی بے ڈکار کو بہت بڑی شکست دے کر آیا ہوں۔"

"بھائی بے ڈکار؟" پروین نے حیرانی سے سوال کیا۔

"ہاں، ہاں، تم نہیں جانتیں؟ ——— یہ بھی کمال ہے کہ ہمارے بارے میں تو آپ کو ہماری سب خرابیوں سے آگاہ کر دیا گیا اور دوسروں کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا ——— بہرحال یہ کام اب میں کئے دیتا ہوں ——— یہ جو اسد بھائی ہیں نا، یہی ہیں بھائی بے ڈکار، اس لئے کہ یہ دو بیویاں بغیر ڈکار لئے ہضم کر گئے ہیں اور اب تیسری کی فکر میں ہیں۔ ان سے بچ کے رہنا۔" ———

"جی!" پروین کی زبان سے صرف یہ ایک لفظ نکلا اور کشیدہ کاری کا فریم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد وہ پھر چپ سی ہو گئی۔ اگلی صبح وہ ابھی خود پر قابو پانے کی کوشش میں ہی مصروف تھی کہ امجد نے اس سے سوال کیا "پروین، تم نے کبھی پہاڑ کی سیر کی ہے؟"

"جی ——— نہیں۔"

"تو پھر تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا"، امجد نے منہ بنا کر فیصلہ دیا۔ "عمو کے انتقال سے تم افسردہ ہو۔ تمہاری صحت خراب ہو رہی ہے۔ تم چپ سی رہتی ہو۔ امی سے اجازت لے کر تم میرے ساتھ پہاڑ کی سیر کو چلو۔ میری طرح حرامخور بنو، شکار کھیلو، خوش رہو، تفکرات سے دور بھاگو، پھر دیکھو کیسی عمدہ بنتی ہے تمہاری صحت۔ یہ سب لوگ مجھ سے جلتے ہیں اسی لئے مجھے حرامخور کہتے ہیں اصل میں یہ سب مجھ ایسا بننا چاہتے ہیں۔ حرامخور بننے میں بہت مزا ہے، سرسبز لہلہاتے کھیت، گنگناتے پہاڑی نالے، فردوسی وادیاں ——— ان سب سے ایسی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ تم گھر بیٹھ کر اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ تمہاری خاموشی اور افسردگی اگر چند ہی روز میں غائب نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دینا ——— میرا

مطلب ہے امجد حرامخور کی بجائے کوئی اچھا سا نام دے دینا، مثلاً امجد دانش مند یا امجد باشعور وغیرہ وغیرہ"

پروین کی غیر معمولی پریشانی اور خاموشی کا سبب تو در اصل وہ واقعہ تھا جو اس کے اور خضر کے درمیان پیش آیا تھا لیکن چچی کا خیال تھا کہ عید قریب آنے کی وجہ سے اسے باپ زیادہ یاد آرہا تھا اور اسی لیئے وہ زیادہ اداس ہو رہی تھی۔

پروین اب زندگی کے حقائق کے روبرو کھڑی تھی اور یہ تصادم رومانی خیالات کے لئے پیام موت تھا۔ یہ نوجوان توانا بھائی جنہیں اس نے شروع میں اپنے کھلونوں کی طرح سمجھا تھا۔ فی الحقیقت اس کے کھلونوں کی طرح بے جان اور بے طاقت نہیں تھے بلکہ اپنی مرضی دوسروں پر حاوی کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ غصہ آنے پر وہ کھلونوں کو اٹھا کر پھینک سکتی تھی۔ انہیں توڑ سکتی تھی، انہیں آتشدان پر سجا سکتی تھی لیبی کو مار مار کر گھر سے نکال سکتی تھی مگر اب صورت حال بالکل برعکس تھی اور وہ خود کو اس گھر کے افراد کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہی تھی۔ بالخصوص خضر والے واقعہ نے تو اسے بہت خوفزدہ کر دیا تھا شادی کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا لیکن اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ ان بھائیوں میں سے ہی کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی اسے یوں دبوچ بھاگے گا جیسے اس کی پُسی نے اس کے طوطے کا لقمہ بنا لیا تھا۔

امجد نے خود ہی امی کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا "امی۔ میں پروین کو پہاڑ پر لے جاؤں گا ——— ہچ ہچ ہچ ——— ذرا دیکھو تو کتنی دُبلی ہو رہی ہیں یہ صحت کس قدر گر گئی ہے رنگت کتنی زرد ہو رہی ہے۔ آپ نے بڑی بے پروائی دکھائی امی جان! کاش آپ مجھے پہلے ہی اطلاع کر دیتیں تو میں کب کا آکر انہیں لے جاتا ——— مگر اب بھی کیا بگڑا ہے۔ میں انہیں پہاڑوں کی سیر کراؤں گا۔ پھر دیکھنا چند ہی روز میں ان میں کتنی آب و تاب آجاتی ہے ——— امی میں ان کو بالکل اپنے جیسا حرامخور بنا دوں گا ——— ہیں ———" اور وہ مسکرا کر امی کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"ہاں ہاں لے جانا ——— مگر ابھی کوئی جلدی نہیں ہے" چند لمحوں کے توقف کے بعد امی نے جیسے ٹالنے کو یہ بات کہی۔

"نہیں نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں یہاں بہت آرام سے ہوں" پروین نے بے ساختہ کہا۔ کچھ دیر کو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے امجد میں خضر کی روح حلول کر آئی ہے اور وہی اس کی زبان سے اپنا مدعا بیان کر رہی ہے۔ اس کا چہرہ اور زرد ہو گیا۔ وہ بہت گھبرا گئی۔ اسے وہاں بیٹھ رہنا مشکل لگا تو اپنے کمرے کی طرف بھاگ اٹھی اور وہاں جا کر پھر تکیے میں سر دے کر رونے لگی۔

چچی اور چچا دونوں کو یقین تھا کہ پروین کی یہ حالت عید کی آمد اور باپ کی جدائی کے غم کی وجہ سے ہے لیکن وہ سیدھے سادے بزرگ اس کی ذہنی حالت کا بالکل اندازہ نہ کر سکے۔ چچی سمجھتی تھیں کہ پروین خضر کی صحبت میں خوش رہتی ہے اس لئے انہوں نے خضر کو پروین کی افسردگی دور کرنے پر مامور کیا لیکن وہ کسی کام کا بہانہ کر کے یہ کہہ غائب ہو گیا "اسد بھیا۔ اور امجد بھیا جو ہیں اور اب مجیب بھائی جی تو آ جائیں گے۔"

چچا نے پروین کو بار بار روتا دیکھا تو ان کا جی بھر آیا انہوں نے دستِ شفقت اس کے سر پہ پھیرتے ہوئے اسے سمجھانا شروع کیا "روؤ نہیں بیٹو بیٹی، یوں تو باپ، باپ ہی ہوتا ہے لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ تمہارا باپ مر گیا ہے میں تمہارا باپ ہوں تم یوں سمجھو کہ تمہاری ماں بھی زندہ ہو گئی ہے اور نہیں کتنے اچھے اچھے جوان بھائی مل گئے ہیں۔ تم مجھے پاپا اور چچی کو امی کہا کرو۔ تم ہماری بیٹی ہو۔ تم یوں سمجھو کہ تمہارے باپ کی روح نے اپنا لباس یعنی جسم بدل لیا ہے اور اب میرے جسم میں آ گئی ہے اٹھو، ہنسو بولو، خوش رہو۔"

ان الفاظ کے ساتھ چچا کی اپنی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں اور وہ منہ پھیر کر اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں غالباً وہ چچی کا دامن آنکھوں سے لگا کر کچھ دیر روتے رہے کیونکہ جب وہ باہر نکلے تو ان کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہے تھے اور چچی کا دامن بھیگا ہوا تھا اور وہ اداس سی نظر آ رہی تھیں پھر چچی نے پروین کو سمجھانا شروع کیا پروین سوچنے لگی۔ شاید یہ دونوں بزرگ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں اور اس کی اداسی کا سبب صرف باپ سے جدائی ہی ہو اور دوسرے واقعات محض بہانے ہوں مگر یہ دوسرے واقعات کچھ اتنے سنگین تھے کہ اس کا ذہن یہ دلیل قبول نہ کر سکا۔

اگرچہ بھائی کی موت کی وجہ سے یہ عید عید نہ تھی پھر بھی چچا کا حکم تھا کہ سب بچے عید پر گھر میں جمع

ضرور ہوں گے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق ٹھیک ہی تو کہا ہے
ان بیٹوں کی آمد سے گھر میں بہت رونق آ گئی تھی۔ لیکن جب عید سے دو روز قبل کپتان مجیب بھی آ
گئے تو گھر میں اس وقت وہ شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سب لوگ خوشی سے شور مچا
رہے تھے۔ پروین کے ذہن میں خیال کی ایک لہر آئی کہ خوشی کے اظہار کے لئے شور مچانا ضروری
ہے اس کا جی چاہا کہ وہ ایک لرزہ خیز قسم کا قہقہہ لگائے مگر فوراً اسے خیال آیا کہ یہ تو دیوانگی کا عمل
ہو گا اور وہ اپنے ارادے سے باز رہی۔

وہ سوچنے لگی کہیں میں واقعی پاگل تو نہیں ہو گئی جو ان سب لوگوں کی باتیں مجھے عجیب معلوم
ہو رہی ہیں، یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میری تنہائی کی زندگی اور تربیت نے مجھے غلط احساسات و خیالات کا
شکار بنا دیا ہے۔ میں پاگل تو ہرگز نہیں ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔ یہ میرے ہاتھ ہیں، یہ پاؤں ہیں، میں
چیزوں میں تمیز کر سکتی ہوں۔ سوچ سکتی ہوں، ابھی ابھی میں نے اپنا قہقہہ دبا کر فرزانگی کا ثبوت دیا ہے۔
پاگل انسان خود پر قابو کب پا سکتا ہے ——— تو پھر میرے خیالات ہی غلط ہیں۔ اسی لئے میں
پریشان ہوں ——— لیکن مجھے اس بات کا بھی تو یقین نہیں ہے ——— اگر یہی حالت کچھ دیر اور
قائم رہی تو پھر میں ضرور پاگل ہو جاؤں گی ——— لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیئے ——— بس نہ وہ
کو سنبھالتی ہوں ——— اب میں خوش رہنے کی کوشش کروں گی" ——— اور یہ کہہ کر وہ مسکراتی
ہوئی آئینے کے سامنے جا کھڑی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی مسکراہٹ بھی اس کا تمسخر اڑا رہی ہو۔

یہ صحن کا شور تھا جو پروین کو کمرے سے باہر کھینچ لایا تھا اس کے سامنے صحن کے دروازے
کے قریب بڑے کمرے والی ایک تصویر بہت بڑی ہو کر کھڑی تھی اور اس میں جان پڑ گئی تھی اور
وہ بے ہنگم قہقہے لگا رہی تھی۔ یہ ایک بل ڈاگ تھا جو بڑے سائز کے دو السیشن کتوں کی زنجیریں تھامے
کھڑا تھا۔ کتے آگے کو زور مار رہے تھے اور زنجیریں لوہے کی سلاخوں کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ امجد میاں
کا ایک ڈھول بنا کر فوجی انداز سے پیٹ رہا تھا اور اشفر دونوں ہاتھوں کا بگل بنا کر منہ سے جا رہا تھا
اور پیپ پیپ ——— پیپ پیپ ——— کی آوازیں لگاتار پیدا کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو پروین کو
محسوس ہوا جیسے واقعی کوئی فوجی دستہ صحن میں آ اترا ہے ——— کپتان صاحب اوپر کے ہونٹ
پر موٹی موٹی مونچھیں سنبھالے شور انگیز قہقہے لگا رہے تھے ایسا لگتا تھا کہ مونچھیں اب گریں اور

اب تو یہ پروین یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اگر وہ مرنجیں لگ گئیں تو وہ آگے بڑھ کر انہیں زمین سے اٹھا کر بڑے بھائی کے سپرد کرے یا نہیں۔

"ہا ہا ہا ——— ہو ہو ——— ہو ہو ——— دھم دھا دھم ——— پیپ پیپ پیپ ——— پیپ پیپ پیپ ——— دھاں دھاں ——— دھاں دھاں" کے شور میں پیچی نے پروین کا ہاتھ تھاما اور اسے مجیب کے پاس لے جا کر اس کا تعارف کروا دیا۔

"پروین! ہا ہا ہا ——— او ——— پروین ——— ہو ہو ہو ——— ہا ہا ہا ——— گھر گھر گھر ——— بجا بجا بجا ———" پروین حیران تھی کہ یہ کس قسم کے قہقہے تھے۔ کیا فوجی ایسے ہی قہقہے لگاتے ہیں اور پھر ایک گلے سے اتنی متعدد آوازیں، اتنے متعدد قہقہے کیونکر نکل سکتے ہیں ——— اچانک کپتان صاحب نے ہاتھ بڑھا کر پروین سے وہ زوردار مصافحہ کیا کہ وہ لرز کر رہ گئی۔ ساتھ ہی السیشن کتوں نے بھی خوشی سے دیوانہ وار قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ ایسی گھبرائی کہ چیخ کر پیچی کے پیچھے جا چھپی۔

"ہا ہا ہا ——— ہمارے کتوں سے ڈرتی ہے ——— ہو ہو ہو ——— گھر گھر گھر ——— بجا بجا بجا ——— تم کیا لڑکی ہے ——— یہ کاٹتا نہیں ——— ایں ——— دیکھو ٹائگر، ہیلو پیرڈ ——— یہ پروین بھی تمہارا مالک ہے ——— ایں ——— ڈیل ——— تم ان سے ٹھیک بی ہیو (BEHAVE) کرتا ——— ایں (TEASE) نہیں کرتا ——— ایں ——— ہا ہا ہا ——— ہو ہو ہو ——— بھب بھب بھب ——— لو ان سے ہاتھ ملاؤ (SHAKE HANDS) ——— ایں ——— دوستی کرو ——— او ڈرتی ہے ——— ہا ہا ہا ——— ہو ہو ہو ——— بھب بھب بھب ——— گھر گھر گھر"

کپتان صاحب نے کتوں کی زنجیریں کھول دیں۔ پروین اور زیادہ پیچی کے قریب ہو گئی کتوں نے سب کے پاؤں سونگھنا شروع کیے۔ اسد کا ڈھول اور امجد کا بگل برابر فوجی انداز میں بج رہے تھے۔ آخر کپتان بھائی آئے تھے کوئی مذاق نہ تھا۔ شایان شان استقبال ضروری تھا۔

پیچی اپنی جگہ حیران تھیں اور خوش بھی۔ وہ بچوں کے بیچ سنبھال اپنے کتوں کو "انہوں نے پیار بھرے تعجب سے کہا" ارے پڑا نہیں۔ پریشان کیے دے رہے ہیں بے چاری پروین کو۔"

مجھ کے بیچے پر تو کوئی اثر نہ ہوا البتہ کتے خود ہی زمین سونگھتے اندر کمروں کی جانب چل دیئے اور پروین نے ایک بار آرام کا سانس لیا۔ مگر یہ سانس ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ کپتان نے ایک زوردار ہاتھ اس کے کندھے پر مارتے ہوئے کہا "او تم ڈرو نہیں ہمارے کتے صرف دشمنی کو کاٹتے ہیں ——— ایک بار اور ملٹری میں ایک ENEMY سے DIFFERENCE ہوا ——— اینڈ دی فائٹ AND WE FOUGHT ہمارے دوست کتے ساتھ تھے ——— انڈین نے FRONT سے وہ ATTACK مارا کر ENEMY کو HOSPITAL جانا پڑا ——— مگر یہ دوست کو کچھ نہیں پڑتا ——— اور ملٹری میں عورت لوگ کتے سے نہیں ڈرتا۔ تم چل کر دیکھو ——— وہ ان سے EMBRACE کرتا، پیار کرتا ——— اور فوج میں تمہارا FEAR ختم ہو جائے گا ——— ایں ——— ہاہاہا ——— ہو ہو ہو ——— بھر بھر بھر ———"

پروین کو یوں لگا جیسے وہ کسی پاگل خانے میں کھڑی ہو جہاں ہر پاگل اپنی ڈفلی بجا رہا ہے تاکہ نو وارد بھی ان جیسا پاگل ہو جائے۔

عین اس وقت ڈولی کے چلانے کی آواز آئی جسے سنتے ہی پروین بے قرار ہو کر پچھلے کمرے کی طرف بھاگی۔ برآمدے کے سرے پر ہی وہ رک گئی دو عدد السیشی کتے ڈولی کو دبوچے تھے اور وہ بے چاری دم بھیگی ٹانگوں میں دبائے، حیران، گوشۂ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھی

"انہیں روکئے ——— میری ڈولی ——— یہ اسے مار ڈالیں گے ———

چچی جان انہیں روکئے" پروین نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

THEY WILL NOT HARM HER ——— ہاہاہا ——— DONT FEAR"

——— ہو ہو ہو ——— وہ تو دوستی کرتا ہے ——— LOVE کرتا ہے ———

دیکھا فوجی کتنی جلدی دوستی کرتا ہے ——— اور تم ڈرتا ہے ——— ایں ———

ہاہاہا ——— ہو ہو ہو ——— ببب ببب ببب" اور کپتان، سراسیمہ پروین کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا

اچانک ڈولی جان کی امان کی تلاش میں بھاگتی ہوئی باہر کے دروازے کے قریب

پہنچی تو پروین نے آگے بڑھ کر فوراً دروازہ ایک لمحے کے لئے کھول دیا۔ ڈولی سیدھی باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہو گیا اور عجیب لمبے کتے اپنے پنجوں سے دروازے کو نوچنے لگے۔ اب کپتان صاحب نے اپنی امی کی چیخ و پکار پر دھیان دیا اور کتوں کو دوبارہ زنجیروں میں باندھ دیا گیا اور جب تک کپتان اپنے کمرے میں داخل نہیں ہو گیا اسد اور ماجد کا فوجی بینڈ برابر مصروفِ کار رہا۔

پروین بھی اپنے کمرے میں جا بیٹھی وہ بہت تھکی تھکی سی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی طوفان آیا تھا جو گزر گیا وہ خواب کی سی کیفیت میں آنکھیں موندے بڑی دیر تک بیٹھی رہی نہا دھو کر کپتان صاحب مع اپنی امی کے برآمدے میں آ بیٹھے اور نیم غنودگی کی حالت میں پروین نے ان کی گفتگو کا ایک حصہ سُنا!

"مجو بیٹا" پروین کی چچی کہہ رہی تھیں "تم کتنے بھی بڑے ہو جاؤ، کپتانوں کے بھی کپتان بن جاؤ، میرے لئے تو بچے ہی رہو گے۔ پچھلے سال بھی تم نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کر لو گے مگر تم ٹال گئے اور ایک اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے جاتی رہی۔ جب تک بڑے بھائی کی شادی نہ ہو جائے بچے سمجھتے ہیں کہ انہیں ابھی شادی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسد تو خیر بے شرم ہے، اپنی مرضی کرتا ہے تمہاری عمر بھی بڑھتی جا رہی ہے، اب میں تمہارا کوئی اعتراض نہیں سنوں گی۔ تم اتنے بڑے افسر ہو، جس لڑکی کی طرف اشارہ کر دو گے۔ تمہاری ہو جائے گی ——— اور اب تمہارے اپنے گھر میں ایک چاند اترا ہے، میں تو کہتی ہوں تم اس چاند کو اپنا لو ——— دیکھو پروین کتنی اچھی لڑکی ہے، میں نے اس سے اچھی لڑکی اب تک نہیں دیکھی۔ تمہارا بیاہ ہو جائے تو پھر چھوٹے میرے سامنے نہیں بول سکیں گے۔"

"ڈیل ممی ——— ہم نے سوچ لیا ——— بلکہ DECIDE کر لیا ———
پروین ہم کو بہت GOOD لگی ——— بہت سویٹ ——— VERY WEET
——— ہاہاہا ——— ہوہوہو ———"

"جیتے رہو بیٹا۔ تم نے جی خوش کر دیا" یہ الفاظ چچی کے تھے۔ اس کے بعد شائد اس نے بیٹے کی بلائیں لی ہوں گی۔ لیکن پروین اور کچھ نہ سن سکی۔ اس کا دل ڈوبتا رہا اور وہ

یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ کیا ہونے والا ہے اور اُسے کیا کرنا چاہیئے لیکن وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس گھر سے بھاگ جائے مگر اسے یوں لگا جیسے اب ایک بلّی اگلے دروازے پر پہرہ دے رہا ہے اور وہ کہیں نہیں جا سکتی۔

یہ واقعات صبح کے تھے۔ ڈولی دوپہر تک واپس نہ آئی۔ پروین سخت فکر مند تھی۔ پھوپا چچے بیٹوں کے ساتھ اس قدر مصروف تھیں کہ کسی کو بھی ڈولی کا خیال نہ آیا۔ پروین بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی مگر دیر تک ڈولی کی صورت نظر نہ آئی اور جب اچانک وہ نظر آئی تو پروین کا غم اور بڑھ گیا۔ پروین نے دیکھا کہ ڈولی بھاگی آ رہی ہے اور کئی آوارہ کتے اس کا تعاقب کر رہے ہیں وہ گھر کے قریب آئی مگر اس سے قبل کہ پروین نیچے جا کر دروازہ کھول سکے آوارہ کتے اس کے سر پر آموجود ہوئے اور وہ پھر کسی جانب بھاگ نکلی۔

پروین نے خادمہ کو یہ منظر دکھایا اور اسے حکم دیا کہ ملازم اور مالی کے ذریعے ڈولی کو تلاش کروا کر گھر لے آئے۔ خادمہ "اچھا جی"، کہہ کر معنی خیز انداز سے مسکراتی ہوئی چلی گئی

تلاش کے باوجود ڈولی نہیں مل سکی۔

پھر شام ہو گئی۔ مگر ڈولی گھر نہیں آئی۔

چچا جی اب گھر آ گئے تھے۔ پروین کی پریشانی کو دیکھ کر اب سب کو تشویش ہوئی کپتان صاحب کا خیال تھا کہ ڈولی گم نہیں ہو سکتی۔ ضرور واپس آ جائے گی۔

آج پروین کو پاپا اس قدر یاد آئے کہ وہ زار زار رونے لگی۔ ڈولی ان کی یادگار تھی وہ پاپا کا آخری تحفہ تھی۔ ان کا دیا ہوا آخری کھلونا تھی، زندہ جیتا جاگتا کھلونا اور جب اس نے شام کے کھانے میں شرکت سے انکار کیا تو چچی نے پہلے تو پیار سے سمجھایا اور پھر غصے سے کہا، "تو بہ، کوئی جانوروں سے بھی ایسا پیار کرتا ہے کہ ان کی خاطر بزرگوں، بھائیوں اور کھانے اور ہر چیز سے روٹھ کر رونے لگے؟"

یہ بات ایک تلوار تھی جو پروین کے دل کو کاٹتی ہوئی گذر گئی۔ اس کی سسکیاں تیز تر ہو گئیں اور آنکھوں کی جلن بڑھ گئی۔ کھانا بڑھا دیا گیا۔ سب لوگ اپنی اپنی خوابگاہوں کو چلے گئے۔ آخر پروین کو بھی نیند آ گئی۔

غم نے نیند میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے خواب میں بھی ڈولی کو دیکھا وہ خود گھر کی لے سامنے کھڑی تھی۔ ڈولی تیزی سے گھر کے کی سمت بھاگی آ رہی تھی مگر کئی تیز رفتار کتے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ شاید یہ وہی منظر تھا جو اس نے دن میں ایک بار دیکھا تھا اور جو اب خواب بن کر سامنے آگیا تھا —— ڈولی اور کتوں کا گروہ گھر کے قریب ہوتے جا رہے تھے وہ خوش تھی کہ ڈولی اب گھر آ جائے گی —— وہ اور قریب آگئی —— اور جب وہ بہت قریب آگئی تو پروین نے غور سے دیکھا کہ وہ ڈولی نہیں تھی —— اس کی صورت تو بالکل بدل چکی تھی —— وہ تو —— وہ تو وہ خود تھی —— پروین یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی کہ وہ تو وہ خود تھی جو گھر کی جانب بھاگی آ رہی تھی —— اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی —— شاید بھاگ بھاگ کر یہ حالت ہو گئی تھی اس نے محسوس کیا کہ یہ واقعی وہ خود تھی جو کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھی اس کا جی چاہا کہ اسے دروازہ کھلا مل جائے مگر وہ تو بند تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ باہر دروازے کے قریب موجود ہے اس نے دروازے کے اور قریب ہو کر گھوم کر دیکھا۔ کپتان مجیب کے دونوں السیشن کتے اس کے پیچھے آ رہے تھے مگر ان کے علاوہ کچھ اور کتے بھی تھے وہ ان کتوں سے بہت خوفزدہ تھی چنانچہ اور تیز بھاگنے لگی کتوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی اور وہ اس کے قریب آگئے۔ اس نے پھر گھوم کر دیکھا۔ تعاقب کرنے والوں میں ایک بل ڈاگ بھی تھا غور سے دیکھنے پر اسے معلوم تھا کہ یہ تو کپتان مجیب خود تھے۔ دوسرے تعاقب کرنے والوں کے چہرے بھی اُسے شناسا معلوم ہوئے —— اس نے دماغ پر زور دیا —— یہ تو —— یہ تو اسد اور جعفر اور امجد تھے۔

پھر وہ سب اتنا قریب آگئے، گویا حملہ کر دیں گے۔

چیخ کی آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے چچی اور خادمہ بھاگی آئیں۔ پروین کا جسم پسینے میں تر تھا اور وہ بُری طرح کانپ اور ہانپ رہی تھی، جیسے نامعلوم کتنی دور سے بھاگی چلی آ رہی ہو۔

چچی نے اسے سر سے پاؤں تک اپنے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے پریشانی کے ساتھ پوچھا کیا ہوا بیٹی؟ کیا بات ہے؟ پروین بیٹی خیر تو ہے؟ کیا خواب میں ڈر گئی ہو؟"

"جی —— جی ——۔ وہ —— وہ ——" پروین نے کانپتی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"وہ؟ وہ کیا بیٹی؟" چچی نے پیار سے پوچھا۔

"وہ —— وہ —— کتے —— کتے!" پروین نے یوں ڈرتے ہوئے کہا۔ جیسے کوئی لالہ سے دیکھا ہو۔

مقصود زاہدی

انٹرویو

میری اس کی پہلی ملاقات کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔ میں اور نسیم دفتر کے آٹھ گھنٹوں کا کسل کافی کی گوارا تلخی سے دور کر رہے تھے۔ کلرکوں اور کم اوقات پڑھے لکھے نوجوانوں کی ایک ہی عیاشی ہوتی ہے، اور وہ ہے کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے یا کافی پی کر خوش وقت ہو بیٹھنا۔ ہماری نگاہیں دور میز پر بیٹھے ہوئے دو نوجوانوں اور ان کی ہمراہی لڑکی پر جا پڑتی تھی۔ پاکستان کے کسی بھی ہوٹل یا ریسٹوران میں کسی خوبصورت لڑکی کا موجود ہونا ایک حد درجے اشتعال انگیز بات تصور کی جاتی ہے۔ عورت کے بارے میں ہم لوگوں کی نفسیات ہی کچھ عجیب ہوتی ہے۔ جب ہم کسی خوش پوشاک حسین لڑکی کو دیکھتے ہیں۔ تو ہمارے ذوق حسن و جمال کی اک گونہ تسکین ہوتی ہے۔ لیکن خدا جانے دماغ کے کس گوشے سے کلبلاتے ہوئے عجیب و غریب بے ہنگم سے خیالات آنے لگتے ہیں اور بجائے ذہن و نگاہ کی آسودگی حاصل کرنے کے ہم اصلاح معاشرہ۔ پردہ۔ ور خدا جانے کن کن موضوعات پر باتیں کرنے لگتے ہیں میں اور نسیم بھی، اگرچہ ہماری نگاہیں لڑکی کی آسمانی رنگ کی ساڑھی سنہرے بلاؤز اور اس کے جوڑے میں لگے ہوئے چمپئی رنگ کے گلاب کے پھول میں بار بار الجھ ہوتی جاتی تھیں۔ کچھ ایسی ہی بحث میں الجھ گئے۔ میں پردے کی حمایت میں دلیلیں پیش کرتا

لیکن میری نگاہیں لڑکی کی لوچدار کلائیوں اور اس کے جوڑے کے نیچے جھلکتی ہوئی شفاف گردن کی جانب کھنچی جاتی تھیں۔ اور ہم کیا کافی ہاؤس میں موجود تمام ہی لوگوں کی نگاہوں کا مرکز وہ لڑکی بنی ہوئی تھی۔ اس کی حسین وجمیل شخصیت ہر نگاہ کو دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ میری نگاہیں کبھی کبھی اس لڑکی کے پس منظر پر جا پڑتیں۔ کافی ہاؤس کی خوبصورت منقش دیواروں پر جا بجا مصوری کے بڑے خوبصورت شاہکار آویزاں تھے۔ اور عین اس لڑکی کے عقب میں ایک تصویر اجنتا کی قدیم مصوری کی یاد دلا رہی تھی۔ کوئی دوشیزہ تالاب سے گاگر بھر کر نکل رہی تھی۔ اس کے سینے کے صحت مند اُبھار۔ اس کی کمر کے دلآویز خم اور اس کے نیم عریاں جسم کے نازک خطوط نگاہوں کو جذب کئے لیتے تھے۔ میں بے دلی سے غیر ضروری باتیں کرتا اور کنکھیوں سے کبھی تو زندہ حسن رنگین اور کبھی تصویر کے اس بے جان حسنِ فطرت کا موازنہ کرنے لگتا کہ یکایک "اخاہ!" کی آواز اور نسیم کے ہڑبڑا کر اٹھنے سے میری تمامتر توجہ ایک نووارد کی طرف مبذول ہو گئی۔

ضرورت سے زیادہ بڑھے ہوئے ناتراشیدہ بال۔ سنہری کمانی کا چشمہ۔ ایک خاص وضع قطع کا لباس۔ جس سے انفرادیت کا اظہار ہوتا تھا۔ چال ڈھال میں ایک بے نیازی سی اور نگاہوں سے احساس برتری کا ایسا ترشح جو گردن کش لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ "ہوں گے کوئی برخود غلط فنکار۔ کوئی لیلائے سیاست کے دیوانے۔ کوئی شاعر یا ادیب۔" میں نے سوچا اور بادلِ نخواستہ نسیم کا ساتھ دینے کے لئے نووارد کے استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوا رسمی تعارف کے بعد جس میں نسیم نے ان حضرت کی ذہانت و فطانت اور جودتِ طبع کا بڑھ چڑھ کر ذکر کیا تھا ہم لوگ بیٹھ گئے اور کافی کا دَور چلنا شروع ہوا۔

مجھے کسی بے تکلف دوست کی صحبت میں کسی ایسے شخص کا ٹپک پڑنا جو اجنبی ہو۔ یا جسے میں دل سے پسند نہ کرتا ہوں۔ ہمیشہ تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کا مثلث میرے لئے ذہنی کوفت کا باعث ہوتا ہے اور میری دلی خواہش یہ ہوا کرتی ہے کہ ایسی مجلس جس قدر جلد ممکن ہو سکے ختم ہو جائے۔ پھر ایسے نمائشی قسم کے لوگوں کی صحبت تو میرے لئے سخت عذاب ہوتی ہے لیکن اس دن یہ بوریت مجھ پر زیادہ دیر طاری نہ رہ سکی۔ اس نے نسیم

سے دو چار ہی باتیں کی تھیں کہ مجھ پر اس کی قوت بیان اور دماغی برتری کا رعب چھانے لگا۔ اور میں نے محسوس کیا کہ وہ ہرگز ان ادنیٰ نوجوانوں میں سے نہیں ہوسکتا۔ جو اپنے سادہ لوح دوستوں پر اپنی ہمہ دانی کا رعب جماتے پھرتے ہیں۔ اس نوجوان کا دماغ تو نازک اور اچھوتے خیالات کی آماجگاہ معلوم ہوتا تھا۔ بالکل نادر اور انوکھے انداز میں وہ ان خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔

"لیکن آخر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟" نسیم نے حیرت زدہ انداز میں اس سے دریافت کیا اور اس کے چہرے کو تکنے لگا۔

"آخر کیوں نہیں ہوسکتا! اس نیلے آسمان کے نیچے کونسی بات ناممکن ہے!! ہماری پستیوں کا یہی تو ایک بڑا سبب ہے کہ ہم ہر اک بات کو پہلے ناممکن بنا لیتے ہیں۔ آپ سوچئے اس میں تعجب کی کونسی بات ہے! دیکھئے کل ہی تمام اخبارات میں خبر شائع ہو جائے گی کہ پاکستان کا ایک نامور سیاح مشرقِ وسطےٰ کے ممالک کی سیاحت کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔ سیاح موصوف کا ارادہ ہے کہ وہ مشرقِ وسطےٰ کے تمام ملکوں کا ایک تہذیبی اور ثقافتی البم تیار کرے گا جس میں ان ممالک کی قدیم و جدید تاریخ و تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائیگی"

یہ سب کچھ اس نے ایک سانس میں اسی طرح کہا۔ جیسے یہ اشتہار مدتوں کے غور و خوض کے بعد اس کے لوحِ ذہن پر آویزاں ہو گیا تھا۔ پھر وہ ہنس کر کہنے لگا "پھر یہ میرا قلم اور یہ میرا کیمرہ میری آوارگیوں کا رفیق ہوگا۔ ان مختصر سا سفری سامان اور میری ہر نقل و حرکت کا ذکر جگہ جگہ کے اخبارات میں جلی حروف میں شائع ہونے لگے گا"

"لیکن مسئلہ تو یہاں ختم نہیں ہو جاتا جناب!" نسیم نے ایک مشکوک سے انداز میں کہا اور کافی کی تیسری پیالی سے شغل کرنے لگا۔

"مسائل غور و فکر سے نہیں بلکہ عمل سے حل ہوا کرتے ہیں۔ جرأت رندانہ کے ساتھ ایک جست لگانے کی دیر ہوتی ہے۔ اور سب مشکلات حل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ میرے ذہن میں یہ تدبیر پوری طرح مربوط شکل میں موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام عمر کی کلرکی سے اس زندگی کا ایک ماہ کئی گنا قیمتی ثابت ہو سکتا ہے۔ ذرا آپ سوچئے تو اس مصور البم کی کیا قدر و قیمت ہوگی!

وہ البم ان تمام ممالک کی تہذیب و ثقافت کا ایک بھرپور خزانہ ہوگا۔"

یہ کہتے وقت اس کی نگاہوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوگئی تھی۔ جیسے اس نے سالہا سال کی محنت و مشقت، مسافت اور تحقیق و جستجو کے بعد ایک نہایت شاندار سنہری جلد کا البم تیار کرلیا ہو اور اس البم کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت کا آفتاب بھی نصف النہار پر پہنچ چکا ہو۔

مجھے اس کے بُشرے کی سنجیدگی اور لہجے کی پروقار متانت سے کچھ یقین سا تھا کہ وہ دنیا کے ان لوگوں میں سے ہے جو صرف بڑے کاموں ہی کے لئے خلق کئے جاتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی مجھے اس پر رشک سا آنے لگا۔ اس پر، اس کے چہرے کی مرعوب کن سنجیدگی پر، اس کے لباس کی منفرد تراش خراش پر اور اس کے عزم سے بھرپور پروقار انداز بیان پر۔ میں سوچنے لگا کہ آخر میں خود کون ہوں اور کیا ہوں۔ اک یونہی اپنی اور دوسروں کی نظروں میں حقیر سا بیچارہ کلرک جس کے خیالات کی پرواز محض دفتر اور اس کی فائلوں تک محدود ہوتی ہے۔ اور جس کے لئے یہ دنیا اور اس کی بے پناہ وسعت ایک بے معنی حقیقت سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ یہ سوچتے سوچتے میری نگاہیں یکایک پھر اس آسمانی رنگ کی ساری میں ملبوس خوبصورت لڑکی پر جا پڑیں۔ جو ابھی تک اپنے نوجوان ساتھیوں کو اپنی دلربا مسکراہٹوں سے لُبھانے میں مصروف تھی اور عین اس لڑکی کے عقب میں وہ فطرت کا حسن سادہ اسی نظر فریب انداز میں اپنی خمیدہ کمر پر گاگر سنبھالے ہوئے اپنے جسم کے دلاویز خطوط کی نمائش میں مصروف تھا۔

"یہ زندہ حسن بھی قسمت والوں کی میراث ہے اور اس بے جان حسن کی تخلیق بھی بڑے دماغوں کی مرہون منت ہے۔" میں نے سوچا اور پھر مجھے خیال آیا کہ یہ شخص یقیناً ایک نہ ایک دن بڑا انسان ہوگا۔ ہر چھوٹے بڑے کی نوک زبان پر اس کا نام ہوگا۔ کالج کے طلبا اس کے آٹو گراف لینے کے لئے بےتحاشہ اس کی جانب دوڑا کریں گے۔

رخصت ہوتے وقت میں نے اس عالی ہمت نوجوان سے بہت گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے نہایت خلوص کے ساتھ کہا۔ "آپ سے مل کر مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔ کاش ہم کو جلد آپ کا مصور البم دیکھنا نصیب ہو۔"

ایک متین سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی اور اس کی آنکھیں ایک کامرانی کے

جذبے سے جگمگا اٹھیں۔

اس کے جانے کے بعد مجھے نسیم سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے کالج میں غیر معمولی ذہانت اور دل و دماغ کا طالب علم خیال کیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ امتحانات میں ایک امتیازی شان سے کامیاب ہوتا تھا۔ شعروادب کا وہ دلدادہ تھا۔ اور مصوری اس کا محبوب مشغلہ۔ نسیم نے کہا کہ اگر وہ واقعی سنجیدگی کے ساتھ اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہوگیا۔ تو کچھ عجب نہیں کہ وہ اپنی بات کو پورا کر دکھائے۔ کیونکہ اس میں بڑا انسان بننے اور نمایاں حیثیت حاصل کر لینے کی بھرپور صلاحیتیں موجود تھیں۔ لیکن جب نسیم نے اس کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ سنایا کہ وہ محض ایک بے وسیلہ اور غریب گھرانے کا فرد ہونے کے باعث اعلیٰ امتحانات میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کبھی کسی انٹرویو میں اور کبھی میڈیکل میں فیل ہوگیا تو مجھے بہت دکھ پہنچا میرے نزدیک یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس کی شخصیت کا سا انسان کسی میڈیکل یا کسی انٹرویو میں ناکام ہو جائے۔ میرے نزدیک تو اس جیسا انسان کسی بھی بڑے سے بڑے عہدے اور مرتبے پر فائز ہو سکتا تھا۔

اس واقعہ کو ایک مدت گزر گئی۔ میں بدستور فوجی حسابات کے غدار دفتر میں کام کرتا رہا۔ میرے اوقات بالکل ٹکے بندھے سے تھے۔ میری زندگی دفتر کے محور پر گردش کر رہی تھی۔ تنخواہ چیونٹی کی رفتار سے رینگ رہی تھی۔ اور گرانی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ جو شے آج روپے میں ملتی تھی۔ وہی کل دو روپے میں ملنی دوبھر تھی۔ چور بازار کا تو ذکر ہی بیکار ہے۔ وہ اشیاء بھی جن کی قیمتیں مقرر تھیں۔ دن پر دن گراں ہوتی جا رہی تھیں۔ تنخواہ پیٹ بھرنے کے لئے بھی ناکافی تھی۔ تن ڈھانپنا تو کجا۔ جب کبھی کہیں جانے کے لئے کپڑوں کا جائزہ لیتا تو پاجامے پھٹے ہوئے۔ شلواریں زدہ اور قمیصیں ایسی نکلتیں جن کا نہ کالر درست ہوتا اور نہ کف۔ پھر بھی سوائے صبر کے کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ زندگی خوش و ناخوش بسر ہو رہی تھی۔ لے دے کر کوٹ اور پتلون ہی سہارا بنے ہوئے تھے۔ ہر شخص کوٹ پتلون پہنے نظر آتا تھا جیسے قومی لباس کوٹ پتلون ہی تھا۔ میرے پاس بھی نہ جانے کب کے بنے ہوئے موٹے کپڑوں کے تین چار انمل بے جوڑ سوٹ تھے۔ اور بس اندگی

کے اس روح فرسا ماحول میں گرفتار، مجھے کبھی کبھی اس نوجوان کا خیال آجاتا کہ وہ خدا جانے ایران ہوگا یا عراق، مصر ہوگا یا شام۔ اور ایسے موقعوں پر یہ سوچ کر کہ وہ ایک آزاد انسان کی طرح بابل اور نینوا کی قدیم تہذیبوں کا جائزہ لے رہا ہوگا۔ قاہرہ اور دمشق جن تہذیبوں کے ہزار ہا سال مرکز رہے ہیں۔ ان کے کھوج لگا رہا ہوگا۔ مجھے اپنی زندگی بڑی ہیچ و پوچ نظر آنے لگتی۔ یکسانیت سے بھرپور بالکل پھیکی اور بے مزہ۔ پھر میں سوچتا کہ چلو کیا ہے۔ اگر ہم زندگی میں آگے نہ بڑھ سکے تو ایسے کسی شخص سے ملاقات تو ہے۔ جو ہمارے ملک کے بڑے انسانوں میں شمار ہوگا۔ اک بڑا سیاح، نہ جانے کتنے مصور البموں کا خالق جن میں دلچسپی کی "تہذیبیں اور تمدن [illegible] کے رشتے ہوں گے۔ آنے والی نسلوں کے لیے وہ فاہیان البیرونی اور ابن بطوطہ سے کم تو نہ ہوگا۔

ایک دن میں حسب معمول دفتر سے فارغ ہو کر اپنے ساتھی کلرکوں کے ہمراہ ہنستا ہوا تمام دن کی مزاج کی کدورت کو دھوتا چلا آرہا تھا کہ اچانک میری نگاہ اک جانے پہچانے چہرے پر جا کر ٹھہر گئی۔ اُسی نرالی تراش خراش کے کپڑوں میں سنہری فریم کا چشمہ لگائے وہی نوجوان ایک کباڑی کی دکان سے نکل رہا تھا۔ اُس کے سر کے بال اب بھی لاابالیانہ انداز میں ضرورت سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا پرانا بقول اس کے "آوارگیوں کا رفیق" کیمرہ اس کے شانوں پر لٹکا ہوا تھا۔ اور وہ مجھے ایک مثالی آرٹسٹ نظر آرہا تھا۔ اس کی بغل میں چند کتابیں تھیں۔ جو اس نے غالباً کباڑی کی دوکان سے خریدی تھیں۔ میں اس کی جانب ہمہ تن شوق بن کر ملاقات کی غرض سے بڑھا۔

"اخاہ آپ ہیں! ہم ضرور اس سے پہلے کہیں ملے ہیں نا؟" اس نے نشۂ برتری سے مخمور نگاہیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے استفسارانہ انداز میں کہا اور جیسے سوچنے لگا کہ ملاقات کہاں اور کب ہوئی تھی۔ میں دل میں کچھ شرمندہ سا ہوگیا۔ لیکن میں نے یہ کشمکش و پیچ کی کیفیت جلد ہی ختم کر دی۔ "نسیم کے ہمراہ ایک دن کافی ہاؤس میں آپ سے .... فرمائیے آپ کی اس سیاحت کی اسکیم کا کیا بنا؟ مشرقِ وسطےٰ کے کون کون سے ملک ......؟"

"ہاں! . . . . اچھا وہ سکیم!! اجی چھوڑیئے بھی اس دنیا میں اسکیموں کی کوئی کمی نہیں۔ کمی تو صرف دماغوں کی ہے۔ میں آج کل اس سے بھی بہتر اسکیم پر عمل پیرا ہوں"۔ اس نے یہ کہہ کر میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ میں اور بھی شرمندہ ہو گیا۔ "درحقیقت اس دنیا میں کمی تو صرف دماغوں کی ہے۔ وگرنہ اسکیموں کا کیا ہے؟" میں نے اس کے خیال کی جگالی کرتے ہوئے سوچا۔

"آج کل آپ کس اسکیم پر عمل پیرا ہیں؟"

میں نے پر اشتیاق لہجے میں دریافت کیا اور اس کے ہمراہ چند ساعتیں گزارنے کے خیال سے میں نے اپنے ساتھی کلرکوں سے رخصت لے لی۔

"کچھ نہیں اک نہایت معمولی سی بات جو ہر شخص کے دماغ میں آ سکتی ہے۔ دیکھئے یہ کتابیں . . . .! یہ گندی اور غلیظ کتابیں۔ جو میں اس جاہل کباڑی کے ہاں سے لے کر نکلا ہوں۔ ان کتابوں پر میں نے بڑی حقیر رقم خرچ کی ہے۔ لیکن میرا ارادہ ہے کہ ان سے عزت۔ شہرت اور دولت سبھی کچھ حاصل کروں"۔

"ان کتابوں کو بیچ کر؟" میں نے بات نہ سمجھ کر حیرانگی کے عالم میں پوچھا۔

"نہیں جی! آپ سمجھے نہیں!! کتابیں کے کوڑی میں بک سکتی ہیں۔ جناب میرا مدعا اس علم سے ہے۔ جو ان چند کتابوں میں پنہاں ہے۔ یہی تو وہ دولت بے قیاس ہے جس کی بدولت یوروپ و امریکہ کی اقوام آج تمام عالم امکاں پر چھائی ہوئی ہیں۔ وہ چاند سورج پر کمندیں پھینک رہے ہیں۔ حضرت ستاروں سے آگے جو جہان ہیں۔ ان تک انہی کتابوں میں پنہاں علم کے ذریعے رسائی ہو سکتی ہے۔ بس یہی خیالات و افکار جب ہماری زبان میں منتقل ہو جائیں گے تو ملک کے باشعور حلقوں میں اک تہلکہ مچ جائے گا۔ دو چار ہی کتابوں کی اشاعت کی دیر ہے۔ میں اک بڑا ناشر بھی بن جاؤں گا۔ اور مجھے بخوبی معلوم ہے کہ ہمارے ملک کے عوام کی کور ذوقی اور پاستگی کا ایک بڑا سبب اچھے ناشروں کا فقدان بھی ہے . . . . ذرا آپ غور تو کریں . . . ."

اور اس نے میرے روبرو اک پوری اسکیم پھیلا کر رکھ دی۔ جیسے وہ مدتوں سے اسی

منصوبے پر غور کرتا رہا تھا۔ تب کہیں جا کر اس نے وہ لائحہ عمل اپنے ذہن میں مرتب کیا تھا کہ کتابیں
کن موضوعات پر شائع ہوں گی۔ ان کے سرورق کیسے ہوں گے۔ ان کی تشہیر کے لئے ماہوار
اور ہفتہ وار جرائد کا اجرا وغیرہ وغیرہ۔ جب وہ اپنے خیالات ظاہر کر چکا تو میں نے
دیکھا کہ اس کے چہرے پر وہی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہونے کی امید سے بھرپور مسکراہٹ
کھیل رہی تھی۔ اور اس کے سنہری کمانی کے چشمے سے پھوٹتی ہوئی گہری نظریں میرے
دل پر اس کے حد درجے اولی العزم اور بلند خیال ہونے کی حقیقت ثبت کر رہی تھیں

میں ابھی تک وہی ایک سو روپے ماہوار اور تیس روپے مہنگائی الاؤنس پا رہا تھا۔
کہنے کو یہ ایک سو تیس روپے تھے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ رقم میرے بڑے کنبے کا تو در کنار کسی
مختصر سے کنبے کا بھی پیٹ پالنے کے لئے ناکافی تھی۔ سفید پوشی کو برقرار رکھنا محال نظر آ رہا
تھا۔ کبھی زبان کی چاٹ کو پورا کر لیا تو کپڑے پھٹ گئے۔ ذرا کپڑوں کی طرف توجہ کر لی تو
بھوکے مرنے لگے۔ غرض زندگی یونہی اک جبر مسلسل کی مانند گزر رہی تھی۔ آرام اور آسائش
کا تصور تک ذہن میں کھٹکتا تھا۔ جب تک ملک اجنبی اقتدار کے ماتحت رہا۔ یہی سوچتے
تھے کہ جب ملک کو آزادی مل جائے گی۔ تو من برسے گا۔ اور ہر شخص خوشحال ہو جائے گا
لیکن توبہ کیجئے۔ آزاد ہوئے یہ بہا برس گزر چکے لیکن خدا جانے اس آزادی کے ثمرات
سے کون فیض یاب ہو رہا تھا۔ ہماری زندگی تو بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

وہ کبھی کا جا چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ دنیا کی ترقی یکایک رک جائے۔ اگر ایسے انسان
دنیا میں نہ ہوں۔ اس کارگہ حیات کی تمام رونق ایسے ہی دماغوں کی مرہون منت ہے۔ ورنہ
یوں گدھوں اور بیلوں کی مانند جُتے رہنے اور زندگی کا بھاری جوا کاندھوں پر اٹھائے روز و
شب محنت و مشقت کرنے سے کیا ہوتا ہے میں نے اس وقت دل میں تہیہ کیا کہ میں بھی
ضرور کوئی ایسی ہی سکیم دماغ میں پکاؤں گا۔ آخر یہ کلرکی اور یہ بے روح زندگی تابکے۔ جو
انسان نہ اپنے کام آ سکے اور نہ بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے کچھ کر سکے وہ بھی کوئی انسان ہے۔

میں روز دفتر جاتا رہا۔ اپنے افسروں کی جھڑکیاں سنتا رہا۔ اپنے دفتر کے ساتھیوں سے
زُو بڑدانی افسروں کو برا بھلا کہہ کر اور ان کو اپنے مذاق کا نشانہ بنا کر دل بہلاتا رہا اور فائلیں

کی فائلیں چاٹتا چلا گیا۔ دل کی تمام تری ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اور دماغ دفتری معلومات کے خس وخاشاک کا اک انبار بنتا جا رہا تھا۔ نگاہ کی شوخیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ راہ چلتے کسی حسینہ کی دزدیدہ نگاہ بھی اب میرے دل پر چوٹ نہ مارتی تھی۔ کافی ہاؤس جانا بھی کبھی کا چھوٹ گیا تھا۔ اگر وہاں جاتا بھی تو رنگین ملبوسات میں لپٹی ہوئی خوش منظر صورتیں اور وہ تصویروں کی بھرپور اطرح جوانیوں کی عریانیاں بھی شاید میری توجہ اپنی جانب مبذول نہ کر سکتیں۔

میں رات کو سونے سے قبل دیر تک بستر پر کروٹیں بدلا کرتا۔ اور مسلسل سوچ بچار کیا کرتا کہ شاید کوئی اسکیم ذہن میں آ جائے۔ جس کی بدولت زندگی کا بھاری جوا نسبتاً ہلکا ہو جائے۔ کچھ دلدّر دور ہو جائیں۔ لیکن ایسی کوئی بات دماغ میں نہ آنی تھی نہ آئی ہر ہر بات میں ہزاروں خامیاں اور رکاوٹیں نظر آ جاتیں۔ ہر منصوبہ ناممکن العمل معلوم ہوتا اور ایسا نظر آتا کہ کوئی بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ جب تک دولت پاس نہ ہو۔ دماغ کی اس بے بضاعتی پر مجھے غصہ بھی آتا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا۔ صاحب دماغ ہونا بھی تو اپنے بس کی بات نہیں۔

اسی دوران میں میرا ایک دوسرے مقام پر تبادلہ ہو گیا۔ کافی زمانہ گزارنے کے بعد وطن واپس آیا تو اک دن سوجھی کہ چلو سینما دیکھ آئیں۔ کوئی بہت اچھی پکچر لگی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار سینما دیکھ لینا بھی کلرکوں کے خوش وقت ہونے کا ایک بڑا ذریعہ ہے....

پکچر میں وقفہ کے دوران جب ہال کی تاریکی یکایک روشنی میں تبدیل ہوئی تو میری نظریں سب سے پہلے جس شخص پر ٹھہریں وہ وہی جاذب نظر انسان تھا۔ وہی سنہری کمانی کا چشمہ، وہی فنکاروں کے سے بڑھے ہوئے بال اور وہی متین اور پروقار چہرہ۔ میں بے صبری کے ساتھ اپنی نشست چھوڑ کر اس کی طرف بڑھا اور اس کی مزاج پرسی کی۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ اب تو ضرور یہ کئی کتابوں کے مصنف ہوں گے۔ خدا جانے کتنی کتابیں ان کے دارالاشاعت سے چھپ کر قارئین کی دنیا میں ہلچل مچا چکی ہوں گی۔ ضرور ایک دو پرچے ان کی زیر ادارت نکل رہے ہوں گے۔ اور ان کے اشاعتی ادارے کی نہ جانے پاکستان کے مختلف شہروں میں کس قدر

شاخیں ہوں گی۔ اس خیال کے ساتھ ہی ساتھ میں اس کی زبردست آمدنی اور بے اندازشہرت سے دل ہی دل میں مرعوب ہونے لگا۔ شاید میں اس مرعوبیت کے زیر اثر اس سے کچھ پوچھ بھی نہ سکتا۔ لیکن وہ خود ہی مجھ سے مخاطب ہوگیا۔

"کہیئے حضرت! کیسے مزاج ہیں آپ کے!؟ اس مرتبہ تو بہت مدت میں ملاقات ہوئی آپ سے۔ کہاں غائب ہوگئے تھے آپ!!؟"

"جی ہاں!........ میرا تبادلہ ہوگیا تھا۔ بہت زمانہ باہر گزارنا پڑا۔ فرمائیے۔ آپ کے کیا مشاغل ہیں۔ اب تو آپ کئی کتابیں تصنیف فرما چکے ہوں گے نا؟........ میں تو یونہی ایک کورذوق سا انسان ہوں۔ کبھی کچھ لکھنے پڑھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا۔ ورنہ ضرور...."

"نہیں نہیں آپ اس قدر انکسار نہ فرمائیں۔ آپ بہت اچھا کرتے ہیں۔ جو ان کتابوں کی علت میں نہیں پڑتے۔ اگر آدمی تصنیف وتالیف پر کمر باندھے گا۔ تو کھائے گا کہاں سے۔ اس دنیا میں کوئی ہوا پھانک کر نہیں جی سکتا........" اس نے میری بات کاٹ کر اک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے غلط قیاس آرائی کی۔ ہمارے ملک میں شعروادب اور فلسفے کے اتنے قدردان کہاں۔ یہ کوئی یوروپ تو امریکہ تو نہیں کہ ایک افسانہ لکھ دیا اور سینکڑوں ڈالر کما لئے۔ اک ٹاک ریڈیو پر دے دی اور مہینہ بھر کی روٹیوں کا بندوبست ہوگیا۔ یہاں تو جناب شاعر اور ادیب کو داد کی بھی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ اور وہ بھی مشکل سے ملتی ہے۔ ہزاروں میں سے اگر کوئی تیز طرار ادیب یا کوئی شاعر آسمان شہرت کا درخشندہ ستارہ بن بھی گیا۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے......" یہ کہہ کر اس نے پہلے تو ایک لمبا سانس کھینچا۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

"حضرت میں اب ان مغالطوں کے طلسم کو توڑ کر بہت آگے نکل چکا ہوں۔ مجھے اس بات کا یقین کامل ہوچکا ہے کہ ہم پڑھے لکھے انسانوں کی ضرورت ان شہروں سے کہیں زیادہ ہمارے ان گنت پسماندہ دیہات کو ہے۔ کوئی ملک ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ جب تک اس کی آبادی کی اکثریت صحت مند زندگی بسر نہ کرتی ہو۔ ہمارے دیہات میں غلاظت، گندگی، توہم پرستی اور

چوہدریوں کا دور دورہ ہے۔ ان بھولے بھالے انسانوں کو لوٹنے کھسوٹنے کو ہر قسم کے انسانیت کے شکاری جال پھیلائے ہوئے ہیں۔ میں نے تو اب اپنی زندگی کا نصب العین یہی بنایا ہے کہ دیہاتیوں کی اصلاح کروں گا تعلیم بالغاں میرا وسیلہ بنے گا۔ اور جس علاقے کو میں نے اپنا مرکز بنایا ہے۔ اس کے فرد واحد کو بھی ناخواندہ نہ رہنے دُونگا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ یہ دیہات ہی میرے مستقبل کا سنگ بنیاد رکھیں گے۔ میرے علاقے کے باشعور افراد تو ابھی سے اس بات پر مصر ہیں ۔۔۔۔۔۔ اگرچہ میں خود نہیں چاہتا۔۔۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ میری خدمت کا صلہ مجھے دے کر رہیں گے۔ آئندہ اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر وہ ضرور مجھے اپنا نمائندہ منتخب کریں گے۔ میں خود ستائی نہیں کرتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ملک کو بیدار مغز سیاستدانوں کی ضرورت ہے۔ ان تہی دماغ لوگوں کی نہیں جو اپنے آباؤ اجداد کی چھوڑی ہوئی بے قیاس دولت اور جاگیروں کے سہارے ملک کی پارلیمنٹ میں دندناتے ہیں۔ آپ ذرا غور تو فرمائیں کہ ہمارا معاشرہ جو اس وقت تک افراتفری اور بے اطمینانی کا شکار ہو رہا ہے۔ وہ آخر کیوں ؟ اور وہ میرا منہ تکنے لگا۔ کہ شاید میں اس کا کوئی یقینی جواب دے سکوں۔

وہ ایک لمحات کے توقف کے بعد جیسے وہ میری کوتاہ عقلی کو سمجھ گیا تھا وہ کہنے لگا "یہ سب انہی جاہل اور بر خود غلط سیاست دانوں کی عقل کے کرشمے ہیں"

وقفہ ختم ہو گیا اور تاریکی پھر سے چھا گئی۔ میں اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ لیکن مجھے باقی نصف پکچر میں کچھ بھی لطف نہ آیا۔ میں سخت قسم کے احساس پستی میں مبتلا برابر یہی سوچتا رہا کہ میری اپنی زندگی کا مقصد کسی خلا کو پر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ شاید میری تخلیق کا منشا ہی یہ ہو کہ میں ایک دفتر کی مشین کا ایک پرزہ بنوں صبح سے شام تک کاغذوں کا کیڑا بنا رہوں اور رات کو ایسا تھک کر سو جایا کروں کہ نہ دنیا کا ہوش رہے اور نہ ما فیہا کا پھر یہ دماغ میں آیا کہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے یہ شخص۔ در اصل ہماری زندگی کی ابتری اور جمود ہی رہنماؤں کی بے تدبیری کا نتیجہ ہے۔ یونہی سوچتے سوچتے میں گھر چلا آیا

اس واقعے کو تھوڑی ہی مدت نہ گزری تھی کہ والدین کو گھر میں بہو دیکھنے کا شوق

چھایا۔ میں نے ہزار عذر پیش کئے۔ سمجھایا۔ کہ اتنے بڑے کنبے کی گزر بسر کا جس شخص کے کاندھے پر بوجھ ہو۔ اسے شادی رچانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لاکھ حیلے حوالے کئے۔ لیکن نقارخانے میں طوطی کی صدا کون سنتا تھا۔ کچھ پیش نہ چلی اور ایک دن شادی ہو ہی گئی۔ چند ماہ تو یوں گزرے کہ بس خدا کی پناہ۔ نہ دن کی خبر تھی اور نہ رات کی۔ دفتر میں بیٹھے اونگھا کرتے۔ اور راتوں کو رت جگا ہوتا۔ ایک عورت ہماری ملکیت تھی۔ عورت جس کی اپنی کوئی مرضی ہی نہ تھی۔ جو ہم نے چاہا سو کیا۔ اس کا جسم اس کی روح سبھی کچھ ہمارا تھا نہ آخر کو۔ اور جب ہم اپنی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے تو اس کی کہاں سے کرتے۔ نتیجہ وہی نکلا جو ایسی حالتوں میں نکلتا ہے۔ ہمارے دال روٹیوں کے پلے ہوئے جسم جواب دینے لگے۔ ہمارے قویٰ شل ہو گئے۔ اور ذہن ناکارہ۔ تھوڑی بہت تازگی اور شادابی جو افکار میں تھی وہ بھی ہوا ہو گئی۔ نسیان کا عارضہ ہو گیا اور جوانی ہی میں کہنا شروع کر دیا ع

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ

جس طرح کوئی ٹٹ پونجیہ اپنے مختصر سے سرمایہ کو تھوڑی مدت میں لٹا کر بیٹھ جاتا ہے یونہی ہم بھی تھک ہار کر رہ گئے۔ پہلے تو اپنا ہی رونا تھا۔ اب اس غریب کی فکر بھی سر پر سوار رہنے لگی۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ان کی آئے دن نت نئی خرابیاں ہو گئیں۔ ڈاکٹر دوا ئیں وہ تجویز کرتے۔ جن کی چند شیشیاں کل تنخواہ کو چیلنج کرتی تھیں۔ ڈاکٹرنیاں گھر آتیں تو گندے گرد و پیش کو دیکھ کر ناک بھوں سکیڑتیں اور ہزار احسان جتا کر اپنی فیس لے کر چل دیتیں گھر والے سب اس غریب کا حال دیکھ کر خوش تھے۔ کسی کو پوتے کا آسرا تھا تو کسی کو نواسے کا کوئی بھتیجے کے انتظار میں دم دے رہا تھا اور کوئی بھانجے کی آمد آمد کی خوشیوں میں مگن اور میں ہمہ تن اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا کہ آخر یوں کس طرح اور کب تک گزر ہو گی لیکن چارۂ کار بھی نظر نہ آتا تھا۔ عمر کا توسن تیز گام اڑا چلا جا رہا تھا۔ اور ہم بے چارگی کے عالم میں سوار تو ضرور تھے۔ لیکن بقول شاعر ع

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

دوسروں کو دیکھ دیکھ کر حسد کرے۔ دولتمندوں کے عیش و عشرت کے لوازمات کو دیکھ

کر اپنی بے مائیگی پر غصہ آتا۔ پہلے تو اپنی قسمت کے پھر جانے کی امید تھی۔ سوچتے تھے کہ خدا کبھی تو ہمیں بھی چھپر پھاڑ کر دے ہی دے گا۔ اور اسی آس میں اپنے کام کی دھن میں لگے رہتے تھے۔ لیکن حالات بد سے بدتر ہی ہوتے گئے اور ہمارے ساتھ دنیا کی رفتار بھی بگڑتی رہی۔ خوشحال اور بھی خوشحال ہوتے گئے۔ اور بد حال تحت الثریٰ میں گرتے رہے اور دماغ تھا کہ یہ سب کچھ دیکھ کر ماؤف ہوا جاتا تھا جب کبھی مایوسی کے ایسے عالم میں اس ذہنِ رسا کی یاد آ جاتی۔ جس کی عقابی نظروں کے رُو برو اس کائنات کی تمام پیچیدگیاں کوئی حقیقت ہی نہ رکھتی تھیں۔ جس کی بلند نظر زندگی کی ان بلندیوں کو چھوتی تھی۔ جہاں عام انسانوں کی نگاہوں کو باریابی میسر نہیں آتی۔ جس ذہن میں روس کے تعمیری منصوبوں کی طرح اسکیمیں ہی اسکیمیں موجود تھیں تو دل بوجھل ہو جاتا۔ طبیعت بے چین ہو جاتی۔ اور کچھ یقین سا ہو جاتا کہ ہماری تو یونہی گزرنی تھی اور یونہی گزر جائے گی۔ یہ دَور یا تو دولت والوں کا ہے یا پھر دماغ والوں کا۔ کبھی خیال آتا کہ اب تو وہ شخص اتنا با اثر ہو گیا ہوگا۔ کہ اس علاقے کے بڑے بڑے لوگ۔ جاگیردار اور سرمایہ دار بھی اس کے نام کی ہیبت سے لرزتے ہوں گے۔ اور میں سوچتا کہ وہ ضرور آنے والے انتخابات میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہ بات میرے نزدیک ایک حقیقت کا درجہ رکھتی تھی کہ ملک کو درحقیقت ایسے ہی صاحبِ تدبیر، ذہین اور اولی العزم انسانوں کی ضرورت ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جو ملک اور ملک کے عوام کی تقدیر بدل سکتے ہیں ؂

ایک دن کی بات ہے کہ میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ دفتر کا ماحول، کلرکوں کی سرگوشیوں، کاغذوں کی سرسراہٹوں۔ فائلوں کے انبار اور گنجی چاندوالے افسروں کی تحکمانہ آوازوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں اب اس جانسوز ماحول کا عادی ہو چکا تھا۔ میری برسوں کی محنت اور صبر نے اتنی سرافرازی تو ضرور بخشی تھی۔ کہ میں اب جونیئر کلرک سے سینئر کلرک بن چکا تھا۔ میری تنخواہ میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ اور میں ان تازہ وارد اور نوآموز کلرکوں پر رعب جمانے لگا تھا۔ جو کسی نہ

کسی عنوان میری نگرانی میں آجاتے تھے۔ میرا آج کا کام امیدواروں کی درخواستوں کی جانچ پڑتال تھی۔ اور میں ان درخواستوں کا پلندہ دبائے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا رہا تھا کہ میری نگاہ اچانک اک شخص پر مرکوز ہوگئی۔ وہی سر کے مدتوں کے ناتراشیدہ بال۔ وہی سنہری کمانی کا چشمہ اور اسی مخصوص تراش خراش کا لباس۔

"اب یہ یقیناً ہمارے ملک کی مقتدر ہستیوں میں شمار ہوتے ہوں گے۔" میں نے سوچا اور ساتھ ہی اس خیال سے کہ ذرا دوسرے کلرکوں پر اس سے اپنی واقفیت کا اظہار کر کے رعب تو جماؤں۔ میں عین اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"مجھے دیکھتے ہی ایک تاریک سا سایہ اس کے چہرے پر دوڑ گیا جیسے وہ میرے اس طرح اچانک سامنے آجانے سے کبیدہ خاطر ہوگیا ہو۔

"کہئے کیسے مزاج ہیں آپکے؟ آپ کے دیہات کا اور آپ کی اس تعلیم بالغاں والی اسکیم کا کیا نتیجہ نکلا؟ فرمایئے۔ ارادہ ہے آئندہ انتخابات میں کھڑے ہونے کا؟"

ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہوا۔ اس کی نظریں اک برابر ہی بیٹھے ہوئے کلرک پر جم گئیں۔ جو بُری طرح اپنے کام میں منہمک نظر آتا تھا۔ پھر وہ ایک لمبا سانس کھینچکر بولا۔

"چھوڑیئے ان سب فضول باتوں کو۔ میں تو آپ کے دفتر میں انٹرویو کے لئے آیا ہوں۔ مجھے نسیم نے بتایا تھا کہ اس ضمن میں آپ سے ضرور ملوں۔ دیکھئے ذرا خیال کیجئے گا۔ آپ کے پاس جو یہ درخواستیں ہیں۔ اس نے میرے درخواستوں کے فائل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس میں میری درخواست بھی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے بڑی مستعدی سے میرے ہاتھ سے فائل لے کر اس میں سے اپنی درخواست نکال کر مجھے دکھا دی۔ پھر میری حیرت زدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"ہم لوگوں کی قسمت میں تو یہی کلرکی لکھی ہے۔ وہ سب باتیں تو زرداروں

کو زیب دیتی ہیں۔ ہم تو بے زر ہیں! بے زر!!"

بے زر کے الفاظ پر اس نے بہت زور دیا۔ پھر دبی زبان میں مجھ سے کہنے لگا۔

"دیکھئے! ذرا میرا خیال رکھئے گا!"

یہ کہہ کر اس کی نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت دکھ ہوا۔ کہ اس دن اس کی نگاہوں میں نہ وہ عجیب سی احساس کامرانی کی چمک تھی اور نہ اس کے ہونٹوں پر وہ فتحمندانہ مسکراہٹ۔

لخت لخت

(افسانچے)

بشیر قریشی

مختصر مختصر افسانے

پردہ

بدھ کا دن تھا اور تفریح گاہوں کے جملہ حقوق خواتین کے لئے محفوظ تھے۔ اس نے برقعہ جسم پر ڈالا اور نقاب اٹھا کر لیڈیز شو دیکھنے کے لئے سہیلیوں کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔ سامنے ایک خوش پوش سائیکل سوار نوجوان نظر آیا جسے دیکھتے ہی محترمہ نے نقاب لے لیا اور سہیلیاں مسکرانے لگیں۔ نوجوان سمجھا قسمت جاگ اٹھی ہے۔ وہ قریب آ گیا ایک کہہ رہی تھی "یہ صاحب رجّی آپا کے شوہر ہیں ——" نوجوان نے غور سے دیکھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ برقعہ میں اس نے اپنی بیوی کو پہچان لیا تھا۔

بیگم کے بھائی

تاجر بوڑھا تھا، مگر بیوی نوجوان اور ماڈرن، تنوع اور رنگا رنگی کی دلدادہ، تاجر خوش تھا کہ ماڈرن بیوی کی وجہ سے اس کا رتبہ معاشرے میں بلند ہو جائے گا۔ وہ پہلی بار اکٹھے پکچر دیکھنے کے لئے نکلے۔ بڑے میاں نے بیگم کا ہاتھ یوں تھاما جیسے اپاہج چھڑی سنبھالتا ہے۔ سینما ہال پہنچ کر تانگہ بان نے سلام مارا۔ مگر پیسے لینے سے

انکار کر دیا "یہ میرا اسکول کے زمانے کا بھائی ہے" بیگم نے کہا ـــــ سینما کے برآمدے میں داخل ہوئے تو ایک خوش پوش نے پہلے سے خریدے ہوئے ٹکٹ پیش کئے۔ یہ ان کے کالج کے زمانہ کے بھائی تھے۔ گیلری میں ایک، اور صاحب سے تعارف ہوا "یہ میرے بھائی ہیں مجھے میوزک سکھاتے تھے" بیگم نے بتایا ـــــ وقفے میں چائے خود بخود آ گئی۔ بیگم نے بتایا "سینما کے مینجر نے بھیجی ہے جو دور سے رشتے میں میرا بھائی لگتا ہے" ـــــ شو ختم ہوا، وہ باہر نکلے تو ایک نوجوان نے بڑی بے تکلفی سے کہا "باجی آئیے کار حاضر ہے"! بیگم نے تعارف کرایا "یہ میرے بھائی ہیں، ہماری برادری ایک ہے۔ بہت بڑے کارخانہ دار ہیں" ـــــ کار انہیں گھر تک چھوڑنے آئی ـــــ تاجر حیران تھا کہ اس کے برادرانِ نسبتی کی فہرست کتنی طویل ہے!

سبدِ گُل

(نظم و غزل)

آذر ملتانی
اعظم انصاری
اقبال ارشد
اقبال ساغر صدیقی
اقبال گیلانی
انوار انجم
انور ادیب
ایاز صدیقی
جلال مرزا خانی
حبیب انصاری
حزیں صدیقی
حفیظ رومانی
رفیق خاور جسکانی
ساحر رومانی
شبیر احمد خاموش
صادق قمر
ضیا صدیقی
طاہر کپور تھلوی
عابد صدیق
کاظم زیدی
قیصر ہوشیار پوری
مذاق العیشی
مقبول قریشی
نسیم ملک

آذر ملتانی

غزل

بیانِ دردِ دل دشوار ہو جائے تو کیا کہئے
خموشی خود لبِ گفتار ہو جائے تو کیا کہئے

جگر شق ۔ سینہ سوزاں ۔ دل پریشاں ۔ خاطر افسردہ
اگر یوں گھر کا گھر بیمار ہو جائے تو کیا کہئے

کنارِ جُو ہو ۔ گل ہوں ۔ سبزہ ہو ۔ بادِ بہاری ہو
پھر افسردہ دلِ بیمار ہو جائے تو کیا کہئے

خطا میری سہی ۔ گر اُس نگہ کو تیر کہتا ہوں
تمہیں کہہ دو ۔ یہ دل کے پار ہو جائے تو کیا کہئے

مرا مشفق ۔ مرا مُونس ۔ مرا غمخوار ہے ناصح
مگر ظالم گلے کا ہار ہو جائے تو کیا کہئے

غنیمت جانئے آذرؔ کہ جینا ہو گیا مشکل
جو مرنا بھی تمہیں دشوار ہو جائے تو کیا کہئے

آزرؔ ملتانی

○

ہو جنوں کی خیر ویرانے بہت
غم سلامت ہے تو غمخانے بہت

کر سکا کوئی نہ وحشت کا علاج
ہم کو آئے لوگ سمجھانے بہت

پھر دلِ ایذا طلب بے چین ہے
پھر لگے احباب یاد آنے بہت

بخت تاباں ہے تو لاکھوں جاں نثار
شمع روشن ہے تو پروانے بہت

انتخابِ برق کا ممنون ہوں
ورنہ تھے گلشن میں کاشانے بہت

کس سے کہئے کس کا شکوہ کیجئے
دشمنوں میں دوست پہچانے بہت

ارضِ کعبہ ہو کہ پاکستان ہو
جب تلک آزرؔ ہیں بت خانے بہت

قطعات

کوئی میخوار ہے نہ ساقی ہے
شیشہ باقی نہ جام باقی ہے
میکدوں میں بھی مسجدوں کی طرح
اب تو اللہ کا نام باقی ہے

خاک سے کیمیا بناتے ہیں
کچھ سے کچھ کیا سے کیا بناتے ہیں
بُت گری کوئی فن نہیں آذرؔ
اہلِ فن تو خدا بناتے ہیں

تلخیاں حاصلِ حیات سہی
جس طرح بن پڑے گا جی لیں گے
کہتے ہیں مے بھی تلخ ہوتی ہے
غم سے فرصت ملی تو پی لیں گے

مجھے رونا تھا میں ہر طور روتا
نہ ہوتا یہ سبب کچھ اور ہوتا
چلو اچھا نہ کرتا اشک باری
تو پھر میں کونسے موتی پروتا

دشتِ غربت ہے اور تنہائی
ہم زباں ہم سخن نہیں ملتا
دولتِ غم اٹھائے پھرتا ہوں
کوئی بھی راہزن نہیں ملتا

(نظم)

تنہا

اسلم انصاری

نہ کوئی شاخِ کرم ہے نہ کوئی گُل مائل
لہو لہو ہے بساطِ چمن، وفا کی کلی
کس طرح نہ کھِلی!
کہیں نہیں ہے کسی مہرباں نظر کی کرن
نہ کوئی برگِ تبسّم نہ لالہ زارِ سخن
یہ خارِ غم کی چبھن
جو ٹھیرتی نہیں پل بھر، لہو رُلاتی ہے
عجیب عالمِ افراطِ بے ثباتی ہے
وہ اک نظر جو کبھی مہرباں تھی دل پر
بکھیرتی تھی جو ہر سُو بہار کے منظر
وہ اک نظر، وہ جہانِ جمال و عالمِ گل
وہ لب سکوت میں گویا سکوتِ پیہم گل
وہ ایک چاپ جو پہروں دھڑکتی تھی دل میں
وہ ہر قدم پہ کسی زندہ خواب کا منظر،

وہ بات بات ابھرتے ہوئے گلِ نغمہ،
وہ انگ انگ چھلکتی شراب کا منظر
وہ بامِ دل پہ کسی آفتاب کا منظر

وہ صبحِ ساعتِ قربت وہ شامِ بیمِ فراق
وہ نرم سانس کی خوشبو وہ پیرہن کی مہک
وہ اس سکوت کی خوشبو وہ اس سخن کی چہک
مگر نہ اب وہ سخن ہے نہ وہ سکوت، نہ کچھ —!

نہ کوئی موجِ تبسّم نہ کوئی قوسِ خیال،
بکھر گیا ہے کہاں جانے زندگی کا جمال،
ہر ایک رات ہے زخمی ہر ایک دن گھائل
نہ کوئی شاخ کرم ہے نہ کوئی گُل مائل!
نہ جانے گم ہے کہاں میری سوچ کا ساحل
سفینۂ غمِ دل جانے کس طرف بہ جائے
نہ جانے کیا نہ رہے اور جانے کیا رہ جائے!

اسلم انصاری

غزل

جب ہمیں اذنِ تماشا ہوگا
تو کہاں انجمن آرا ہوگا

وادیٔ رنگ میں ہر نقشِ بہار
شاخ در شاخ لرزتا ہوگا!

ساغرِ دل میں ترا عکسِ جمال
محوِ ایجادِ تمنّا ہوگا

اڑتی ہوگی کہیں خوشبوئے خیال
گُلِ معنی کہیں کھِلتا ہوگا

ہم نہ پہنچے سرِ منزل تو کیا
ہم سفر کوئی تو پہنچا ہوگا!

کون بیٹھا ہے سرِ منظرِ دل
کس نے یہ روپ نکھارا ہوگا

محملِ گُل میں بہ رنگِ خوشبو
کس نے یہ راز چھپایا ہوگا

ہر گُل و برگ ہے اک نقشِ قدم
کون اس راہ سے گزرا ہوگا

لبِ تصویر یہ گویا ہے سخن
کوئی سن لے تو تماشا ہوگا

منتظر کیوں ہے وگرنہ ہر راہ
جانے والا کبھی آتا ہوگا!

ٹیس اٹھی نہیں وہ پہلو میں
دل تجھے بھول کے دھڑکا ہوگا

اب بھی گُل پوش دریچے کے قریب
تو کسی سوچ میں ڈوبا ہوگا!

دل یہ کہتا ہے اسی سے ملئے
میں یہ کہتا ہوں کہ پھر کیا ہوگا

دشتِ فرقت میں کھڑا سوچتا ہوں
تو کہاں انجمن آرا ہوگا!

٭

اقبال ارشد

غزل

فراق یار کا امکان دکھائی دیتا ہے
شباب ہر غم دوراں دکھائی دیتا ہے

میں کیا بتاؤں پریشانیاں اسے اپنی
مجھے وہ خود ہی پریشاں دکھائی دیتا ہے

خیال و خواب ہیں آپس میں برسرپیکار
یہ ذہن جنگ کا میداں دکھائی دیتا ہے

رواں ہیں جس کے رگ و پے میں شہد کی نہریں
وہ جسم جنت رضواں دکھائی دیتا ہے

یہ جشن موسم گل ہے کہ تشنہ کاموں پر
کھلا ہوا در زنداں دکھائی دیتا ہے

تمام رات کٹے تیرگی میں تب جا کر
نشان صبح درخشاں دکھائی دیتا ہے

جہانِ رنگِ تصرف میں جس کے تھا ارشد
وہ شہر شہر خموشاں دکھائی دیتا ہے

اقبال ساغر صدیقی

عوام

مجاہدین امن ہیں جہاں پہ چھا رہے ہیں ہم
نفس نفس نوید زندگی سنا رہے ہیں ہم
بہارِ خلد عرش سے زمیں پہ لا رہے ہیں ہم
روش روش پہ مسکراہٹیں بچھا رہے ہیں ہم
پکارتی ہیں منزلیں قدم بڑھا رہے ہیں ہم
جہاں پہ چھا رہے ہیں ہم

(۲)

ہمارے دم سے زندگی حسین سے حسین تر
شب سیاہ کی ظلمتیں بھی رشک جلوۂ سحر،
خوشی ہماری سرخوشی ہمارا غم بھی معتبر
جدھر سے ہم گزر گئے مہک اٹھے ہیں رہ گزر
چمن چمن بہار در بہار لا رہے ہیں ہم
جہاں پہ چھا رہے ہیں ہم

(۳)

ہماری جانفشانیوں سے آج کھیتیاں جوان!
ملوں کی عظمتیں ہماری محنتوں کی راز داں
ہماری ٹھوکروں میں ہے وقار تاج خسرواں
ہماری بے پناہ قوتوں کی انتہا کہاں؟
کہ بے پناہ قوتوں کے ساتھ چھا رہے ہیں ہم

جہاں پہ چھا رہے ہیں ہم

(۴)

ہمارا قافلہ رواں ہے آج ہر دیار میں
ہمارے عزم سے تڑپ ہے قلب کوہسار میں
ہماری فکرِ آتشیں کی دھوم روزگار میں
ہمارے گیت شعلہ بار قصر شہریار میں
ہزار لعنت نظامِ زر مٹا رہے ہیں ہم
جہاں پہ چھا رہے ہیں ہم

(۵)

ہر ایک سمت سے عوام بڑھ رہے ہیں تیز گام
ایک سب کی منزلیں سفید کیا سیاہ فام
سسک سسک کے مر رہا ہے سامراج کا نظام
بدل رہی ہے زندگی بدل رہے ہیں صبح و شام
نویدِ انقلاب تازہ تر سنا رہے ہیں ہم
جہاں پہ چھا رہے ہیں ہم

غزل

یہاں اُلفت سے بیگانے بہُت ہیں
بھری بستی میں ویرانے بہُت ہیں
شکستِ تیرگیٔ غم کے قصے
حقیقت کم ہے افسانے بہُت ہیں
جو کل تک دشمنِ جاں تھے ہمارے
وہی اب جانے پہچانے بہُت ہیں
شریکِ بزمِ تنہائی ہیں لیکن
سرِ محفل وہ انجانے بہت ہیں
نہیں وہ عشق کی قدریں وگرنہ
ابھی مجنوں سے فرزانے بہت ہیں
ترا لے دے کے زاہد ایک کعبہ
ہمارے تو صنم خانے بہُت ہیں
بجا تو ہے غرورِ حسن ساغرؔ
اکیلی شمع پروانے بہُت ہیں

o

سید اقبال گیلانی

غزل

گو تصور میں ہے، خیالی ہے
ہم نے دنیا نئی بسالی ہے

دشمنی کا بھرم خدا رکھے
دوستی ہم نے آزمالی ہے

کچھ ادائی سی کچھ ادائی ہے
آپ نے آنکھ بھی چرالی ہے

تیری دنیا میں بھی سکوں نہ ملا
تیری دنیا بھی دیکھ ڈالی ہے

ہم نے اقبالؔ نقد جان دیکر
عشق کی آبرو بچالی ہے

سید اقبال گیلانی

غزل

کون سمجھائے بھلا ایسے میں دیوانوں کو
چاک ہونے کا جنوں جب ہو گریبانوں کو

موت کی وادی میں خود مشعلیں بن کر اترے
جانے کیا چیز نظر آئی ہے پروانوں کو

جانے کیا لوگ تھے وہ کیسا جنوں تھا ان کا
جن کے قدموں نے ضیا بخشی ہے ویرانوں کو

میرے ساقی کے قدم پڑتے ہی میخانے میں
رنگ مینا کا اڑا چھپ لگی پیمانوں کو

اب کچھ اس طور زمانے نے چلن بدلا ہے
کہ خدا ڈھونڈتا پھرتا ہے خود انسانوں کو

ہم نے اقبال خود اپنے ہی لہو سے بخشیں
رونقیں دار کو اور سرخیاں افسانوں کو

انوار انجم

غزل

محوِ نالہ تو رکھا دل کی لگی نے شب بھر
لیکن آنسو بھی جو پونچھے تو اسی نے شب بھر

یہ مرے دل کی چمک ہے کہ تری آنکھ کا نور
ذہن میں ناچتے رہتے ہیں نگینے شب بھر

اس کے بامِ فلک آثار کی تصویر میں گم
میری تخئیل بناتی رہی زینے شب بھر

دل کے مواج سمندر میں تمناؤں کی شکل
ڈوبتے تیرتے رہتے ہیں سفینے شب بھر

اجنبی جان کے ڈرتے رہے سب دروازے
میری آواز نہ پہچانی کسی نے شب بھر

آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اب دن میں جسے
کتنا بے تاب رکھا مجکو اسی نے شب بھر

روحیں دمساز ہیں تو جسم بھی ہم راز بنیں
یوں تو تڑپیں گے یہ جلتے ہوئے سینے شب بھر

شعر ہی کہئے کہ شاید ملے تسکین انجم
یوں تو یہ چاندنی دے گی نہیں جینے شب بھر

فاصلہ

وہ بدگماں بھی نہیں، مجھ پہ مہرباں بھی نہیں
ستم شعار ہے لیکن ستم سے بیگانہ
رفیقِ راہ بھی ہے اور اجنبی بھی ہے۔

کبھی کیا نہیں اظہارِ دوستی اس نے
مگر میں دور رہوں یہ بھی ناگوار اسے
رسومِ طرزِ تغافل سے بے خبر ہے، مگر
نگاہِ لطف و عنایت سے بھی ہے عار اسے

عجیب موڑ پہ ٹھہرا ہے کاروانِ وفا
نہ اعتبارِ کرم ہے نہ اعتبارِ جفا

○

انور ادیب

ٹریفک کا اشارہ

نظر جھکا لو
کہ آنکھ سے ہو کے جانے والی تمام سڑکیں
برائے تعمیر بند ہیں
اور پنڈلیوں سے پھسل کے گرنے
دوبارہ چڑھنے میں وہ مزا ہے
جو چوٹیوں کی مہیب تسخیر میں نہیں ہے !
بریک چھوڑ دو
اگر بریکیں دبائے رکھیں
تو سارا ڈیزل
سیاہ کچے دھوئیں میں تحلیل ہو کے
بچّوں کے کوٹ اور پھیپھڑوں کو پنکچر کرے گا
خوشبو کی موت ہو گی !
آہستہ بولو
سرہانے پستول،
نیند آور دوا کی شیشی، نظر کا چشمہ
چلے ہوئے کارتوس کا خالی خول
بستر میں سو رہا ہے !

انور ادیب

زمین بنجر ہے

بہار آئی
تو پتھروں کی حسین وادی نے
خوبصورت گلوں کے تحفے اسے روانہ کئے
امانت ـــ اور ایک بٹوہ
کہ لوٹ کر جب بہار آئے
تو اس کو پہچان کر پکارے!
وہ آنے والے دِنوں کے ساحل پہ
سبز سگنل کی آنکھ کے دائرے میں
جلتی اداس نظروں سے
دوریوں کے مسافروں کو پکارتا تھا

دوریوں سے جہاز اُبھرے
جو ٹریکٹروں اور ٹائروں کی وہ کھیپ لائے
ابھی تمہاری زمین بنجر ہے!
ابھی تمہاری زمین بنجر ہے
کاغذوں کے گلاب پانی میں پھینک کر
اپنے گھر سدھارو ـــ!
وہ زرد ٹھنڈک میں بیٹھ کر
اپنی جیبھ زخموں پہ پھیرتا ہے
کہ اُس کے کالر سے
زرد نرگس کا پھول مرجھا کے گر پڑا ہے!

ایاز صدیقی

○

قیمت شناسِ دل سرِ بازار کون ہے
اس جنسِ بے بہا کا خریدار کون ہے

ہم نے روش روش پہ بکھیرا ہے خونِ دل
ہم سے سوا بہار کا حق دار کون ہے

ہم جانتے ہیں دوستو! آدابِ انجمن
ہم سے زیادہ نقش بہ دیوار کون ہے

ہم کو چمن کی فکر تمہیں فکرِ آشیاں
تم ہی کہو کہ بندۂ ایثار کون ہے

اے صبح تابدار تری روشنی بہ خیر
ہم کشتگانِ شب کا عزادار کون ہے

اک عمر سے رواں ہے امیدوں کا قافلہ
کھلتا نہیں کہ قافلہ سالار کون ہے

ہر آدمی سوال بہ لب ہے یہاں ایازؔ
اس انجمن میں صاحبِ پندار کون ہے

○

ابھریں گے حق پرست سردار اور بھی
لائے گی رنگ شوخیٔ گفتار اور بھی

پھیلے گی جس قدر مہِ کنعاں کی روشنی
تاریک ہوں گے مصر کے بازار اور بھی

جب سے عطا ہوئی ہمیں آزادیٔ سخن
پابند ہو گیا لب گفتار اور بھی

کوندا ہی چاہتی ہیں تبسم کی بجلیاں
اے ضبط ایک لغزشِ اظہار اور بھی

پہلے ہی کم نہ تھیں لب شیریں کی جنبشیں
رس گھولتی ہے تلخیٔ گفتار اور بھی

کیسے بتاؤں دل کو سبک دوشِ آرزو
ہو جائے گی حیات گراں بار اور بھی

اُس حیلہ جُو کی بات ہی کچھ اور ہے ایازؔ
یوں تو جہاں میں ہیں مرے غم خوار اور بھی

○

جلال میوز افغانی

غزل

بستے دل کے رنگ محل میں کیا سناٹے بیت گئے
ہمنے اپنی ہار سمجھ لی چھوڑو تم ہی جیت گئے

پیت کی پیت گئی ہاتھوں سے سہتے سہتے میت گئے
بھولے دل نے رنگ نہ بدلا۔ لوگ ہی بازی جیت گئے

جیتنے والے دل سے ہارے، ہارنے والے جیت گئے
ہم سے تو سب بیت چکی ہے ہم تو اسمیں بیت گئے

کڑوے تیور آخر دم تک دلکو گھائل رکھتے ہیں
بُرے بھلے وقتوں کا کیا ہے آئے جھیلے بیت گئے

سب سے سستا دل کا سودا سب سے مہنگا دل کا مال
سٹے کا بازار کھلا تھا ہم ہارے تم جیت گئے

لمحے صدیاں بن جاتے ہیں، پل میں سال گزرتے ہیں
کل کے بچھڑے آج ملے ہو جیسے برسوں بیت گئے

کالے کوسوں کون نہ ہارا، اوسوں کس کی پیاس بجھی
ہم تو تیری چال کے روندے اے دنیا کی ریت گئے

پیار کی عمر کٹی پل بھر میں وقت کو بدلہ لینا تھا
آخر اک پل وہ بھی آیا جس میں زمانے بیت گئے

ایک جھپک میں جل کر پہنچے امن وسکوں کی دنیا میں
شمعیں پگھل پگھل کر ہاریں اور پروانے جیت گئے

کل کی بات نظر آتی ہے پہلی رات بچھڑنے کی
اور اگر برسوں کو گننے آج زمانے بیت گئے

ایک بیاباں سوکھی منزل گھور گرج طوفاں کی جلال
چلدیں بھیگی بھیگی راتیں ساتھ رسیلے گیت گئے

قطعات

بھڑک اٹھا شررِ لالۂ قلبِ صحرا میں — کہ آس پاس کہیں کوئی راہ بھی تو نہیں
عجیب لوگ ہیں اہلِ جمال بھی لیکن — ہر ایک آنکھ امینِ نگاہ بھی تو نہیں

نگاہِ حسن لطافت پہ ہے خراش انگیز — کہیں نظر کی نزاکت کو خود پناہ نہیں
لطافتیں ہیں بہت ماورائے رنگ و نقوش — ہر ایک حسن بھی شائستۂ نگاہ نہیں

دوہے

بُرا سُنیں لپھا کریں، یہ کب کھائیں مات — گرہ سے دیں اور جھک چلیں بڑی بڑوں کی بات
اتنا اچھا من بسا جتنی جس کی اوٹ — جتنا پچھانو کرِ کرا جتنا پرکھو کھوٹ
پھوٹ نہ ڈالے پیار میں پیار نہ جھٹکے کھائے — ٹوٹا کہنے کو جُڑے گانٹھ گرہ رہ جائے
میٹھا بنکر برتئے بڑی پیار کی مار — میٹھا مارے بار بار بس مارے اک بار
ہاتھوں سے چھوڑے نہیں کہے ہاتھ کا میل — بھولا بھالا آدمی بھولے بھالے فیل

○

حبیب انصاری

غزل

بھیجا ہے تونے مژدہ غم مدتوں کے بعد
کتنا حسین کیا ہے کرم مدتوں کے بعد

دیکھے شہاب رنگ اجالے گلی گلی
گزرے جو تیرے شہر سے ہم مدتوں کے بعد

وہ نقرئی بدن وہ ہوائیں وہ چاندنی
ہیں چند حادثات بہم مدتوں کے بعد

اب دیدنی ہوا ہے ہر حرف داستان
رکھا ہے خونِ دل میں قلم مدتوں کے بعد

شاید کوئی خلوص کی صورت نکل ہی آئے
یک جا ہوئے ہیں اہلِ حرم مدتوں کے بعد

صد بار اس عنایتِ تحریر پر نثار
تونے کیا ہے خط جو رقم مدتوں کے بعد

ہم نے حبیب شعر کے سانچے میں ڈھال کر
لکھی ہے داستانِ الم مدتوں کے بعد

حزیں صدیقی

○

امتحانِ وفا، ہم کو معلوم ہے
آپ کا حوصلہ، ہم کو معلوم ہے

ہر کلی پھول بنتی نہیں باغ میں
رازِ نشو و نما، ہم کو معلوم ہے

بوئے گل کیوں نہ آوارہ ہو کو بکو
کاروبارِ صبا، ہم کو معلوم ہے

جانتے ہیں مقاماتِ عقل و جنوں
کون ہے رہنما، ہم کو معلوم ہے

اپنی تقدیر سے کون واقف نہیں!
کوششوں کا صلہ، ہم کو معلوم ہے

ہے خدا ہی جو کشتی کنارے لگے
نیتِ ناخدا، ہم کو معلوم ہے

"عشرتِ مدعا" ہو تو ہو تیرا غم
"حاصلِ مدعا"، ہم کو معلوم ہے

دھڑکنوں میں کہاں اس قدر نغمگی
تیری آوازِ پا، ہم کو معلوم ہے

نامرادی وفا کا مقدر نہیں
عشق کی اِنتہا، ہم کو معلوم ہے

عشق کو ضدِ حرفِ ہیں راس آتی نہیں
طور کا ماجرا، ہم کو معلوم ہے

○

حفیظ رومانی

○

کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے گلِ خنداں ہونا
پہلے تم سیکھ تو لو چاک گریباں ہونا

دوست کا دشمنِ آرام دل و جاں ہونا
گرمیٔ انجمنِ عشق کا ساماں ہونا!

تیرے ہوتے غمِ جاناں یہ قیامت کیا ہے
میری ہستی کا رہینِ غمِ دوراں ہونا

ہے ترا جورِ تغافل تو بہانہ اے دوست
اپنی قسمت ہی میں لکھا تھا پریشاں ہونا

ہم نے تو اپنی نظر سے بھی چھپایا غمِ دل
آپ نے سیکھ لیا کس سے پریشاں ہونا!

زندگی دردِ مسلسل سے عبارت ہے حفیظ
موت ہے درد کا شرمندۂ درماں ہونا

○

رفیع خاور جسکانی

شامِ شہرِ آرزو

(چوک نواں شہر ملتان کا منظرِ شام)

پھر سلگتی ہوئی راہوں پہ دھندلکے پھیلے
لیلیٔ شام بصد ناز اُٹھی بال فشاں
سو گئی ہانپتی سڑکوں کی مسلسل گنجار
دن کے بجھتے ہوئے لمحات سے اٹھتا ہے دھواں
بے کراں سائے بڑھے آتے ہیں خاموشی سے
سرمگیں شام کی ہر شے ہے نہ پنہاں نہ عیاں
گنگنا اُٹھے در و بام ، ہوئی نغمہ بہ لب
زیست کی جوئے صد آہنگ کی ہر موج رواں
شاہراہوں سے اٹھی سانجھ کی جھانجھن کی جھنک
کھو گیا شام کے نغموں بھرے افسوں میں جہاں
جگمگاتے ہوئے لوگوں کا طربناک خرام

مہ وشاں، لالہ رخاں، سیم براں، سرو قداں

حاصلِ شام ہو جب دولتِ پہلو کا گداز
پھر کہاں شام زمستاں پہ زمستان کا گماں

چہرۂ وقت پہ ایک شوخ تبسم کی دمک
شام کے دوش پہ اک شنگ سا آنچل رقصاں

زندگی آئینہ وش گھومتی ہے موج بہ موج
شام زینتھ کی ہے یا جوئے روانِ دوراں

جھجھماتی ہوئی کاروں کے جھپکتے جھونکے
تیز رو کاریں ہیں یا وقت کا رہوار رواں

موڑ پر رُکتے ہوئے اشہب وا ماندہ کی چال
تھک تھکا تھک ہے، قدموں کی تھکاوٹ پنہاں

جادۂ زیست پہ اک رہ رو خستہ کی طرح
ہم بھی پھرتے ہیں لئے اپنی گراں باریٔ جاں

زندگی اپنی سرِ راہ تمنا — تنہا
لان زینتھ کے ہوں یا سایۂ دیوار بتاں

ہمکو ہر موڑ پہ چلتے ہوئے مل جاتے ہیں
شبِ تنہائی میں یخ بستہ ہوا کے طوفان
اپنے آلام کو سینے سے لگائے ہوئے ہم
دیکھتے جاتے ہیں ہر رنگِ جہاں گذراں
سانجھ کے پاؤں میں جھن جھن کا وہ آہنگِ سبک
اپنے قدموں میں یہ حالات کی زنجیر گراں
راہ سے موجِ ہوا سن سے گذر جاتی ہے
دیر تک رہتے ہیں اشجار کے سائے رقصاں
دھول اٹھتی ہے سرِ راہ جو ہنڈوں کی طرف
یاد آجاتی ہے خاکسترِ پروانۂ جاں

غم کی پہنائی میں لمحوں کی تہیں ہیں، جیسے
لے کراں ریت پہ سوئی ہوئی لہروں کے نشاں
ایک جکڑے ہوئے وحشی کی طرح چیختی ہے
شب کے زنداں میں تڑپتی ہوئی تنہائی جاں
شبنم آلود ہوا جاتا ہے شب کا دامن .....
زخم لو دینے لگے، سینہ ہوا شعلہ بجاں

پھر سرِ شامِ زمستاں ہے کوئی شعلہ فگن
تابشِ یادِ نگاراں ہے کہ سینے کی جلن
اپنا سایہ بھی نہیں ساتھ وہ تنہائی ہے
جانے کس سمت لئے جاتی ہے یہ دل کی لگن !
جادۂ شب کے خم و پیچ کی تاریکی میں ،
کوئی ساتھی ہے تو بس اپنے ہی دل کی دھڑکن
چند سائے ہیں رواں لوگ نہیں ہیں جیسے
اجنبیت ہے کچھ ایسی کہ نہیں تابِ سخن

چل کہیں اور علاج غمِ تنہائی کریں
شام کے نغموں بھرے شہر میں کیوں ہے حیران
اب یہاں کون تیری سمت چلا آئے گا
کس کی رہ دیکھ رہا ہے دلِ بیتاب یہاں

رفیق خاور جسکانی

شامِ بیاباں میں ایک یاد

صفیرِ موجِ ہوا، یہ خلا کی سرگوشی   نفس کی لہر، صداؤں کی جوئبار میں گم
ہوا کی چاپ ہے، یا وقت کے جرس کی صدا   سکوتِ شامِ بیاباں کے اضطرار میں گم
فضا میں پھیلے ہوئے اک جہاں کے آوازے   نفس نفس ہے، خلاؤں کے نغمہ زار میں گم
اُداس شام گریباں کے چاک پھیلائے   ہزار سلعتِ غم جس کے تار تار میں گم
اُفق پہ پھیل چلا گردِ بادِ وقت کا رنگ   شفق کا خون ہے لمحوں کے آبشار میں گم
گذرتی صدیوں کے سائے سوادِ صحرا پر   صدائے ابلقِ ایّام ریگ زار میں گم
یہ صبح و شامِ تمنا کی رہ گذارِ بعید   رہی ہے قافلۂ وقت کے غبار میں گم

غموں سے دور، زمانے کے خلفشار سے دور
میں گھومتا ہوں یہاں لذتِ فرار میں گم

خیالِ سرخوشیٔ صبح و شام میں غافل   سرورِ روز و شبِ موسمِ بہار میں گم
تم آ رہی ہو میری صبحِ آرزو بن کر   یہ دِل ہے اِک نئے فردا کے انتظار میں گم
فریبِ عمرِ گریزاں کا بھی خیال نہیں   ہوں اس قدر ترے وعدے کے اعتبار میں گم

رہِ حیات کی واماندگی کا درماں ہے
تمہاری مرمریں باہوں کے لالہ زار میں گم

سحر رومانؔ

خواہش

ایک دفعہ
ایک شہنشہ ملکہ کے ہمراہ
دامنِ "تاج محل" میں ہوا جلوہ افروز
چاندنی رات میں جمنا کے کنارے پر سے
"تاج" کا عکسِ جمیل !
یوں نظر آتا تھا
جیسے ابھی جل پریوں نے
اک نیا "تاج محل" مل کے کیا ہو تعمیر !
ملکہ اور شہنشہ خموش و ساکت،
محوِ نظارہ کھڑے سوچ رہے تھے گم سم،
دفعتہً ملکہ شہنشہ سے ہوئی یوں گویا
آپ اگر وعدہ کریں مجھ سے
کہ میری خاطر
بعد مرنے کے مری قبر پہ
ایسا نہ سہی،
اس سے سو درجہ ہی کم ایک حسین و دلکش
مرمریں مقبرہ تعمیر کرائیں گے تو میں
بخوشی آج ہی تیار ہوں مرنے کے لئے" !

سحر رومانی

غزل

خموشیوں کا دھواں شعلۂ نوا کے ساتھ
صدا کا سوگ بھی جاری ہے ہر صدا کے ساتھ

گلوں کے ساتھ شعاعیں ہیں برسرِ پیکار
جفا کا شہر بھی ہے قریۂ وفا کے ساتھ

کہیں صبا، کہیں صرصر، کہیں ہے بادِ خزاں
ہوا بھی رنگ بدلتی ہے ہر ادا کے ساتھ

کسے پسند کریں رنگ و بو کے متوالے!
صلیبِ زلف ہے باغیچۂ صبا کے ساتھ

خود اپنی خاک اڑانے نگاہوں میں جب سے
چلا ہوں چار قدم دشت کی ہوا کے ساتھ

شیر احمد خاموشی

تیرے لئے کیا کیا نہ ہوئے جلوے فراہم
اے دل تری افسردہ نگاہی نہ ہوئی کم

کیا پوچھتے ہو کون رفیقانِ سفر ہیں
یک خاطرِ افسردہ و یک دیدۂ پُرنم

سب چھوڑ گئے راہِ وفا میں ہمیں تنہا
اک یاد تری رہ گئی اور ایک ترا غم

دنیا نے وفاؤں کا صلہ کس کو دیا ہے
بے کار جفاؤں سے ہوئے شکوہ کناں ہم

نادان تجھے میخانہ سمجھ کر چلے آئے
غم خانۂ ہستی کا ہر اک گھونٹ خمِ سم

○

متاعِ درد، مری زندگی کا سرمایہ
ترے خیال میں گم ہو کے، بس یہی پایا

دیا ہے جب بھی، کبھی کوئی دکھ زمانے نے
ترے خیال کی زلفوں سے دل کو بہلایا

اگر کہیں بھی کوئی گوشۂ فراغت ہے
تو وہ مقام ہے، تیرے خیال کا سایہ

ترے خیال کی مے نے وہ بے خودی بخشی
کہ جس کے سامنے ہر میکدہ بھی شرمایا

کوئی شریکِ غمِ دل ہمیں کہیں نہ ملا
کسی کے دکھ میں کوئی بھی کبھی نہ کام آیا

ترے خیال کے گوشہ میں وہ سرور ملا
ہزار جلووں کی رعنائیوں کو ٹھکرایا

صادقؔ قمر

غزل

کبھی عزیز تھے ہم جن کو زندگی کی طرح
ابھی قریب سے گزرے ہیں اجنبی کی طرح

خدا کرے تو غمِ زیست سے رہے محفوظ!
کہ تو ہے گلشنِ ہستی میں اک کلی کی طرح

ہمیں ہی ضبط کی تلقین کیوں ہو محفل میں
ہمیں بھی اذنِ تکلم ملے سبھی کی طرح

ہمارے دل میں ضیا ریز ہے کسی کی یاد!
کنول کے سپول میں خوابیدہ چاندنی کی طرح

ہمیں ملا ہے قمرؔ غم بدل بدل کر بھیس
کبھی بصورتِ گریہ، کبھی ہنسی کی طرح

○

ضیا صدیقی

○

ضیا ہے اک بے نوائے الفت نہ پوچھیے اس کے بس میں کیا ہے
جہانِ غم کی حدوں سے باہر غریب کی دسترس میں کیا ہے

چمن میں کیا ہے، قفس میں کیا ہے حیات رنگیں نفس میں کیا ہے
بس اتنا اے ہمنشیں بتا دے کہ جیتے جی اپنے بس میں کیا ہے

ذرا یہ موسم تو دیکھ ساقی! رہے نہ کچھ آج خُم میں باقی
یہ کون بوجھے یہ کون جانے نصیب اگلے برس میں کیا ہے

گلوں کے رخ پر شباب خنداں، نسیم جولاں، شمیم رقصاں
یہ میری رگ رگ میں چوٹ کیوں ہے یہ ٹیس ایک ایک نس میں کیا ہے

تھے چند تنکے جو آشیاں کے وہ نوچ بھی ڈالے باغباں نے
گلوں کے شیدائی کو خبر کیا کہ مُہمل خار و خس میں کیا ہے

یہ مانا صیاد رات دن ہے مری ہی آسائشوں میں کوشاں
ذرا قفس میں تو رہ کے دیکھے کہ جینا قید قفس میں کیا ہے

یہ مست آنکھیں حنا کے ڈورے، یہ شوخیوں سے حیا کے غمزے
تری ادائیں ہی پردہ در ہیں تو راز اس پیش و پس میں کیا ہے

جمال کس کا ہے کہکشاں میں، نگاہ والے تو جانتے ہیں
جو بے بصر ہیں انہیں خبر کیا، تجلیات قفس میں کیا ہے

نہ صوت بلبل نہ خندۂ گل نہ زلف سنبل نہ ساغر و مُل
بہار صحرائے دل میں کیوں ہے یہ نور کنج قفس میں کیا ہے

ہو لاکھ عبرت کا تازیانہ، یہ برق رفتاری زمانہ!
جو دل میں عزم سفر نہیں ہے تو پھر خروش جرس میں کیا ہے

ضیا تری آنکھ کیوں ہے پرنم اگر نہیں گل مائل تبسم
یہ مسکرانا تو چھوڑ ہی دیں مگر غریبوں کے بس میں کیا ہے

قطعات

وہ جو تقسیم، تھی پہلے، وہی اب ہے ساقی
جان بلب کوئی، کوئی جام بلب ہے ساقی
مصلحت ہے کہ مشیّت، یہ تو معلوم نہیں
تری محفل کا یہ دستور غضب ہے ساقی

تم کو محبوبِ کبریا کہیئے
یا شہنشاہ دوسرا
مصطفےٰ کہیئے مجتبےٰ کہیئے
بزم کونین کی ضیاؔ

ولی کے سایہ مرقد میں ڈوب گئی مسجد
یہ حال دیکھ کے آنکھوں نے کر لئے در بند
نہ کیوں ہو سر بہ گریباں ضیاؔ کی طبع غیور
خدائے زندہ کے گھر سے مزار پیر بلند

---

o

دشمنِ جان زمانے کے چلن اور بھی ہیں
اک ترا غم ہی نہیں رنج و محن اور بھی ہیں

کشورِ حسن میں اے پیکرِ پندارِ جمال
گلبدن اور بھی ہیں، غنچہ دہن اور بھی ہیں

شمعِ سوزاں ترے پروانوں کا ماتم ہی نہیں
محفلِ ناز میں کچھ سوختہ تن اور بھی ہیں

زندگی مشغلۂ دردِ محبت ہی نہیں
غم پرستوں کے لئے رنج و محن اور بھی ہیں

گفتگو حرف و حکایات پہ موقوف نہیں
بات کرنا ہو تو اندازِ سخن اور بھی ہیں

ایک طاہرؔ ہی نہیں موجدِ اصنافِ سخن
شہر میں اس کے سوا اہلِ سخن اور بھی ہیں

طابہ صہ

ساتھی

پچھلے پہر کے چاند نے دیکھی ایک انوکھی بات
رات کی لمبی چپ میں ڈوبا اک تنہا انسان
سرد ہوا اور سوکھے پتوں کا مدھم سا شور
دور افق تک دھند میں لپٹا رستہ تھا سنسان
جیون کے دوراہے پر اک پل کو آن ملے
تنہائی کی دھول میں لپٹے دو راہی انجان
کس نے کس کا ساتھ دیا ہے، ساتھ ہے چلتی چھاؤں
لیکھ کے چکر کے آگے سب بیل بندھے ہیں تھان
سمت بتانے والا جانے ملتی ہے کس اور
اور چھور سے جو اونچا سو کہلائے بھگوان
سب کو اپنی راہ پہ چلنا، سب کی راہ الگ ہے
چاند افق میں ڈوب گیا پھر تنہا تھا انسان
چاند کو اپنا ساتھی سمجھا تھا کیسا نادان

کون نبھائے سنگ

کمرے کی کھڑکی کھولو اور دیکھو چاند کا رنگ
پیلا پیلا چہرہ اس کا، مرا مرا ہر انگ

پیڑوں کی سوکھی شاخیں منظر پر یوں ہیں جیسے
چلتے چلتے ٹھہر گئے ہوں چھوٹے بڑے بھجنگ،

سارے پر اک چپ چھائی ہے بوجھل اور گھمبیر
ہر اک شے کو چاٹ رہا ہے سناٹے کا زنگ،

دکھ کے ساگر کی لہروں میں دل کی بے بس ناؤ
آندھی کے اندھے جھونکوں میں جیسے کٹی پتنگ،

تنہائی کے زہر سے دل پر نیلے نیلے چھالے!
دھیان کی پگڈنڈی پر پھیلے بچھو کے ہیں ڈنگ

ایسے میں کون آسکتا ہے؟ جاؤ اور سو جاؤ
کس کی آہٹ پہ بیٹھے ہو؟ کس کی آس امنگ؟

جب رستے یوں جلتے ہوں تو کون نبھائے سنگ

کاظم زیدی

غزل

خوگرِ درد ہو انساں تو غزل ہوتی ہے
درد ہو درد کا درماں تو غزل ہوتی ہے

غم ہو آرامِ رگِ جاں تو غزل ہوتی ہے
زخمِ دل خود ہو نمکداں تو غزل ہوتی ہے

عشق گر حسرتِ دیدار میں جاں اپنی لٹا دے
حسن ہو پھر بھی گریزاں تو غزل ہوتی ہے

وصل کا ذکر بھی آجائے تو رنگ اڑ جائے
ہجر ہو عشق کا عنواں تو غزل ہوتی ہے

بات بنتی نظر آجائے تو بنتی نہیں بات
یاس ہو سامنے رقصاں تو غزل ہوتی ہے

پھونک دے آتشِ رخسار نگاہوں کو اگر
برلبِ چاہِ زنخداں تو غزل ہوتی ہے

شیشہ و ساغر و مینا کا بھلا کیا مذکور
پُر ہو پیمانۂ عصیاں تو غزل ہوتی ہے

موسمِ گل بھی ہو اور قیدِ قفس بھی کاظمؔ
ہو مقفل درِ زنداں تو غزل ہوتی ہے

قیصر ہوشیارپوری

غزل

زندگی گردشِ دوراں کی فسوں کاری ہے
کسطرح رات کٹے گی کہ بہت بھاری ہے

جام و مینا ہے، نہ ساقی، نہ صراحی، نہ شراب
بیخودی سی مرے اعصاب پہ کیوں طاری ہے

قافلہ زیست کا کس موڑ پہ آکر ٹھہرا
نکہت و نور سے گلشن کی فضا عاری ہے

میں وہ راہی کہ جو آسودۂ منزل نہ ہوا
جانے کب سے مرے خوابوں کا سفر جاری ہے

میرے ہمراز! مقاماتِ فنا سے آگے
خوابِ غفلت کی قسم عالمِ بیداری ہے

بات کہنے کا، سمجھنے کا سلیقہ آجائے
تیری تصویر ہے اور مشقِ سخن جاری ہے

اہلِ دل اہلِ وفا ہو گئے رخصت قیصرؔ
اب ترے شہر سے چلنے کی مری باری ہے

○

غزل

خونِ بلبل "گل و لالہ" میں فروزاں ہو گا
پھر بہار آئیگی، پھر "جشن چراغاں" ہو گا

دل! وہ دل جس میں، ہجوم غم جاناں ہو گا
اے غم دہر! وہ کیا تجھ سے پریشاں ہوگا

جب مرا شعلۂ احساس فروزاں ہوگا
دوستو! اور ہی پھر رنگ بہاراں ہو گا

وحشت عشق کا انجام نمایاں ہو گا
صورتِ "چاکِ کفن" "چاک گریباں" ہو گا

ہے فرشتوں کے سوا عظمت انساں لیکن
سوچتا ہوں کہ یہ انسان کبھی انساں ہوگا

کب تھا معلوم "یہ گلزار پرستی" کا مآل!
"سایۂ گل" بھی کبھی ہم سے گریزاں ہو گا

ہمیں معلوم ہے اندازِ مذاقِ العیشی
کافرِ عشق بھی ہو گا تو مسلماں ہو گا

قطعات

حقیقتوں میں فسانے تلاش کرتا ہوں
نئے نئے میں زمانے تلاش کرتا ہوں
خطائے شوق کا مجرم ضرور ہوں لیکن
ترے کرم کے بہانے تلاش کرتا ہوں

کفِ حبیب پہ آیا حنا کو اترانا
گلوں نے ہنس کے بتایا صبا کو اترانا
یہ بازپرس ہے کیسی نیازمندوں سے
ترے کرم نے سکھایا خطا کو اترانا

ترے کرم کا نہ حق اس طرح ادا ہوتا
سرِ نیاز نہ سجدے میں یوں گرا ہوتا
کسی پہ حال نہ کھلتا تری کریمی کا!!!
خطائے شوق نہ ہوتی اگر، تو کیا ہوتا؟

بنا کے توڑ دیے ہیں بت میں نے آرزوں کے
تجھے پکارتا ہوں تجھ کو جانتا ہوں میں!
مرے خلوص کے یہ سجدہائے شوق بھی دیکھ
قسم خدا کی، خدا تجھ کو مانتا ہوں میں

مقبول قریشی

○

آنکھیں ہیں سو بھیگی بھیگی، دل ہے سو پارا پارا ہے
آج اکیلا جان کے ہمکو کس نے شب خوں مارا ہے

تپتے کھنڈر کی باہوں میں اک طفلِ نو بے گور و کفن
کس کے جگر کا ٹکڑا ہے یہ کس کی آنکھ کا تارا ہے

آؤ خود سے اُمیدیں باندھیں آؤ خود سے پیار کریں
حرص و ہوا کی اس دنیا میں کس کا کون سہارا ہے

کیا کیا چاند چڑھے، گہنائے، کتنی کرنیں چور ہوئیں!
کتنے دہکتے سورج پگھلے پھر بھی وہی اندھیارا ہے

تم اک وقت کے نافے سے سب قول و قرار لٹا بیٹھے
ہم نے فرازِ دار پہ بھی رہ رہ کر تمہیں پکارا ہے

زلف و لب و رخسار کی باتیں خالی پیٹ سنے گا کون
اسی لئے تو ہم نے غزل میں دردِ حیات اُبھارا ہے

○

نسیم ملک

تاریخ ملتان کا ایک ورق

جناب نسیم ملک نے ملتان کی تاریخ نظم کی ہے۔ ذیل میں اس نظم کا صرف ایک ورق پیش کیا جا رہا ہے۔

دُور افتادہ دیومالائی دَور کی دھندلی فضا میں ملتان کے حصار بالا (قلعہ کہنہ قاسم باغ) پر متعدد مندروں کے کلس آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے تھے، ان میں سورج دیوتا کا مندر" درگا مندر" "سیری تمنتا کے سنگرام"، گنیش مندر" "ترکیا کا مندر"، "نرسنگھ پوری مندر" اور سرخ بتکدہ بہت مشہور تھے۔ سورج دیوتا کے مندر میں جو سونے کی مورتی تھی، کہتے ہیں کہ یہ مورتی کرشن اوتار کے بیٹے سمبھا نے نصب کی تھی۔ مزید یہ کہ یہاں نرت کاری اور سنگیت کے وِدّیالے بھی تھے، جن میں نامور کتھک اور رقاصائیں تربیت حاصل کرتی تھیں۔ ان رقاصاؤں میں پدماوتی نامی ایک رقاصہ چہار دانگ عالم میں مشہور تھی، اس زمانے میں جب سڑکیں اور شاہراہیں نہ تھیں اور آبادی مختصر اور دُور دُور واقع تھی، پدماوتی کی شہرت اقصائے عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ پدماوتی کو دادِ فن دینے کے لئے ودوان راجہ بھرتری کی رانی پنگلا نے اجین سے چل کر ملتان تک کا کٹھن سفر طے کیا اور سورج دیوتا کے مندر

میں پدما کے رقص سے لطف اندوز ہوئی راقم نے مندرجہ ذیل نظم میں قارئین کے ملاحظہ کے لئے اس رقص کو تاریخِ حصارِ ملتان میں یوں پیش کیا ہے۔

رقاصہ پدماوتی

سنا ہے سیماب پا یہاں اک بیسوا راج نرتکی تھی
ستارے امبر پہ رقص کرتے تھے جب یہ دھرتی پہ ناچتی تھی
دیارِ راجین سے مہارانی پنگلا اس کو لینے آئی!

ہزار فرسنگ سے مہارانی دادِ فن اس کو دینے آئی
ہنوز پدماوتی کی پائل کے گیت چھم چھم برس رہے ہیں
اور اس کی جھانجھر سے سُور چھوم اس قلعے کے سینے میں بس رہے ہیں
طلائی مُورتی کے سامنے جب وہ نرت کرتی تھی، ناچتی تھی

سنا ہے مورت بھی ہو کے مسحور، گرد پھرتی تھی، ناچتی تھی
خود ایک پُتلی سی تھی یہ پدما کہ جس کی جھانجھر کی دھڑکنوں سے
سبھا میں آتے تھے رُت سنا ہے مُگل کے دیوتا کے مندروں سے

ابرِ رواں

ہمارے مہمان

ابنِ انشا
احمد ندیم قاسمی
اختر انصاری اکبر آبادی
بدل الرشید
جسیم الدین
جمیل الدین عالی
عارف عبدالمتین
عبدالحمید ارشد
قتیل شفائی
قدرت اللہ شہاب
میرزا ادیب
نشان الحق حقی
وزیر آغا
ہاجرہ مسرور

ابیات

کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا ترا
ہم بھی وہیں موجود تھے ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیے ہم چپ رہے منظور تھا پردا ترا

اس شہر میں کس سے ملیں، ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانہ ترا
کوچے کو تیرے چھوڑ کر، جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل ترے، پربت ترے، بستی ترا، صحرا ترا

ہم اور رسم بندگی، آشفتگی، افتادگی
احسان ہے کیا کیا ترا، اے حسن بے پروا ترا
دو اشک جانے کس لیے، پلکوں پہ آ کر ٹک گئے
احسان کی بارش تری، اکرام کا دریا ترا!

اے بے دریغ و بے اماں! ہم نے کبھی کی ہے فغاں
ہم کو تری وحشت سہی، ہم کو سہی سودا ترا!
ہم پر یہ سختی کی نظر، ہم ہیں فقیر رہگزر
رستہ کبھی روکا ترا، دامن کبھی تھاما ترا؟

ہاں ہاں تری صورت حسیں، لیکن تو اتنا بھی نہیں
اِک شخص کے اشعار سے شہرہ ہوا کیا کیا ترا
بے درد سننی ہو تو چل کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق ترا، رسوا ترا، شاعر ترا، انشا ترا

احمد ندیم قاسمی

بھاڑا

میں نے اسے بچپن میں بھی دیکھا تھا۔ مگر بچپن میں تو سبھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوں گے۔ جن کے اعضا جوانی کی آنچ میں پھیل نہ جائیں یا لٹک نہ پڑیں۔ ملکھاں انہی بہت کم لوگوں میں تھی۔ چودہ پندرہ برس بعد میں اسے دیکھتے ہی محقق بن گیا ——— یہ ملکھاں دراصل ملکاں کا بگاڑ ہے۔ اور ملکاں درحقیقت ملکہ ہے۔ اور اگرچہ ملکاؤں میں بعض بڑی بدہئیت شخصیتیں بھی گزری ہیں۔ مگر ملکہ کے ساتھ حسن کا وصف عموماً بڑی شدت کے ساتھ وابستہ رہا ہے یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ لاکھوں کروڑوں عورتوں میں اگر ایک عورت کو منتخب کرنا ہو تو بدذوق سے بدذوق بادشاہ سے بھی حسن انتخاب سرزد ہو سکتا ہے۔

ملکھاں صرف حسن کے معاملے میں ملکہ تھی ورنہ دراصل وہ جھیوران تھی۔ میں نے اسے پندرہ برس کے بعد اس وقت دیکھا جب اس کے سر پر پانی سے لدے ہوئے دو گھڑے تھے۔ اور وہ بائیں ہاتھ کو اوپر والے گھڑے کے ابھار پر رکھے اور دائیں ہاتھ کو تلوار کی طرح لہراتی ایک گلی کی بلندی طے کر رہی تھی۔ مشقت کے اس لمحے وہ مجھے اس قدر خوبصورت لگی۔ کہ اس کے جسم کے خطوط اور چہرے کے نقوش کی طرف میرا دھیان ہی نہ گیا۔ اب سوچتا ہوں تو بس اتنا یاد آتا ہے کہ اس کے اٹھے ہوئے بازو پر سے سیاہ کرتے کی کھلی ہوئی آستین اس کے کندھے تک ڈھلک گئی تھی۔ اور اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو رہا تھا۔ اور اس کی ناک کی

ناک اور تھوڑی پر پسینے کے دو بڑے بڑے قطرے ٹپکنے کے لئے بے قرار تھے۔

مگر جب میں نے دو دن بعد اسے تنور کے سامنے بیٹھے دیکھا تو اس کے حسن نے اپنی تفصیل بیان کر دی۔ زمین میں دھنسے ہوئے بہت کھلے دھانے والے بڑے سے تنور کے پاس وہ یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پیچھے دیوار تھی۔ سامنے تپا ہوا تنور تھا اور تنور کے تین طرف کچے سے کھلے چبوترے پر گاؤں کی ایک ڈیڑھ درجن عورتیں صحنکوں میں گوندھا ہوا آٹا رکھے اپنی اپنی باری کی منتظر تھیں۔ ملکھاں نے اپنے سر، چہرے، سینے اور دائیں بازو پر موٹے میلے کپڑے کی چوڑی چوڑی پٹیاں لپیٹ رکھی تھیں تاکہ جب روٹی لگانے کے لئے وہ تنور میں جھکے تو اس کے جسم کے یہ حصے جھلسنے نہ پائیں۔ یوں پٹیوں میں لپٹے ہوئے اس کے چہرے پر اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور یہی آنکھیں اس کے حسن کی تفصیل تھیں۔

ملکھاں کے بچپنے کے بعد میں نے گزشتہ پندرہ برس میں چند بار اسے ضرور دیکھا ہو گا۔ ورنہ میں اسے پہچانتا کیسے! مگر یہ دیکھنا کچھ اس قسم کا دیکھنا تھا جیسے ایک مسافر چیت کے مہینے میں کھیتوں کی مینڈوں، سبزہ زاروں کی چھریوں اور پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزر رہا ہو۔ اور دیکھ رہا ہو کہ ہر طرف جنگلی پھول اگ رہے ہیں۔ اگ نہیں رہے ہیں امڈ رہے ہیں۔ گلابی اور بسنتی، نیلے اور چٹے ——— موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ننھے ننھے ذرا ذرا سے پھول۔ جنہیں دیکھ کر مسافر کو اپنا سفر گلگشت معلوم ہو۔ لیکن جو منزل پر پہنچ کر ان پھولوں کی کوئی تفصیل بیان نہ کر سکے۔ میں مسافر ہی تو تھا جو سال دو سال میں اپنے گاؤں کا ایک آدھ چکر لگا لیتا تھا۔ اور ملکھاں ہزاروں جنگلی پھولوں میں سے ایک پھول تھی۔ اور میں ان پھولوں کے بارے میں یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ یہ پھول چار اور وہ پھول پانچ پتیوں پر مشتمل ہے یا اس پھول کی پتیوں کے کنارے گول اور اس کے دندانے دار ہیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک ملکھاں کی آنکھیں مجھ سے کیسے چھپی رہ سکتی تھیں۔ انسان کے جسم کا سب سے بلیغ حصہ اس کی آنکھیں ہیں۔ زبان سے جذبات کا اظہار ادھورا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی۔ لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی انسان سے ملتا ہوں تو سب سے پہلے میری آنکھیں اس کی آنکھوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کہیں مجھے سمندر نظر

آتے ہیں اور کہیں صحرا۔ کہیں ان میں تارے چمکتے ہیں اور کہیں چراغ بجھتے ہیں۔ ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں کہ غور سے نہ دیکھو تو گناہ کا احساس ہونے لگے اور غور سے دیکھو تو ڈوب جاؤ۔

اس کے باوجود پندرہ برس بعد جب میں نے ملکھاں کو گلی کی بلندی طے کرتے دیکھا۔ تو مجھے اس کی آنکھوں تک پہنچنے میں خاصی دیر لگی۔ اور جب تک میں اس کی آنکھوں میں جھانکتا وہ "رد بلائیں دور بلائیں" کے خیر مقدمی الفاظ بولتی میرے قریب سے نکل گئی تھی۔ لیکن دو دن بعد جب میں نے اسے تنور کے سامنے حفاظتی پٹیوں میں لپٹا ہوا دیکھا تو جس طرح اس روز اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا۔ اسی طرح آج اس کا سارا حسن اس کی آنکھوں میں رچ گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو اس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے اس میں دونوں جہاں نظر آ گئے۔ وہی ابہام جو خمار شکن بھی ہے اور خمار آلود بھی۔ اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو جیسے صدیاں گزر گئیں۔

بوڑھی عورتوں، جوان لڑکیوں اور کم سن بچیوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ بعض آٹا بھی گوندھ رہی تھیں اور غیر ہموار زمین پر ان کی جھانجھیں بج رہی تھیں۔ اور چوڑیاں کنگنوں سے بج رہی تھیں۔ اور بالیاں بالیوں سے بج رہی تھیں۔ اس مدھم منتشر مگر مسلسل موسیقی میں گھرا ہوا تنور دہک رہا تھا اور دہکتے ہوئے تنور میں روٹی لگائی جائے تو جل جاتی ہے یا ٹوٹ کر گر پڑتی ہے۔ اسی لئے آنچ میں کمی کا انتظار ہو رہا تھا اور ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"بس اتنی سی دیر لگی کہ بچہ ہوا تو سب سمجھیں بھاگاں مر گئی۔ اور جب بھاگاں نے آنکھیں کھولیں تو بچہ مر چکا تھا۔"

"ہا ——— بیچاری کا تیسرا تھا۔"

"تیسرا کیوں بہن؟ چوتھا کہو۔ شادی سے پہلے والا بھی تو گنو۔"

"خدا کے لئے ماسی۔" ملکھاں پہلی بار بولی۔ مگر اس کے ہونٹ بھی پٹیوں میں چھپے ہوئے تھے اس لئے اس کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "خدا سب کے پردے رکھے۔ آہستہ بولو مرد لوگ بیٹھے ہیں۔"

میں تنور کے چبوترے پر چڑھے ہوئے چھپر کے نیچے مرد لوگوں ہی کے پاس بیٹھا تھا۔ ملکھاں

کے شوہر نے مجھے اپنے بھائی کا خط پڑھنے کے لئے گلی میں سے بلا لیا تھا۔ اور اگرچہ میں خط کب کا پڑھ چکا تھا۔ مگر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ یہ نوجوان جھیو ڑیوں اطمینان سے حقے کے کش لگا کر دھوئیں کو اپنی گھنی مونچھوں میں سے گزارتا تھا، جیسے تنور کے کنارے اس کی باوردی بیوی نہیں بیٹھی ہے بلکہ ایک مشین رکھی ہے اور ابھی جب شام گہری ہو جائے گی تو یہ مشین گوندھا ہوا ڈھیر سا آٹا اٹھا کر اس کے سامنے لا ڈالے گی۔ وہ جب حقے کا دھواں نکالتا تو قریب ہی کھڑا ہوا اس کا بڑا بیٹا دھوئیں میں سے بار بار ہاتھ گزار کر دھوئیں کو کاٹنے کی کوشش کرتا۔ اور کھرے کھٹولے پر لیٹا ہوا اس کا چھوٹا بیٹا زور سے کلکاری مارتا۔ "مرد لوگ" بس انہی چار نفوس پر مشتمل تھے۔

ملکاں نے قریب رکھی ہوئی دَوری میں سے چلو سے پانی لے کر تنور کے چار طرف بار بار چھڑکا تو تنور اژدہے کی طرح بار بار پھنکارا۔ ملکاں کے قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت نے صحنک میں سے آٹے کا پیڑا اٹھا کر ملکاں کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا اور ملکاں بولی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

پیڑے کو دونوں ہاتھوں میں چٹاخ پٹاخ بجاتے ہوئے ملکاں نے کہا "ذرا چھوٹا پیڑا بنایا کر بہن۔ بڑے پیڑے کی روٹی موٹی بنتی ہے۔ کچی رہ جاتی ہے اور پھر تم نام دھرتی ہو"

پھیلی ہوئی روٹی کو دائیں ہاتھ پر پھیلا کر ملکاں گھٹنوں کے بل ذرا سی اٹھی۔ پھر جھکی اور تپتے ہوئے تنور میں جیسے غائب ہو گئی۔ فوراً بعد وہ ابھری، پھیلے ہوئے ہاتھ پر دوسرا پیڑا لیا، چٹاخ پٹاخ روٹی بنائی اور پھر سے تنور میں جیسے اتر گئی۔

ایک بار نیا پیڑا لینے میں اُسے ذرا سی دیر لگی تو میں نے دیکھا کہ تنور میں جھکتے ہی وہ تپش سے بچنے کے لئے اپنی آنکھیں بھینچ کر ان پر اپنی پلکیں پھیلا دیتی ہے۔ اور جب تنور سے ابھرتی ہے اور بھینچی ہوئی آنکھیں کھولتی ہے۔ تو وہ ایسا لگتا ہے جیسے ان میں آگ بھر لائی ہے۔

روٹی کو دائیں ہاتھ پر رکھتے ہی وہ گھٹنوں کے بل اٹھتی تھی اور بائیں ہاتھ سے تنور کی منڈیر تھام کر آدھے دھڑ کو تنور کے حوالے کر دیتی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ زمین میں دھنسے ہوئے اتنے کھلے اور اتنے گہرے تنور کے اوپر سے نیچے چار طرف روٹیاں لگاتے ہوئے وہ اپنا توازن کیسے قائم رکھتی تھی۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میرا دل بار بار کیوں ڈوبتا اور ملکاں کے شوہر کو یہ کہنے کی ضرورت

کیوں محسوس ہوئی کہ جاڑے کے۔ اندر سے پنکھا اٹھا لا اور میاں جی کو جھل۔ پسینے پسینے ہو رہے ہیں دیکھئے میاں جی! روزی کی بات ہے۔ ورنہ میں تو آپ کی منت کرتا کہ شہر کو گولی ماریئے۔ دیکھئے تو آپ کیسے پیلے پیلے بالکل ہلدی سماں ہو رہے ہیں۔"

لڑکا سچ مچ میرے پنکھا جھلنے لگا۔ اور ملکھاں بار بار دہکتے ہوئے تنور میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ ایک عورت سے اس کی تکرار بھی ہو گئی۔ ہر عورت پیڑے دے چکنے کے بعد گوندھے ہوئے آٹے کا بھاڑا ملکھاں کے حوالے کرتی تھی۔ یہ بھاڑا پانی والی دوری کے پاس رکھی ہوئی ایک بڑی سی صحنک میں جمع ہو رہا تھا۔ بھاڑا روٹیوں کی تعداد کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا تھا۔ مگر اس عورت نے چھ پیڑے دینے کے بعد ملکھاں کو جو بھاڑا دیا وہ اتنا کم تھا کہ دوسری عورتیں بھی حیران رہ گئیں ملکھاں نے بھاڑا ہاتھ میں لے کر اسے ایک گیند کی طرح انگلیوں کی پوروں میں گھمایا اور بولی۔ "لڑکیاں اپنی گڑیوں کے لئے جو روٹیاں پکاتی ہیں۔ ان کا پیڑا بھی اس بھاڑے سے بڑا ہی ہوتا ہے۔ دیکھ بہن! میرے بچوں کا باپ دن بھر جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر جھاڑ جھنکار کے ڈھیر لاد لاتا ہے اس سے میں تنور تپاتی ہوں۔ پھر اپنے آدھے دھڑ کو ہاڑ کی اس گرمی میں، اس دوزخ میں بار بار جھونکتی ہوں۔ اس پر بھی اگر مجھے اپنی محنت کا یہ بھاڑا ملے۔ تو بہن! اس سے تو اچھا یہ ہے۔ کہ تو مجھے بھاڑا نہ دیا کر، میرے بچوں کے لئے دعا کر دیا کر۔"

عورت چلا اٹھی "۔ تو کیا میں فقیرنی ہوں کہ تجھ سے مفت میں روٹیاں پکواؤں؟"

ملکھاں نے جواب دیا "۔ فقیر ہم بھی نہیں ہیں بی بی۔ ہم بھی اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔ بھیک نہیں مانگتے!"

عورت نے پھر کوئی جواب دیا۔ دوسری عورتیں بھی بولنے لگیں۔ ملکھاں نے بھی کوئی بات کی۔ مگر پھر اس نے پوروں میں تھمے ہوئے آٹے کو بھاڑے والی صحنک میں دے مارا، اور نئے پیڑے کے لئے ہاتھ یوں تیزی سے پھیلایا جیسے میان سے تلوار نکالی ہے۔ خاموشی چھا گئی۔ صرف ملکھاں کی آنکھیں بولتی رہیں۔ وہ کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی، کالی سوچتی ہوئی آنکھیں، جو کسی ملکہ کے چہرے پہ ہوتیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں۔

تنور کی سب روٹیاں اتر گئیں تو ملکھاں اٹھی۔ عورتیں چبوترے کے کنارے تک ہٹ گئیں

اور ملکھاں کے شوہر نے صحن کے گوشے میں پڑے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ کے ایک انبار پر ہاتھ ڈ مارا۔ ایک ڈھیر اٹھا کر تنور میں جھونک دیا۔ شعلہ ایک دھماکے کے ساتھ بلند ہوا، لکڑیاں جیسے چٹکیاں بجانے لگیں۔ چنگاریوں کا ایک فوارہ آسمان کی طرف چھوٹا اور تنور پھر سے تپنے لگا۔

ملکھاں جو دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ یکایک وہاں سے ہٹی اور اپنے چھوٹے بچے کے پاس آگئی۔ میں نے صرف آنکھیں دیکھنے کے لئے اس سے پوچھا۔

"اس کا کیا نام رکھا ہے؟"

"باذا" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اور اس کے ہونٹوں نے جو پٹیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اپنی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کے حوالے کر دی۔ اللہ اکبر! یہ آنکھیں تو خدا کے وجود کا ثبوت تھیں۔

میں نے اس سے بڑے بیٹے کا نام پوچھا۔ پھر یہ پوچھا کہ انہیں پڑھاؤ لکھاؤ گی؟ پھر یہ کہ تمہارا دیور لائل پور کی کس مل میں ملازم ہے۔ اور تمہارے شوہر کو کچھ بھیجتا بھی ہے یا جو کچھ کماتا ہے وہ کھا جاتا ہے؟ ان سوالوں کا مجھے صرف ایک ہی جواب درکار تھا اور یہ جواب اس کی آنکھیں تھیں۔

میں نے ان چند لمحوں میں بڑی تفصیل سے اس کی آنکھوں کا مطالعہ کیا۔ میں "بڑی تفصیل" کی جگہ "جی بھر کر" کے الفاظ بھی استعمال کر سکتا تھا۔ مگر ایسا کرنے میں جھوٹ بھی بولتا اور ان آنکھوں کی ہتک کا بھی مرتکب ہوتا۔ اگر ان آنکھوں کو جی بھر کر دیکھا جا سکتا تو وہ عام آنکھیں ہوتیں مگر وہ عام آنکھیں نہیں تھیں۔

ان آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ اگر رات اتنی سیاہ ہوتی تو سورج کو طلوع ہونے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی۔ سفید حصہ اتنا سفید تھا کہ ہلکا نیلا ہو رہا تھا۔ ڈوروں کا گلابی رنگ شاید تنور کی آنچ کی وجہ سے سرخی میں بدل گیا تھا۔ ان آنکھوں پر لمبی لمبی گنجان پلکوں کی چھاؤنی چھا رہی تھی۔ پلکوں کی یہ قوسیں جیسے آنکھوں کے خزانے پر کمانیں تانے پہرہ دے رہی تھیں۔ وہ پلکوں کو بہت نرمی سے جھپکتی تھی۔ نہایت آہستہ، جیسے اسے نیند آ رہی ہے۔ اور وہ نیند کو روک رہی ہے۔

میرے سوالوں کی بوچھاڑ کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ اور جھکائے رکھیں۔ مجھے اپنے بھدے پن سے دوہری کوفت ہوئی۔ ایک اس لئے کہ وہ کسی حد تک میرا مقصد بھانپ گئی تھی۔ اور دوسرے اس لئے کہ وہ جھکی ہوئی آنکھیں لئے تنور کی طرف پلٹ گئی۔

شعلے بیٹھ گئے تھے اور تنور کی دیواریں دہکنے لگی تھیں۔ ملکھاں تنور کی طرف چل دی تھی اور اس کی جگہ اس کا شوہر میرے پاس آگیا تھا۔ تنور کے کنارے بیٹھ کر اس نے ماتھے کی پٹی کو بھووں تک کھینچا اور دائیں بازو کی پٹی کی لٹکتی ہوئی ایک دھجی کو وہیں کہیں اڑس کر تنور میں جھانکی اور شوہر سے بولی۔

"حقہ تازہ کر کے میاں جی کو بھی پلا۔ اتنی دیر سے بیٹھے ہیں۔ کیا کہیں گے؟"

چوپال میں آکر میں نے تنور میں روٹیاں لگانے کے سلسلے میں جھیورنوں کی بے پناہ شفقت کا ذکر چھیڑا تو سب میرے پیچھے پڑ گئے۔ سب کو شکایت تھی کہ جھیورنیں تو مفت کا بھاڑا لیتی ہیں ——— اور پھر جو کچھ کماتی ہیں۔ وہ اتنا بہت سا ہوتا ہے کہ پورا کھا بھی نہیں سکتیں بڑے گھروں کی وہ عورتیں جو آٹا گوندھنے کا وقت نہیں نکال سکتیں کہلوا بھیجتی ہیں۔ کہ آٹھ روٹیاں بھجوا دو۔ یہ روٹیاں اسی بھاڑے سے پکتی ہیں اور بدلے میں مہینے آدھ مہینے بعد جھیورنیں ہر گھر سے من من آدھ آدھ من گندم سمیٹ لے جاتی ہیں۔ پھر بھی آٹا بچ جاتا ہے۔ اور وہ الٹے مٹکوں پر آٹے کی موٹی موٹی رسیوں کی سی سویاں بٹتی ہیں اور انہیں گڑ کے بھاؤ بیچتی ہیں۔ آپ شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کیا جانیں کہ یہ جھیور، موچی، لوہار، کمہار ہمیں کس کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔"

ملکھاں کے دونوں ہاتھ میرے سامنے ابھرے۔ آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ جو پیڑے کو روٹی میں بدلنے کے لئے حرکت میں آئے تو جیسے کائنات تخلیق ہونے لگی۔ ملکھاں کا دایاں بازو کندھے تک پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اور اسی ہاتھ پر پھیلی ہوئی روٹی تھی۔ بایاں ہاتھ منڈیر کو جکڑے ہوئے تھا۔ اور تنور کی دیوار تانبا ہو رہی تھی۔ اور نیچے تہ میں انگارے دہک رہے تھے۔ پھر ملکھاں نے گھٹنے ٹیکے۔ جھکی اور اس کا آدھا دھڑ تنور میں غرق ہو گیا۔ اور اس کا بیٹا میرے پنکھا جھلنے لگا اور

چوپال پر سے آواز آئی کہ جیسی گرمی اب کے سال پڑی ہے۔ ویسی پچھلی ایک صدی سے نہیں پڑی پھر جب ملکھاں اٹھی اور پٹیوں میں پیٹے ہوئے چہرے پر اس کی میچی ہوئی آنکھیں کھلیں تو جیسے وہ شعلے پی آئی تھیں۔ یہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ سلگ رہی تھیں۔ اور ان کے ڈوروں میں چنگاریاں بھر گئی تھیں۔ اور ان کے پپوٹوں پر کاجل کی بجائے راکھ کے ذرے بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے گوندھے ہوئے آٹے کے ذرا ذرا سے بھاڑے کے گولے ناچ رہے تھے

لوگ جب گرم گرم روٹیاں کھاتے ہیں تو وہ اگر ملکھاں کے ہاتھوں کو یاد نہیں رکھ سکتے تو اس کی آنکھوں کو کیسے بھول جاتے ہیں۔ جو اگر ملکھاں کی بجائے ان کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کے چہرے پر ہوتیں تو وہ دنیا کے سارے تنکے اپنی آنکھوں میں بھر لیتے۔ تاکہ ان کے پیاروں کی آنکھیں محفوظ رہیں۔

گاؤں کے قیام کے دوران میں ملکھاں کو میں نے اس کے بعد دو بار دیکھا۔ ایک بار وہ ٹین کے ننھے سے چراغ میں مٹی کا تیل ڈلوا کر نکلی تو ادھر سے میں گزر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"رد بلائیں۔ دور بلائیں" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے شے کو ذرا سا طول دینے کے لئے پوچھا۔

"چراغ میں تیل ڈلوایا ہے؟" جواب میں اس نے "جی" کہا۔ مگر یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں جھکا لیں اور میں جیسے تنور میں اتر گیا۔

دوسری بار میں ایک بھونڈا سا بہانہ بنا کر ملکھاں کے ہاں اس وقت جا نکلا۔ جب عورتیں سروں پر چنگیروں سے ڈھکی ہوئی صحنکیں رکھے روٹیاں پکوا لے جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا۔ کہ اس کا شوہر گھر میں نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے اسے چوپال کی گلی میں سے جاتا ہوا دیکھ آیا تھا۔ مگر میں نے آتے ہی پوچھا۔ ملکھاں تنور کے سامنے پٹیوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی اور تنور کی آنچ میں کمی کا انتظار کر رہی تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ اور بولی۔

"جی وہ روضے شریف پر سے خاک پاک لانے گیا ہے۔ ننھے کو چٹانے کے لئے۔ کل سے اسے عجیب سی کھانسی اٹھ رہی ہے۔"

"اوہو" میں نے کہا۔ اس سے زیادہ کہنے کا مقدور ہی نہیں تھا۔ اور اگر میں کچھ کہنے کی ہمت

کر لیتا تو بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا تھا کہ یوں آنکھیں نہ جھکا لیا کرو۔ اس طرح آسمان بالکل سر پر جھک آتا ہے۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے سوچا کہ کچھ کہنے کا یارا نہیں تو پلٹ کر دیکھ ہی لوں مگر میری یہ حرکت میرے بہانے سے بھی زیادہ بھونڈی ہوتی سو چلا آیا۔ مگر اب یہ مشکل آ پڑی۔ کہ میں جب بھی ملکھاں کی آنکھوں کو تصور میں لاتا۔ انہیں جھکا ہوا ہی پاتا۔ میں اپنے آپ سے لڑتا ہی رہا۔ کہ آخر ایسا بھی کیا۔ آخر میں نے اس کی کھلی آنکھوں کو بھی تو دیر تک اور اتنے قریب سے دیکھا ہے اور ان میں وہ کچھ پایا ہے جو پوری زندگی میں نہیں پایا۔ پھر جب میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ مند کیوں جاتی ہیں۔ میں نے طے کیا کہ کل شام اس کے جا کر بے حیاؤں کی طرح بیٹھ جاؤں گا۔ اور اس سے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کروں گا۔ اور جب وہ اپنی آنکھوں کی پوری لمبائی اور گہرائی سے مجھے ایک بار دیکھے گی تو میں فوراً وہاں سے چلا آؤں گا تاکہ ان بھرپور آنکھوں کے تصور سے میرا ذہن ہمیشہ جاگتا رہے۔

دوسرے دن شام سے پہلے مجھے ایک معقول بہانہ بھی سوجھ گیا آخر اس کا بچہ بھی تو بیمار تھا اور جب میں بچے کی مزاج پرسی کروں گا تو اس کی آنکھیں یقیناً جھکنا بھول جائیں گی۔

میں گھر سے نکلا۔ ابھی ملکھاں کے گھر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ہی تھا کہ یکایک بہت سی عورتوں کی چیخیں ایک طوفان کی طرح امڈیں۔ پھر آس پاس کی گلیوں میں سے لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور ملکھاں کے گھر میں گھس گئے۔ پھر مردوں کی اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں۔ اور عورتوں کی چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں۔

میں بھاگا اور ملکھاں کے گھر میں داخل ہو گیا۔

ملکھاں کے سر، چہرے، سینے اور بازو پر لپٹی ہوئی پٹیوں کو نوچ کر پھینک دیا گیا تھا اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ اور عورتیں ایک نو وارد عورت کو بتا رہی تھیں۔ "نوراں سے بچارا بلے کر اس نے مٹک میں بچا پھر ایک پیڑے کی روٹی بنا کر تنور میں جھکی تو تنور کی منڈیر ٹوٹ گئی اور وہ سر کے بل تنور کی تہہ میں جا گری۔ مگر ادھر گری ادھر اس کا گھر والا آیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نکال لیا۔ قدرت خدا کی کہ جو حصہ انگاروں پر گرا اس پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس لیے بچ گئی۔ بس یہ ہوا ہے کہ بے چاری کی آنکھیں بھن گئی ہیں"۔

احمد ندیم قاسمی

غزل

آج تک حسن کا معیار ہے عشق آزاری — کوئی کرتا ہی نہیں تجربۂ دلداری
آدمی اپنی ہی آواز سے ڈر جاتا ہے — اس قیامت کی خموشی ہے فضا پر طاری
لوگ اب عشق بھی کرتے ہیں بڑی عقل کے ساتھ — اب تو پتھر سے بھی تولو، تو لگی ہے بھاری
نہ اٹھے روح سے جب ہوک، تو کس کام کا درد — یوں بظاہر تو سبھی زخم لگے ہیں کاری
اپنی آنکھوں کے سمندر کا تموج بھی دکھا — تو نے پلکیں تو اٹھائی ہیں بصد دشواری
کتنے افسانے سنائے تری خاموشی نے — اس بلاغت پہ ہو قربان مری خوش گفتاری
کیوں ترے وصل کا اک پل بھی ہے برسوں پہ محیط — کیا ہوئی وقت کی مشہور صبا رفتاری
عام ہے تیرے خدوخال کہیں مل نہ سکے — یوں تو دیکھی ہیں کئی صورتیں پیاری پیاری

اک پجاری کی طرح فن کی پرستش کی ہے
اسی باعث مرے معیار نہیں بازاری

اختر انصاری اکبر آبادی

غزل

سہتے تھے ظلم ظلم کا لیکن بیان نہ تھا
جیسے کہ بزم میں کوئی اہلِ زبان نہ تھا

ذرے بنے ہوئے تھے ستارے جہاں ندیم
وہ بھی یہی زمیں تھی کوئی آسمان نہ تھا

شاید شباب پہ تھی محبت کی زندگی
وہ زندگی کہ جب کوئی سود و زیاں نہ تھا

دیکھا تھا مسکرا کے مری سمت آپ نے
جب کائنات میں کہیں غم کا نشاں نہ تھا

رخ مل گیا ہوا کا تو ساحل پہ آ لگی!
کشتی کا میری ورنہ کوئی بادباں نہ تھا

مڑ کر جو دیکھتا ہوں تو راہیں اداس تھیں
منزل سے دور دور کہیں کارواں نہ تھا

اختر مرے جنوں کو سمجھتا نہ تھا کوئی
دنیا میں کوئی غم کا مرے رازداں نہ تھا

تصنیف: بذل الرشید

ترجمہ: ریاض انور

ایک بنگلہ گیت

جیون کے رستے پر چلتے چلتے
ایک نئے آکاش تلے ہم آئے
چاروں اور سجے ہیں جس پر جھلمل کرتے تارے
اپنے جیسی ویراں آنکھیں اور خاموش اشارے
یہ مغموم ستارے!
صبح کی اجلی کرنوں میں لگ مہر کا ننھا پودا
دل کی بات سنائے
امرت رس ٹپکائے
جھوم جھوم لہرائے
ان دیکھی منزل کی جانب
صدیوں سے یہ دریا اپنی دھن میں بہتا جائے
نگری نگری بستی بستی گھوم کے میں نے دیکھا
تیرے جسم سے پھوٹتی خوشبو
سارا جگ مہکائے
جگ فانی، جگ والے فانی
لیکن تیرا روپ امر ہے جس کے پاس نہ آئیں
وقت کے بڑھتے سائے
میرے ہاتھ ترے چرنوں کو کاش کبھی چھو پائیں
سارا دکھ دھل جائے۔

جمیل الدین عالی

دوہے

عالی جی اک دوست ہیں اپنے جن کا ہے یہ کام
جیون بھر نردوش رہیں اور جیون بھر بدنام

اگنی سی ہے رومئیں رومئیں میں نس نس دکھ سے چور
عالی تم پہ جیون کا جو وار پڑا بھرپور

میں نے کہا کبھی سپنوں میں بھی شکل نہ مجھ کو دکھائی
اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

٭

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ رنگت گال پہ لالی آنکھیں بہت اداس

اے رانی تو جگ جگ جیوے ہاتھ میں لے میرے ہاتھ
اے راجہ میں آج تیری کل اور کسی کے ساتھ

٭

تصنیف: جسیم الدین
ترجمہ:- شبیر حسن اختر

قبریں

جناب شبیر حسن اختر نے مشہور بنگالی شاعر جسیم الدین کی ایک طویل نظم کا خوبصورت ترجمہ "قبریں" کے عنوان سے اردو میں کیا ہے ذیل میں اس نظم کا صرف ایک حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

تیرا باپ اس ٹیلے میں دفن ہے
اور اسی میں تیری ماں سو رہی ہے
تو رو رہا ہے میرے بچے
یقیناً تیرا ننھا سا دل بھی دو نیم ہو چکا ہے

سردیوں کی ایک رات تیرا باپ آیا
اور اس نے مجھے بلا کر کہا
"بابو مجھے کچھ ہو گیا ہے"
"میں نے پہلے تو ایسا کبھی محسوس نہیں کیا تھا"

میں نے جھونپڑی میں فرش پر چٹائی بچھا دی
اور اسے کہا "سو جاؤ میرے بیٹے"
لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ اس بستر سے پھر نہیں اٹھے گا
اور یہ اس کی آخری نیند ہو گی۔

میں نے اس پر کفن ڈال دیا
اور جب اسے اٹھا کر لے جانے لگے
تو تُو نے میرا بازو پکڑ کر پوچھا تھا
"میرے ابا کو کہاں لئے جا رہے ہو؟"

اس سوال پر سارے الفاظ میرے ہونٹوں پر آ کر منجمد ہو گئے
میں تجھے کیا بتا سکتا تھا؟
لفظوں کی ساری کائنات تو غم میں ڈوب چکی تھی
تجھے کیا جواب مل سکتا تھا؟

کئی دنوں تک مسلسل
تیری ماں ہل اور پھاوڑے کو سینے سے لگائے روتی رہی
اور راتوں کو
وہ سو بھی نہ سکی،

درختوں کے پتے غم کے مارے جھڑ جھڑ کے راہوں میں پھیل گئے
خزاں رسیدہ ہوائیں سسکتی رہیں،
اور ویران کھیت

آنسوؤں سے سیراب ہوتے رہے۔

راہ چلتے مسافر بھی روئے بغیر نہ رہ سکے۔
ان کے چہرے آنسوؤں سے دھل جاتے
اور جب وہ گزرتے تو
جنگلوں میں ان کے بھاری قدموں کی آہٹ آہ بن کر ڈوب جاتی۔

بیلوں کے جوڑے باڑوں میں
تنہا ہو ہو کر روتے رہے،
اور اپنے مالک کی جدائی میں بلکتے رہے
حتیٰ کہ انہیں کھانا پینا بھی بھول گیا

ان بیلوں کے گلے میں
تیری ماں اپنی کنول جیسی باہیں ڈال کر یوں روتی
کہ سارا گاؤں غم میں ہچکولے لینے لگا۔
اور کئی دل پاش پاش ہو گئے

اس حرماں نصیب کے آنسو
شاید دوسری دنیا والوں تک پہنچ گئے
اور وہ بہت ہی جلد اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی سے جا ملی
اور اس وقت موت کی گود میں سو رہی ہے

اس نے آخری وقت تمہیں اپنے سرہانے کے قریب بلایا

اور کہا "افسوس میں تمہیں اپنے چھوڑے جا رہی ہوں"
میرے بیٹے اب تو کسی کو
ماں کہہ کر نہ پکار سکے گا ـــــ الوداع

ـــــــ

"میرے پیارے۔ میرے لال، میرے محبوب
یہ میں ہی جانتی ہوں کہ تجھے چھوڑتے وقت
مجھ پہ کیا بیت رہی ہے؟!
مجھے کتنا غم ہے، کتنا دُکھ ہے؟!"

ـــــــ

اس کے بعد اس کے رخساروں سے
موتیوں کی جھڑی لگ گئی
آخری وقت اس نے جو دولت تمہیں دی تھی
اسے کوئی نہیں پہچان سکتا

ـــــــ

ایک لمحہ بعد اس نے مجھے بلایا اور کہا
"میرے شوہر کی پگڑی میری قبر پہ لٹکا دینا
جو ہوا میں
لہروں کی طرح جھومتی رہے گی"

ـــــــ

یہ پگڑی بوسیدہ ہو گئی، تار تار ہو گئی
اور بالآخر وقت نے اسے مٹی میں ملا دیا
لیکن محبت بھرے دلوں کا درد لافانی ہے
امر ہے۔ اور بار بار اٹھ کر لہراتا ہے

موتیوں کا یہ حسین جوڑا
اس گھنے درخت کے نیچے دفن ہے۔
جگنو اُن کی راتوں کو روشن رکھتے ہیں
اور جھینگر پیار بھری لوریاں دیتے ہیں

میرے بچے۔ دعا مانگ
کہ اے میرے آقا۔ اے رحمدل خدا
میرے والدین پر رحمت فرما
اور انہیں لافانی مسرّت عطا کر۔

شان الحق حقی

●

انداز ہیں موسم میں مرے رنگ غزل کے   آتی ہے تری یاد بڑے بھیس بدل کے

ہاں دور زمانہ کوئی پیمانہ بدل کے   اب تک مرے پہلو میں وہی درد ہیں کل کے

اب اور کوئی ذکر دل افزا و دلا فروز   بیٹھے ہیں زمانے پہ بہت زہر اگل کے

باقی نہیں اب ساز وہ نغمے جو دم رقص   گونجے تھے فضا میں ترے قدموں سے نکل کے

یاد آنے لگا پھر وہ سکوں تیری گلی کا   پھر دل کا تقاضا ہے کہ بیٹھیں کہیں چل کے

کچھ اب بھی غنیمت ہیں خیالوں کے اجالے   بڑھتے چلے جاتے ہیں نگاہوں کے دھندلکے

خائف نہ ہوں ارباب خرد اہل جنوں سے   وحشت میں بھی پڑتے ہیں بہت پاؤں سنبھل کے

کچھ آب ہوا ہی پہ نہیں دل کا گزارا   نغمے چلے آتے ہیں پہاڑوں سے پگھل کے

اے دل یہ بتا دہر کے آلام دو روزہ   ہوتے ہیں کہاں گم ترے آغوش میں پل کے

وہ دل کہ رہا تھا تری قربت میں بھی بے چین   رہ جاتا ہے بہلا کے تری یادوں سے بہل کے

قدموں سے لگی ہے ترے دیوانوں کے منزل   پڑتے ہیں اندھیروں میں قدم اور سنبھل کے

کھینچا ہے قلم نے دل پرخوں کا مرقع
اچھا ہے جو رکھ دے کوئی ہاتھوں سے مسل کے

عارف عبد المتین

●

میں ہوں تیرے وجود کی اک آن! تو اگر ہو سکے، مجھے پہچان!

ریگِ غم بن کے اُڑ گئے ہر سو دشتِ دل میں اُٹھے ہیں وہ طوفان!

اپنی طاعت بھی کر سکے نہ قبول کیسے مانیں کسی کا ہم فرمان!

کل سے ہر حادثہ کی رکھ اُمید کل کہ کچھ بھی نہیں بجز امکان

کج ادائی نہ ہم سے کر اے زیست ہم گھڑی دو گھڑی کے ہیں مہمان

ہائے یہ زندگی محبت کی کتنی مشکل ہے، کس قدر آسان

شورِ محشر سے کم نہیں دھڑکن شہرِ دل ہے کچھ اس قدر سنسان

اے مریضِ اجل بہ غرضِ حیات ابنِ مریم کا مت اٹھا احسان

ہم نے عشرت کی انتہا دیکھی غم کے سائے میں ہم چڑھے پروان

ہم سے زنجیرِ کرب کٹ نہ سکی ہم کو حاصل نہ ہو سکا نروان

قطعہ

ان کو وعدہ شکن نہ کہہ عارف یوں نہ بن اپنے آپ سے انجان

تو نے توڑے ہیں سب پسِ پردہ خود سے باندھے تھے جتنے بھی پیمان

عبدالحمید ارشد

گلشن بھی وہی اور وہی دستِ صبا ہے
ہر پھول کے چہرے سے مگر رنگ اڑا ہے

ہر سانس کے کاندھے پہ ہے اُمید کی میّت
تحریکِ مسلسل بھی فقط آہ و بکا ہے

ہر جام کو کچھ سوچ کے ہونٹوں سے لگانا
ہر پھول کی پتّی میں کوئی زہر بسا ہے

اک شعلہ اٹھا تھا تری آنکھوں سے لپک کر
اے دوست بس اتنا تو مجھے یاد رہا ہے

بندوں کی خدائی میں پریشان ہے دنیا
اب سامنے آجائے اگر کوئی خدا ہے

صد رشک کے قابل ہیں مرے دل کی بہاریں
حالات یہ کہتے ہیں یہاں درد رہا ہے

میں دیکھ رہا ہوں کہ فضاؤں میں دھواں ہے
پھر زیست سے مایوس کوئی شعلہ بجھا ہے

انداز جہاں دیکھ کے خاموش ہے ارشدؔ
اے دوست یہی مسلکِ اربابِ وفا ہے؟

●

پھوٹے نہ کوئی آنکھ سے جھرنا پیارے
اتنا بھی کہیں ضبط نہ کرنا پیارے
غیروں سے تو محتاط رہو گے لیکن
ڈرنا تو کسی دوست سے ڈرنا پیارے

آغاز ہی آغاز رہے تو بہتر
انجام کی تخلیق نہ کرنا پیارے
فطرت کی سخاوت کا نہ احساں لینا!
امید کی سرخی سے سنورنا پیارے
احباب کے وعدے پہ نہ جینا ارشدؔ
گرتی ہوئی دیوار سے ڈرنا پیارے

قدرت اللہ شہاب

اے بنی اسرائیل

تیسرے روز سویرے ہی بیروت کا ساحل نظر آنے لگا۔

عرب طالب علم دوڑ دوڑ کر سب سے اوپر والے عرشہ پر چڑھ گئے اور بڑی خوش الحانی سے اپنے اپنے قومی ترانے گانے لگے۔ فرانسیسی نرسوں کو خاص طور پر یہ گیت پسند آئے غالباً وہ مجھ سے بھی پاکستان کا قومی ترانہ سننے کی فرمائش کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں ان کا ارادہ بھانپ کر ادھر اُدھر کھسک گیا۔ کیونکہ اپنے قومی ترانے کے الفاظ اگر مجھے یاد تھے تو اس کی دھن کو نبھانا میرے بس کی بات نہ تھی۔

جب جہاز بندرگاہ میں داخل ہوا۔ تو سب سے پہلے جو چیز نظر آئی وہ لوگوں کا ہجوم تھا۔ جو ساحل پر کھڑے زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور گردنوں کے خشمگیں اشارے، ان کی آواز کا برابر ساتھ دے رہے تھے۔ دور سے معلوم ہوتا تھا کہ بلوہ ہو رہا ہے نزدیک پہنچے تو گمان ہونے لگا کہ وہ لوگ جملہ جہاز والوں کو غصے میں گالیاں دے رہے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد راز کھلا۔ کہ یہ لوگ بندرگاہ کے قلی ہیں اور آنے والے مسافروں کو اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔

ساحل پر جا بجا سرخ ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن پر تیل کی چکنائی اور میل نمایاں تھی۔

کپڑے بھی میلے کچیلے اور پھٹے پرانے تھے۔ شور و غل، ریل پیل، دھکم دھکا عام تھا۔ اس وحشت کو دیکھ کر بے ساختہ گھر کی یاد آ آتی تھی۔ پولیس کے سپاہی غیر معمولی طور پر موٹے تھے۔ اور گرمی کی وجہ سے اپنی وردیوں سے بیزار، یہ سپاہی زیادہ تر تپائیوں یا کھمبوں کا سہارا لئے اونگھ رہے تھے۔ جب بھی آنکھ کھلی تو یوں ہی کسی کو دھکا دے کر، کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کرکے اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برا ہو رہے تھے۔

یہاں رومن کیتھولک پادریوں کی منزل آ گئی تھی۔ اور وہ اپنا سامان اتروا کر بادلِ نخواستہ فرانسیسی نرسوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ پہلے انہوں نے نرسوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیر تک انہیں سہلایا۔ پھر بڑی بے صبری سے چٹاخ چٹاخ الوداعی بوسے لئے.....

اگر دوسرے مسافروں اور قلیوں کی نگاہیں بُری طرح ان پر نہ جمی ہوتیں تو یہ بزرگ نرسوں کو اپنے مقدس سینوں سے ضرور لپٹا لیتے۔

پادریوں نے طوعاً و کرہاً جہاز چھوڑا اور کسٹم ہاؤس کے دروازے تک جاتے جاتے کئی بار فرانسیسی نرسوں کی طرف مڑ مڑ کر دیکھا۔ جو اب اپنے ہینڈ بیگ کھول کر اپنے رخساروں کے پاؤڈر اور ہونٹوں کی لپ اسٹک کو از سرِ نو تازہ کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔ بوسے مقدس ہستیوں کے ہوں یا گنہگاروں کے، عورتوں کے پاؤڈر اور لپ اسٹک پر ان کا اثر ایک ہی سا ہوتا ہے۔

یہاں جہاز کو چند گھنٹوں کے لئے رکنا پڑا۔ مسافروں کو بیروت کا شہر دکھانے کے لئے ایک ٹورسٹ ایجنسی نے بہت سی ٹیکسیوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ جیسی شاندار ٹیکسیاں یہاں نظر آ رہی تھیں۔ ویسی موٹر کاریں غالباً یورپ کے بڑے شہروں کو بھی کم ہی نصیب ہوتی ہوں گی۔ فورڈ، شیو اور بیوک کے ماڈل عام تھے۔ کہیں کہیں کیڈلک کاریں بھی ٹیکسیوں کے طور پر چلتی نظر آتی تھیں۔ امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کے بعد بیروت ہی غالباً ایسا شہر ہے جس کی سڑکوں پر بیک وقت اس قدر نئی امریکی گاڑیاں چلتی ہیں۔

یوں بھی بیروت کے چہرے مہرے پر کئی قسم کا بین الاقوامی رنگ و روغن چڑھا ہوا ہے زبان اور آداب میں یہ شہر فرانسیسی ہے۔ موٹروں کے ماڈل، بُشرٹوں کے ڈیزائن اور ویو سٹوڈیو

ی ڈگریوں کے لحاظ سے امریکن ہے۔ ہوٹلوں کے کاروبار اور پُرفضا پہاڑی مقامات کی نسبت نہ صرف بیروت بلکہ سارا لبنان مشرقِ وسطےٰ کا سوئٹزرلینڈ ہے۔ اور جیسا کہ میرے ایک لبنانی دوست مصطفےٰ الفخری نے مجھے ہالینڈ میں بتایا تھا۔ بیروت کی نشاط گاہوں اور نائٹ کلبوں کو پیرس کی ہمسری کا بجا طور پر دعویٰ ہے۔ چنانچہ بہت سے عرب شہزادے جو اپنے ملک یا محلات میں شراب پینے سے معذور ہیں۔ اپنے پرائیویٹ ہوائی جہازوں میں یہاں جوق در جوق آتے ہیں اور راتوں رات داد عیش دے کر صبح سویرے اپنے فرائض منصبی پر واپس حاضر ہو جاتے ہیں۔ میری ٹیکسی کے ڈرائیور نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے وہ ہوٹل بھی دکھایا جس میں مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ سمیعہ جمال ٹھہری ہوئی تھی۔ ہوٹل کے دروازے پر سمیعہ جمال کی بہت بڑی تصویر آویزاں تھی۔ تصویر میں اس کے کھلے بال گھنگھور گھٹا کی طرح نظر آتے تھے۔ اور وہ اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے باہر چوک کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جہاں ایک پولیس کانسٹیبل بڑی مستعدی سے ٹریفک کنٹرول کرنے میں مصروف تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بڑے جذبے سے مطلع کیا۔ کہ اس چوک میں ہر تیس منٹ کے بعد ایک حادثہ ہوتا ہے۔ غالباً یہ لمحہ بھی حادثے والا تیسواں منٹ تھا۔ کیونکہ اچانک ہماری ٹیکسی نے پہلے ایک راہ گیر اور پھر بنفس نفیس خود چوک والے کانسٹیبل کو اپنی زد میں لینے کی سر توڑ کوشش کی۔ بیچارا راہ گیر تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا لیکن ٹریفک کانسٹیبل نے سیٹی بجا بجا کر ہمارا تعاقب کرنے کی تھوڑی بہت کوشش ضرور کی۔ لیکن ٹیکسی ڈرائیور نے ایکسلریٹر دبا کر رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور ہم خطرناک پہاڑی موڑوں کو کسی خاص معجزے کی مدد سے طے کرتے ہوئے ٹریفک کانسٹیبل اور سمیعہ جمال دونوں کی زد سے باہر نکل آئے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے معذرت کرتے ہوئے مجھے یقین دلایا کہ اس چوک میں ایسے حادثات کوئی خلاف معمول چیز نہیں ہیں۔ سمیعہ جمال کی آنکھوں میں ایسا جادو ہے کہ راہ گیر، ڈرائیور اور ٹریفک کانسٹیبل سب بیک وقت اسی کی طرف دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں اگر ٹریفک میں تصادم کے واقعات رونما نہ ہوں تو یہ انسان کی بڑی کور ذوقی ہو گی۔

بیروت کی سڑکوں پر حادثات کا رونما ہونا کچھ سمیعہ جمال کی سحر کار آنکھوں ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ ہم جہاں کہیں بھی جاتے تھے مجھے یہی احساس ہوتا تھا کہ ہم مسلسل حادثے کی ندیں

معلق ہیں۔ کھلی سڑکوں اور گنجان گلیوں میں ٹیکسی ایک ہی رفتار سے بھاگتی جارہی تھی۔ اس کی سپیڈ ستینیں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شاذ ہی نیچے گرتی تھی۔

کوٹ پتلون والے راہ گیروں کے درمیان تو ٹیکسی بڑے اطمینان سے ہارن بجاتے ہوئے گزر جاتی۔ لیکن عباؤں والوں کے درمیان ڈرائیور متذبذب ہو جاتا۔ ڈرائیور نے وضاحت کی۔ پتلون والے راہگیر کی ٹانگیں دُور سے واضح طور پر نظر آجاتی ہیں اور پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کدھر سے کدھر کو جا رہا ہے۔ اس کے برعکس عبا کے پیچھے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ راہ گیر آگے کی طرف جا رہا ہے یا پیچھے کی طرف۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ مغربی لباس کا یہ افادی پہلو اب تک میری نظر سے پوشیدہ تھا۔

امریکن یونیورسٹی کے قریب ایک فیشن ایبل ریسٹورنٹ کے قریب روک کر ڈرائیور نے مجھے ہدایت کی کہ کوئی خوش مذاق سیاح اس ریسٹوران میں بیئر کا گلاس یا چائے کی پیالی نوش کئے بغیر بیروت سے واپس نہیں جاتا۔ اپنی سیاحت اور خوش مذاقی کی لاٹ رکھنے کے لئے میں نے بھی اندر جا کر چائے کا آرڈر دے دیا۔

ریستوران میں زیادہ تر لوگ غیر ملکی تھے۔ اور غالباً وہ سب سیاح تھے۔ اور اپنی ٹیکسیوں کے ڈرائیوروں کی ہدایت کے مطابق اپنی خوش مذاقی کی داد لینے آئے تھے۔

ایک نوجوان بیرے نے مجھے چائے لا کر دی۔ اس کی مونچھیں باریک اور نوکیلی تھیں۔ سفید وردی میں ملبوس وہ کسی جاسوسی ناول کا ہیرو دکھائی دیتا تھا۔ جو بھیس بدل کر کسی گہرے راز کی تلاش میں ہوٹلوں کی ملازمت کر رہا ہو۔ چائے کا ٹرے میز پر رکھ کر وہ میرے پاس مؤدب کھڑا ہو گیا اور فرنچ نما انگریزی میں بولا۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں پاکستانی ہوں۔"

"مرحبا، مرحبا!" اس نے خوشی سے اپنے ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"اور آپ"؟ میں نے اخلاقاً پوچھا

"الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں"

بیرے کے اس بے ساختہ جواب نے مجھے چونکا دیا۔ عربوں کے متعلق مشہور ہے

کہ وہ سب سے پہلے عرب ہوتے ہیں۔ پھر شامی، لبنانی، عراقی یا مصری ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد مسلمان۔ لیکن تیکھی مونچھوں والا یہ نوجوان بیرا نہ صرف سب سے پہلے مسلمان تھا بلکہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر بغیر کسی حجاب کے خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا۔

"مجھے بھی مسلمان ہونے پر فخر حاصل ہے۔" میں نے کہا۔

"الحمدللہ۔ الحمدللہ!" بیرے نے پھر خوشی سے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے اخوان المسلمین کا نام سنا ہے کیا؟"

"اخوان کا نام کون نہیں جانتا؟" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی اسی تحریک کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔" بیرے نے فخر سے کہا۔ "ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کے بھائی اور خدمت گار ہیں۔"

"کیا آپ پاکستان کی فارن سروس میں ہیں؟" بیرے نے اچانک پوچھا۔

"جی نہیں" میں نے کہا "آپ کو یہ خیال کیوں آیا؟"

"مشرقِ وسطیٰ میں جو سیاح آتے ہیں۔ وہ اکثر سفارت خانوں کے افسر ہوتے ہیں یا وہ گرجوں کے پادری ہوتے ہیں۔ یا ان کا تعلق تیل کے چشموں سے ہوتا ہے" بیرے کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی آ گئی "سفارت خانوں سے وہ ہماری حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گرجوں کے ذریعے وہ ہمارے دین میں دخل دیتے ہیں۔ اور تیل کے چشموں سے وہ ہمارے پیٹ کو ٹٹول کرتے ہیں۔ پھر اس نے کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھا اور گردن جھکا کر سرگوشی میں کہنے لگا "ہم اخوان ایسے سیاحوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔"

باتوں ہی باتوں میں بیرے نے بتایا کہ اس ریستوران کا مالک ایک فلسطینی عیسائی ہے، اور یہاں کام کرنے والا ہر بیرہ اسے پانچ سے چھ پونڈ تک ہر ہفتہ تنخواہ دیتا ہے۔"

"بیرہ ریستوران کے مالک کو تنخواہ دیتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ تو الٹی بات ہوئی۔"

"یہاں یہ بات بالکل سیدھی ہے۔" بیرے نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ہمارا گزارا فقط گاہکوں کی بخشیش پر ہے۔ امریکن سیاح بہت زیادہ ہیں۔ وہ ہمیں اچھا ٹپ دیتے ہیں

اور ہمیں اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ریستوران کے مالک کی نذر کرنا پڑتا ہے۔"

چائے ختم کرکے میں نے بل طلب کیا۔

"آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ کا بل میں خود ادا کر دوں گا۔" بیرے نے بڑے خلوص سے کہا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ بیرے سے کہوں کہ بل نہیں تو مجھ سے کم از کم ٹپ ہی قبول کر لو۔ تاکہ ریستوران کے مالک کی تنخواہ میں کمی واقع نہ ہو۔ لیکن بیرے کی متانت اور خلوص کے سامنے مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

وہ مجھے باہر ٹیکسی تک چھوڑنے آیا۔

جب ٹیکسی روانہ ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا۔ کہ میں ریستوران کے ایک بیرے سے نہیں بلکہ دنیا کے ایک بڑے انسان، ایک رہنما، ایک بڑے مفکر سے مل کر آ رہا ہوں اس نوجوان بیرے میں ایک اچھے مبلغ کی صداقت اور ایک سچے مومن کی فراست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایسے سادہ اور پرکشش کردار میں نے بہت کم دیکھے تھے۔

بیروت کے مضافات میں چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کی آبادیاں جابجا پھیلی ہوئی تھیں ان میں فلسطین کے عرب مہاجر رہتے تھے۔ مہاجر کراچی میں ہوں یا بیروت میں۔ ان کے جھونپڑوں پر وہی کثافت اور چہروں پر وہی فلاکت برستی ہے۔ جس طرح کراچی میں۔ یہاں مہاجر بستیوں کے درمیان بڑی سرعت سے سیمنٹ کی بڑی بڑی عمارتیں بلند ہو رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح بیروت میں بھی فلسطینی مہاجروں کے ارد گرد بلند و بالا خوبصورت مکان تعمیر ہو رہے تھے۔

اور چند امریکی سیاح جوان جھونپڑیوں اور مکانوں کی تصویریں اتار رہے تھے بڑی گرم جوشی کے ساتھ عربوں کی سیاست پر بھی رائے زنی فرما رہے تھے۔

"خدا کی قسم!" ایک سیاح کہہ رہا تھا۔ "جس دن بھی ان جھونپڑے والوں نے اٹھ کر ان خوب صورت عمارتوں کو جلانا شروع کر دیا۔ تب سے مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کا غلبہ ہو جائے گا۔"

"ہائی جو! تم میرے پالتو خرگوش کے بچوں سے بھی زیادہ کوتاہ اندیش ہو۔" دوسرے

سیاح نے اپنے ساتھی کو پیار سے گالی دی۔ "کمیونزم آگ لگنے کا انتظار نہیں کرتا۔ کمیونزم کا راستہ تو اسی روز ہموار ہو گیا تھا۔ جب ان غلیظ جھونپڑیوں کے درمیان ان نامعقول عمارتوں کی بنیاد رکھی گئی تھی۔"

"تم دونوں کتیا کے بچے ہو" تیسرے امریکن نے فیصلہ صادر کیا۔ "جب تک یہاں اسلام کا جذبہ غالب رہے گا۔ کمیونزم کے آنے یا نہ آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

اسلام کا یہ کارآمد جذبہ کئی ڈھنگ سے غالب آتا ہے۔ نزہت کے پاس جو سگریٹ لائٹر تھا۔ اس پر نقرئی حروف میں کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا۔ بیروت، بغداد، دمشق اور قاہرہ میں ایسے سگریٹ لائٹر جابجا فروخت ہوتے ہیں۔ سفری ایجنسیاں اپنے ہدایت ناموں میں متنبہ کرتی ہیں۔ کہ مشرقی ممالک میں کچی سبزیاں۔ سلاد اور ٹماٹر نہ کھائیے۔ کیونکہ ان میں مہلک جراثیم ہوتے ہیں۔ اور کالے یا سفید رنگ کے چلتے پھرتے خیموں میں نہ جھانکیے۔ کیونکہ ان میں عورتیں ہوتی ہیں۔ جب تک مشرقی عورت خود آنکھ نہ لڑائے اس سے آنکھ نہ ملائیے۔ کیونکہ اس سے ان کا اخلاق تباہ ہو جاتا ہے۔ اور جب تک صاحب خانہ خود شراب نہ پیے اس کے سامنے شراب نہ پیجیے۔ کیونکہ اس سے ان کا مذہب بگڑ جاتا ہے۔......

بندرگاہ کے قریب ایک کھلا میدان ٹاٹ اور ٹین اور چٹائیوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میدان کے چاروں طرف لوہے کے خاردار تار کھنچے ہوئے تھے اور پولیس کے کچھ سپاہی پہرے پر مامور تھے۔ میدان میں سیکڑوں مرد اور عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح محصور تھیں۔ اور فضا میں دور دور تک بول و براز کی عفونت پھیلی ہوئی تھی۔ تمازت آفتاب میں یہ سارا میدان انگیٹھی کی طرح دہک رہا تھا۔ کچھ ضعیف عورتیں ایک چادر کو پانی میں تر کر کے بار بار اپنے چہروں پر مل رہی تھیں۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ لوگ فلسطین کے مہاجر نہیں ہیں۔ بلکہ یہ میدان حاجیوں کا کیمپ ہے جو حکومت نے خود اپنے خرچ سے قائم کر رکھا ہے۔ کئی کئی مہینوں تک دور دراز سے لوگ آ آ کر اس کیمپ میں جمع ہوتے رہتے ہیں، جو لوگ خوش نصیب ہیں انہیں ہوائی یا سمندری جہاز میں جگہ مل جاتی ہے، باقی لوگ۔ انتظار کر کے واپس چلے جاتے ہیں۔

ٹیکسی ڈرائیور کے اندازے کے مطابق (جو باقاعدہ اعداد و شمار پر مبنی تھا۔) کیمپ میں ایسے لوگ بھی تھے۔ جو دو دو تین تین چار چار سال سے بندرگاہ پر انتظار کرنے کے بعد بے نیل و مرام واپس جا رہے تھے۔ اگر علمائے کرام کو کراچی، بیروت یا قاہرہ کے حاجی کیمپوں کا تجربہ ہوتا تو بے شک وہ یہ فتوے صادر فرما دیتے کہ جو شخص ساحلِ سمندر پر تین سال انتظار کرنے کے بعد بھی واپس لوٹ جائے تو اسے ایک حج کا ثواب مل سکتا ہے۔

حاجی کیمپ کے ایک گوشے میں نماز عصر کی جماعت ہو رہی تھی۔ باقی دنیائے اسلام کی طرح اس کیمپ میں بھی حاجی زیادہ تھے اور نمازی کم۔ ایک بوڑھی عورت بڑے خشوع و خضوع سے سربسجود تھی۔ اس کی چادر میلی تھی۔ اور کرتے کا دامن پھٹا ہوا تھا۔ یوں اس سارے ماحول پر ایک ایسی المناک غربت اور صعوبت چھائی ہوئی تھی۔ یہاں پر انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہے کہ:-

"بے شک ہم تمہیں کچھ خوف اور بھوک سے، جان و مال اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے۔ صبر کرنے والوں پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خوشخبری دے دو کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے رحمتیں اور عنایتیں ہیں۔ اور یہی لوگ ہمت والے ہیں۔"

بیروت کا شمار بھی دنیا کے ان مہذب شہروں میں ہے۔ جہاں غریب ہونا تو کوئی جرم نہیں۔ البتہ بھیک مانگنا ضرور منع ہے۔ بندرگاہ کے باہر پولیس کا ایک سپاہی بید کی چھڑی گھما گھما کر بہت سے گداگروں کو منتشر کر رہا تھا۔ جو آتے جاتے سیاحوں پر بھوکی چیلوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ فلسطینی مہاجروں کا ایک خاندان سپاہی کی نظر بچا کر ایک کونے میں سہا کھڑا تھا۔ ظاہراً وہ دستِ سوال دراز نہیں کر رہے تھے۔ مگر ان کے چہرے اپنی زبانِ بے زبانی سے پکار پکار کر اپنی بھوک، اور اپنی بے بسی کی فریاد کر رہے تھے۔

اس خاندان کا ایک چھ یا سات سال کا لڑکا تھا۔ ایک نو سال کی لڑکی تھی۔ ان کی ماں ادھوری بہار کی طرح جسے وقت سے پہلے ہی خزاں نے پامال کر ڈالا ہو۔ وہ کبھی اپنے بچوں کی طرف دیکھتی تھی۔ کبھی راہگیروں کی طرف، اور کبھی اس سپاہی کی طرف جو بید کی چھڑی

گھما گھما کر جلد منگوں کو جھگا رہا تھا۔ مجھے رکتے ہوئے دیکھ کر وہ لڑکا میری طرف بڑھا اور بڑی لجاجت سے بولا "کیا آپ ہماری تصویر کھینچنا چاہتے ہیں؟"

جس طرح کراچی کے فقیر دیا سلائی یا بوٹ پالش کا سہارا لے کر بھیک مانگتے ہیں۔ اسی طرح فلسطین کے مہاجر تصویریں کھنچوا کر بخشش کی فریاد کرتے ہیں۔ ان کے خوبصورت خد و خال تیکھے تیکھے نقش اور اداس آنکھیں سیاحوں کے لیے بڑی جاذبِ نظر ہوتی ہیں۔ اور وہ ان کے فوٹو اتار کر فراخ دلی سے بخشش دیتے ہیں اور اس طرح اہلِ فلسطین پر اپنی ہمدردی منصف مزاجی اور غیر جانبداری کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔

تصویر کی فرمائش سن کر میرا جی چاہا کہ بچے کو اٹھا کر گلے سے لگا لوں اور کہوں میرے معصوم فرشتے ابھی خدا نے وہ مصور پیدا نہیں کیا۔ جو تیری تصویر کا حق ادا کر سکے۔ تیرے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ اس جلتی ہوئی دھوپ میں تیرے پاؤں ننگے ہیں۔ اور تیری سہمی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی خشک ہو چکی ہے۔ وہ تیری ماں ہے جسے قدرت نے شباب کی منزل سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر فریاد لرز رہی ہے لیکن سپاہی کے ڈر سے وہ اپنا منہ نہیں کھول سکی۔ یا شاید اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک غضب ناک بددعا تڑپ رہی ہے۔ جو اس نے اس ڈر کے مارے روک رکھی ہے کہ کہیں اس کی بددعا سے دنیا کا وہی حشر نہ ہو جو عاد اور ثمود اور نوح کی قوموں کا ہوا تھا۔ اور وہ تیری گڑیا سی بہن جس نے ایک ہاتھ سے ماں کا دامن تھاما ہوا ہے۔ اور دوسرے ہاتھ سے تمہیں واپس بلا رہی ہے تاکہ کوئی راہ گیر تمہیں زبردستی اٹھا کر نہ لے جائے اس ننھی منی کے پاؤں بھی ننگے ہیں۔ اس کے کپڑوں میں بھی سوراخ ہیں۔ اس کے سنہری بال ریشم کے الجھے ہوئے گچھوں کی طرح پریشان اور گھنگریالے ہیں۔ ان خوبصورت بالوں میں ریت کے ذرے ابرک کی طرح چمک رہے ہیں۔ اس کی پلکیں گھنی اور نوک دار ہیں۔ اور اس کی آنکھوں میں نیلی نیلی جھیلوں کی بے پناہ گہرائیاں خوابیدہ ہیں ــــــ اگر یہ بچی آسمان پر پیدا ہوئی ہوتی تو بے شک وہ جنت کی حور ہوتی۔ لیکن وہ اس بدنصیب زمین پر پیدا ہوئی ہے۔ اور یہی اسرائیل کے ناخنوں میں خدا کا یہ شاہکار بھوک سے مرجھایا ہوا ہے۔ خوف سے سہما ہوا ہے۔ بے گھر

ہے۔ بے سہارا ہے، بے مداوا ہے.....

اس بچی کی جلد زیتون کے تیل کی طرح تازہ اور شفاف ہے۔ اس کی رگوں میں جو خون گردش کر رہا ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کے چشموں کا پانی اور فلسطین کے پھولوں کی نکہت اور فلسطین کے انگوروں کا رس رچا ہوا ہے۔ اس لڑکی کے وجود میں یروشلم کی ان گنت صدیوں کے تقدس کی امانت پوشیدہ ہے۔ اس کی پرورش بڑے بڑے برگزیدہ پیغمبروں کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ اس کی تربیت میں آسمانی صحیفوں کا ہاتھ ہے۔ جو خدا نے اس ارضِ مقدس پر نازل فرمائے۔ اس لڑکی کے آباؤ اجداد ڈھائی ہزار سال سے فلسطین کی خاک میں دفن ہو رہے ہیں لیکن آج یہ لڑکی روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے ننگے پاؤں اور ننگے سر بیروت کی گلیوں میں پریشان حال ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو اچانک وہ گھر یاد آنے لگا ہے۔ جہاں سے دو ڈھائی ہزار سال قبل خدا نے انہیں نکال باہر کیا تھا۔ یہودیوں کا سب سے نیا صحیفہ BAL FOUR DECLARATION ہے۔ جو ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کی وزارت خارجہ کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اور جس میں بشارت دی گئی تھی کہ شاہ انگلستان کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے لئے ایک قومی گھر مہیا کرنے کے حق میں ہے۔ اور اس سلسلہ میں یہودیوں کی ہر ممکن مدد کرے گی.....

جس عقیدت مندی سے یہودی اس انسانی بشارت کی پیروی کر رہے ہیں۔ اگر اسی جذبہ سے انہوں نے اپنی الہامی کتاب توریت کو اپنایا ہوتا تو شاید بنی اسرائیل کو ان گنت صدیوں تک دربدر کی خاک نہ چھاننی پڑتی۔

اے بنی اسرائیل وہ دن یاد کرو۔ جب خدا نے تمہیں سارے جہان کے لوگوں سے بڑھایا تھا۔ جب خدا نے تمہیں قومِ فرعون کے پنجے سے چھڑایا تھا جو تمہیں بڑے بڑے دکھ دیتے تھے۔ تمہارے بچوں پر تو چھری پھیرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو اپنی خدمت کے لئے زندہ رکھتے تھے۔ جب خدا نے تمہارے لئے دریا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور تم کو بچا کر فرعون کے آدمیوں کو تمہارے دیکھتے دیکھتے ڈبو دیا۔ جب خدا نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا۔ جب موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی پتھر پر ماری اور اس میں سے تمہارے لئے

پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔

اے بنی اسرائیل! وہ دن بھی یاد کرو۔ جب خدا نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم حق کے ساتھ باطل کو نہ ملاؤ گے۔ اور خدا کی آیات کو سستے داموں نہ بیچو گے۔ لیکن تم نے یہ وعدہ ایفا نہ کیا اور تم نے بڑی ہٹ دھرمی سے بچھڑے کو اپنا خدا بنا لیا۔ تم نے من و سلویٰ کی نعمت سے اکتا کر ساگ پات، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز کی فرمائش کی۔ اپنی اکڑ میں آ کر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹلایا اور بعض کو جان سے مار ڈالا۔ اور خدا نے تمہاری نافرمانیوں کی پاداش میں کبھی تم کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کا حکم دیا۔ کبھی تمہیں آسمانی بجلی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کبھی تم راندۂ درگاہ ہو کر بندر بنا دیئے گئے۔ کبھی تمہارے سر پر طور کا پہاڑ لٹکا دیا گیا......

اے بنی اسرائیل بے شک تمہارے دل پتھر ہو چکے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت کیونکہ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور پانی رسنے لگتا ہے۔

اے بنی اسرائیل آج تمہاری نسل بھی اسی طرح مسخ ہو چکی ہے جس طرح کہ تم نے خدا کے کلام توریت کی شکل بدل دی تھی۔ تمہاری رگوں میں لہو گردش کر رہا ہے۔ اس میں اسرائیلی خون کی آمیزش بہت ہی کم ہے۔ ہزاروں سال سے تم دنیا کے گوشے گوشے میں مارے مارے پھر رہے ہو۔ اور تمہاری نسل دوسری قوموں میں خلط ملط ہو کر اب اپنی امتیازی حیثیت نہیں رکھتی۔ یوں بھی تم نے خدا کے رسولوں کی جگہ اب امریکہ اور انگلستان میں اپنی مرضی کے پیغمبر تلاش کر رکھے ہیں اور تمہاری موجودہ توریت MANDATE KA BAL FOUR DECLARATION ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اس عرب بچی کا سہاگ اور اس کی غمزدہ ماں کی دبی دبی آہ تمہارے سر پر کوہ طور سے بھی زیادہ خطرناک پہاڑ کی طرح لٹک رہی ہے۔ اس معصوم بچے کی بے بس نگاہوں تلے غضبناک اور قہرناک بجلیاں تڑپ رہی ہیں۔ اگرچہ آجکل بندر بنانے کا رواج عام نہیں ہے۔ لیکن اگر خدا اپنی بات کا سچا ہے تو تم امریکہ اور انگلستان میں ڈھلے ہوئے سونے اور چاندی کے بچھڑوں کی جس قدر چاہو پوجا کر لو۔ لیکن عذاب کا جو چکر تمہارے پاؤں میں پڑا ہوا ہے۔ اس سے تمہیں نجات نہیں مل سکتی۔

قتیل شفائی

غزل

وہ بچارے جو کبھی پیار کی بازی ہارے
دربدر خاک بسر پھرتے ہیں مارے مارے

آنے والے کی مہک بھی تو ہواؤں میں نہیں
میری پلکوں سے مگر جھانک رہے ہیں تارے

اُف وہ آنسو جو بہائے دمِ رخصت اس نے
میری جھولی میں کوئی ڈال گیا انگارے

چُپ لگی رہتی لبوں پہ تو نہ بہتے آنسو
چھٹ گیا درد کا بادل ، نکل آئے تارے

کیا خبر حال مرا کیا ہو سحر ہونے تک
آج کی رات نہ جا چھوڑ کے مجھ کو پیارے

زندگی اپنی گنہ گارِ محبت ہی سہی
کون ایسا ہے جو پہلا اسے پتھر مارے

ربط اتنا نہ بڑھا اُس بُتِ کافر سے قتیلؔ
مار ڈالیں گے تجھے مل کے مسلماں سارے

مرزا ادیب

ایک رات

کردار ۔ بچی، لڑکا، لڑکی، عورت، نووارد، اجنبی

منظر

ایک ایسا کمرہ جسے کمرے کی بجائے کوٹھڑی کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور جہاں تک سامان کا تعلق ہے۔ اس کوٹھڑی کی کل کائنات ایک چٹائی۔ ایک مونڈھا اور ایک چارپائی ہے۔ چٹائی سامنے کی ایک دیوار کے ساتھ بچھی ہے اور اس کے آخری سرے پر چارپائی کھڑی کی گئی ہے۔ اس کا ایک پایہ غائب ہے۔ اور اب اس کا مصرف یہ ہے کہ اس کے ایک پایے سے لالٹین لٹکا دی جاتی ہے اس وقت بھی اس کے پایے کے ساتھ لالٹین لٹکی ہوئی ہے۔ جس کی روشنی فضا میں پھیلی ہوئی ہے ——

چارپائی کے پاس سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی بھی ہے جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے ہیں۔ مونڈھا چارپائی کے نیچے نظر آ رہا ہے —— دروازہ مغربی دیوار میں ہے

اور اس وقت اس کے دونوں پٹ بند ہیں۔ وقت جون یا جولائی کی رات کا ابتدائی حصہ ہے۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور اس میں ایک بچی۔ روتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ بچی پانچ چھ برس کی ہے۔ لباس پاجامہ اور کرتہ ——— بچی چٹائی کے قریب پہنچ چکی ہے کہ لڑکی آتی ہے۔ عمر انیس کے لگ بھگ، قمیض شلوار اور دوپٹے میں ملبوس، وہ بچی کے پاس آ کر اسے گود میں اٹھا لیتی ہے۔ اور اس کا سر اپنے شانے سے لگا دیتی ہے۔ بچی بدستور رو رہی ہے ——— ایک لڑکا آتا ہے۔ دس گیارہ برس کا، پاجامہ اور قمیض پہنے ہوئے۔ لڑکی کے پاس آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ جنہیں وہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے ان کی نمی پونچھتا ہے۔ لڑکی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔ جیسے دلاسا دے رہی ہو ——— ایک دروازے پر عورت آتی ہے۔ لباس وہی جو لڑکی کا ہے صحت بھی ویسی ہی۔ پینتیس کے قریب سن۔ کمزوری کی وجہ سے کافی بوڑھی نظر آتی ہے ——— عورت لڑکی کی گود سے بچی لے کر اپنی گود میں اٹھا لیتی ہے۔ اور چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے ——— دروازے کے دوسری طرف سے مسلسل شور سنائی دے رہا ہے۔ جیسے برتنوں کو گرایا جا رہا ہے۔ ٹرنکوں اور صندوقوں کو گھسیٹا جا رہا ہے اور کنستروں کو ایک دوسرے کے اوپر پھینکا جا رہا ہے۔ لڑکی بھی چٹائی پر بیٹھ جاتی ہے۔ لڑکا ابھی وہیں کھڑا ہے۔

شور ختم ہو جاتا ہے۔ مگر تین چار لمحوں کے بعد ایسی آواز آتی ہے۔ جیسے چینی کے برتن زمین پر گر پڑے ہوں۔ عورت اور لڑکی —— دونوں ایک دوسری کو دیکھتی ہیں۔ پھر ان کی نگاہیں دروازے کی طرف جاتی ہیں —— عورت بچی کو چھپانے لگتی ہے۔ لڑکی یونہی خلا میں دیکھ رہی ہے —— بچی گود سے اترنے کی کوشش کرتی ہے —— عورت اسے روکتی ہے۔

عورت: ننھی!

بچی اپنے آپ کو چھڑانے کے ارادے سے اپنا پاؤں زمین پر رکھ دیتی ہے۔ عورت اسے چھوڑ دیتی ہے۔ بچی دروازے کی طرف جاتی ہے اور وہاں پہنچ کر رک جاتی ہے۔ شاید سوچ رہی ہے کہ ادھر جائے یا نہ جائے۔

لڑکی۔ اماں! ادھر جا رہی ہے۔

عورت۔ ننھی! میری بچی آجا —— آجا!

لڑکا آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ بچی جلدی سے ہاتھ چھڑا لیتی ہے۔ دوسری طرف دیکھتی ہے۔ پھر بھاگ کر ماں کی گود میں گر پڑتی ہے۔ لڑکی کا زرد چہرہ سہما ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عورت دروازے پر نظریں جما دیتی ہے۔ جیسے ابھی کوئی آجائے گا —— لڑکا چٹائی کے پاس زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی نظریں بھی دروازے پر لگی ہیں —— دو تین لمحے گزر جاتے ہیں۔ دروازے پر کوئی نہیں آتا ——

بچی پھر گود سے نکلنے لگتی ہے!

لڑکا۔ دیکھا اماں! پھر جا رہی ہے۔

عورت کیا کر رہی ہے۔ ننھی کدھر جائے گی!

(بچی کوئی جواب نہیں دیتی۔ دروازے پر جاتی ہے۔ آگے جانے سے

قدم اٹھانے ہی لگتی ہے کہ اُدھر کوئی بھاری چیز دھم سے زمین پر گرتی ہے بچی خوفزدہ ہو کر بھاگتی ہے اور لڑکی سے آکر لپٹ جاتی ہے ——— لڑکا یکایک سسکیاں بھرنے لگتا ہے ——— عورت اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہے)

لڑکی ۔ امّاں!

عورت ۔ نہ رو بیٹا! رونے سے کیا بنے گا؟ نہ رو۔ ماں صدقے۔ کیوں جان کھوتا ہے (لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ وہ منہ پھیر لیتی ہے)

لڑکا ۔ میری گھڑی۔

عورت اپنی گھڑی کو رو رہا ہے! گھر میں کچھ رہا بھی ہے؟

بچی ۔ میری گڑیا کا گھر۔

(لڑکا اور بچی ——— دونوں اٹھ کر دروازے پر پہنچتے ہیں۔ برتنوں کے گرنے کا شور بلند ہوتا ہے۔ دونوں وہیں رک جاتے ہیں)

لڑکی ۔ (دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے) اماں سارے کے سارے برتن لے جا رہا ہے ——— اب کیا ہوگا؟"

(عورت کوئی جواب نہیں دیتی۔ صرف آہ بھرتی ہے۔ بچی بھاگ آتی ہے۔ لڑکا نگاہیں دروازے کی دوسری طرف ٹکی پہ جمائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ہٹتے ہٹتے مشرقی دیوار سے جا لگتا ہے ——— عورت اٹھ کر جاتی ہے۔ لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اسے چٹائی پہ لے آتی ہے۔ لالٹین کی روشنی کسی قدر مدھم ہو گئی ہے اور وہ ذرا ذرا لرزنے بھی لگتی ہے۔ باہر بادل گرجتا ہے۔ تین چار لمحے گزر جاتے ہیں۔ دروازے پہ کوئی نہیں آتا ——— ایسی آواز آتی ہے۔ جیسے دو تین تانگے جاتے لگے ہوں)

لڑکی ۔ اماں! اب کیا ہوگا؟

عورت - اب کیا ہوگا؟ اللہ جانے۔ اب کیا ہوگا۔ کیا نہیں ہوگا۔

(تانگوں کی آواز دور جاتے جاتے ختم ہو جاتی ہے۔ اب دوسری طرف کوئی شور سنائی نہیں دیتا۔ بچی دروازے پہ جاتی ہے —— ایک لمحے کے لئے رکتی ہے۔ پھر دوسری طرف چلی جاتی ہے —— تینوں دروازے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں ——————

دو تین لمحوں کے بعد بچی آتی ہے۔ ہراساں اور خوفزدہ۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چٹائی کے پاس جا کر ٹھہر جاتی ہے)

لڑکا - ننھی!

عورت - کیا لینے گئی تھی اُدھر؟

لڑکی - اب وہاں کیا ہے؟

عورت خاک بھی نہیں۔ (پیشانی پہ ہاتھ مارتی ہے) اچھا میرے اللہ۔

(بچی آگے بڑھتی ہے اور مونڈھے پہ بیٹھ جاتی ہے —— لالٹین کی روشنی اور مدھم ہو گئی ہے۔ بادل کی گرج سنائی دیتی ہے۔ پھر سناٹا چھا جاتا ہے۔ تین چار لمحے یہی عالم رہتا ہے۔ —— دور سے گھڑیالی کی آواز آتی ہے۔ نو بجے ہیں۔ آخری گونج پر دروازے پہ ایک شخص آتا ہے —— چاروں اسے دیکھنے لگتے ہیں۔ نووارد آگے آتا ہے رکتا ہے۔ پھر آگے بڑھنے لگتا ہے)

نووارد - (عورت سے) فاطمہ! غوثے نے کہا ہے

عورت - گھر میں کچھ رہ گیا ہے۔ جو اب تجھے بھیجا ہے۔

نووارد - میں کچھ لینے کے لئے نہیں آیا۔ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ سنانے کے لئے آیا ہوں۔ تیرے گھر والے نے کہا ہے۔ آج میری آخری بازی ہے۔ جیت گیا تو ہزاروں روپے لے کر آؤں گا۔ ہار گیا تو تمہارا خدا حافظ۔ میں اس گھر میں کبھی نہیں آؤں گا۔ رات کے بارہ بجے تک نہ آیا تو پھر مجھے بھول جانا ہمیشہ کے لئے۔ (سب کے سب ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہے ہیں) پردہ

غونشا ضرور جیت لے گا بازی - اب تک بیچارا ہارتا رہا ہے - نوٹوں کا تھیلا بھر کر لائے گا۔ (ہاتھ پھیلا کر) یہ بڑا تھیلا - اگلی پچھلی کسر نکل جائے گی۔ (نووارد مڑتا ہے - دروازے پر جاتا ہے)

دعا کرنا نانی حلیمہ - (نووارد دروازے سے نکل جاتا ہے)

بچی - تھیلا اماں! روپوں سے بھرا ہوا -

لڑکا - اماں - ابا بازی جیت لے گا تو کتنا اچھا ہوگا - میری گھڑی -

لڑکی - تجھے اپنی گھڑی کی پڑی ہے —— سب کچھ مل جائیگا - ہیں -

بچی - اللہ! میرا ابا تھیلا بھر کر لائے - اچھا میرے اللہ -

(عورت بچی کو دیکھ رہی ہے - لڑکی نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلا رکھے ہیں —— لالٹین کی روشنی اب فضا میں ایک مختصر سا دائرہ بن کر رہ گئی ہے — چاروں کے چہرے صاف طور پر نظر نہیں آتے - بادل کی گرج اور ہوا کی سائیں سائیں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ —— دور سے کلاک کی آواز آتی ہے۔ مگر معلوم نہیں ہوتا کہ اس وقت کتنے بجے ہیں - کلاک کی باقی آواز بادل کی گرج میں ڈوب جاتی ہے۔ —— ہوا کے جھونکوں سے لالٹین جل رہی ہے —— روشنی کے ایک مختصر سے دائرے کے سوا سبھی پر اندھیرا ہے —— دروازے پر ایک سایہ آتا ہے، چارپائی تک جاتا ہے - لالٹین اٹھا لیتا ہے - لالٹین کی روشنی بڑھ جاتی ہے - یقیناً آنے والے نے اس کی بتی اونچی کر دی ہے - آنے والے کا چہرہ نظر نہیں آتا - اور آخر تک نظر نہیں آئے گا - اس کا رخ سامنے کی دیوار کی طرف رہے گا۔ —— اس نے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا تھیلا اٹھا رکھا ہے —— لالٹین کی روشنی سب سے پہلے بچی کے چہرے پر پڑتی ہے - بچی مونڈھے پر نیم دراز ہے - پشت دیوار سے لگا رکھی ہے - آنکھیں بند ہیں)

اجنبی - ننھی (لہجے میں محبت اور شفقت) میری ننھی -

(بچی آنکھیں ملتی ہے اور اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے)

میری بچی! دیکھ میں تیرے لیئے کیا لایا ہوں - کتنے پیارے کھلونے ہیں - (اجنبی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک نہایت خوبصورت موٹر نکالتا ہے - اور بچی کے ہاتھ میں دے دیتا ہے) یہ لے یہی موٹر ہے نا، جو خان صاحب نے اپنی بچی عذرا کو اس کی سالگرہ پر دی تھی - ہے نا یہی موٹر اور لے -

(اجنبی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک ہوائی جہاز نکالتا ہے)

اسے تو نے انار کلی میں ایک ایسے بچے کے پاس دیکھا تھا جو موٹر میں بیٹھا تھا - گھر آکر تو نے اس کھلونے کی دیر تک تعریف کی تھی - یاد ہے نا -

(اجنبی ہوائی جہاز بچی کو دے دیتا ہے - تھیلے میں سے ایک رنگین فراک نکالتا ہے)

اور یہ ہے فراک تیرے لیئے اور چاکلیٹ کا ڈبہ بھی لے -

(تھیلے میں سے چاکلیٹ کا ڈبہ نکال کر بچی کو دیتا ہے)

اب تو خوش ہے نا -

(بچی یہ چیزیں لے کر اچھلتی کودتی اندھیرے میں چلی جاتی ہے - لالٹین کی روشنی لڑکے کے چہرے پر پڑتی ہے - جو چٹائی کے پاس زمین پر سو رہا ہے - اجنبی اس پر جھکتا ہے -)

افضال! میرے بچے!

(لڑکا اٹھ بیٹھتا ہے)

افضال بیٹا! تجھے بڑی تکلیف ہوئی ہے آج - میں تجھ سے وہ گھڑی لے گیا تھا - جو تجھے ماموں نے انعام کے طور پر دی تھی - لیکن میں تیرے لئے اس گھڑی سے خوبصورت اور بہت اچھی گھڑی لے آیا ہوں - یہ لے -

(اجنبی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر گھڑی نکال کر لڑکے کو دیتا ہے)

صرف یہی نہیں اور بھی کچھ لایا ہوں تیرے لئے -

(اجنبی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک فٹ بال نکالتا ہے - فٹ بال اسے

دیتا ہے۔ پھر نوٹوں کا ایک بنڈل بھی اسے دیتا ہے)

جس طرح جی چاہے انہیں خرچ کر۔ یہ مال جیب میں ڈال کر انارکلی میں چلا جا آج تیری ساری حسرتیں پوری ہو جائیں گی۔

(لڑکا یہ چیزیں لے کر مسکراتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔ اب روشنی لڑکی کے چہرے پر پڑتی ہے)

صفو! میری صفو!

(لڑکی اٹھ بیٹھتی ہے)

تو نے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ مگر اب جو کچھ ہوگا۔ بہت اچھا ہوگا۔ اب تجھے بالکل فکر کی ضرورت نہیں۔ تیرا جواری باپ اب سچا باپ بن گیا ہے۔

(لڑکی ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہی ہے)

دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں۔

(اجنبی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک ساری لڑکی کو دے دیتا ہے)

اور یہ لے زیورات۔

(تھیلے میں سے ایک ڈبہ نکال کر لڑکی کو دیتا ہے)

اور یہ سنگار دان میری صفو کا۔

(تھیلے میں سے سنگار دان نکال کر لڑکی کو دیتا ہے۔ لڑکی مسکراتی ہے اور اندھیرے میں چلی جاتی ہے۔ اب روشنی عورت کے چہرے پر پڑتی ہے)

فاطمہ!

(عورت اٹھ بیٹھتی ہے)

فاطمہ میں نے آخری بازی جیت لی ہے۔ اتنا روپیہ لے آیا ہوں کہ تیری ساری حسرتیں پوری ہو جائیں گے۔ آج میں گھر کا سب کچھ لے گیا تھا۔ کیا کرتا جوئے کے لئے کس طرح روپیہ پورا کرتا۔ اللہ نے فضل کیا ہے۔ میں نے بازی جیت لی ہے۔ اب کبھی جوا نہیں کھیلوں گا۔ یہ میری آخری بازی تھی۔ ساری عمر اسی بازی کے لئے ہارتا رہا تھا۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔ بگڑا ہوا گھر بن جائے گا ہم نیا

مکان خریدیں گے۔ نیا سامان بازار سے لائیں گے۔ تم صفو کا جہیز بنانا۔ پھر ایک دن اپنے لڑکے کے سر پر سہرا دیکھ لینا۔ تو اب مالدار ہو گئی ہے فاطمہ! جو رشتہ دار تجھ سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اب تیری راہ میں آنکھیں بچھائیں گے۔ یہ نوٹ ہی نوٹ۔

(اجنبی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کے بہت سے بنڈل نکالتا ہے۔ اور ایک ایک بنڈل عورت کے ہاتھ میں دینے لگتا ہے)

یہ لے ایک ہزار —— دو ہزار —— سات ہزار —— دس ہزار —— پندرہ ہزار

(اجنبی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اور بنڈل نکالتا ہے)

بیس ہزار —— پچیس ہزار —— تیس ہزار —— پینتیس ہزار —— اب تو خوش ہے فاطمہ!

(عورت نوٹوں کے بنڈل جھولی میں ڈال کر مسکراتی ہے اور اندھیرے میں چلی جاتی ہے۔ اجنبی لالٹین وہیں پائے سے لٹکا دیتا ہے۔ بادل کی گرج کے ساتھ ہی لالٹین کی روشنی مدہم ہو کر پھر پہلی جیسی ہو گئی ہے —— اجنبی اندھیرے میں گم ہو چکا ہے —— دو تین لمحوں کے لئے سناٹا چھا جاتا ہے کلاک کی آواز آتی ہے —— ایک —— دو —— تین —— ہوا کے جھونکوں سے لالٹین ہلتی ہے —— روشنی کا ایک مدھم سا حلقہ ایک ایک لمحے کے لئے بچی، لڑکے، لڑکی اور عورت کے چہروں سے گزر جاتا ہے۔ سب کے سب سو رہے ہیں۔ بادل پھر گرجتا ہے۔ اور اس کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔

وزیر آغا

عفریت

یہاں۔ خشک ندیوں کی سوکھی زبانیں
بجھی بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹی ہوئی ہیں
برہنہ درختوں کے نیچے
ہزاروں کی تعداد میں سوکھے پتّے
اندھیرے کی ننگی نگاہوں سے ڈر کر
عجب بے بسی سے
خنک ریت کی کالی چادر پہ اوندھے پڑے ہیں!
مری ڈوبتی سانس کہتی ہے مجھ سے
کہاں ہے ترے دل کی اندھی گپھا جس سے تو آشنا تھا
کہاں ہے وہ چٹیل سا صحرا
جسے تو نے اندھی گپھا میں مقید کیا تھا
جسے بے نشاں سی "مسافت" کا طعنہ دیا تھا؟
وہ چٹیل سا صحرا (تری ذات کا گھُپ اندھیرا)
کسی کالے جادو کی بوتل سے باہر نکل کر
بجھی بانجھ دھرتی کی صورت تری کور آنکھوں کے آگے
اگر آج پھیلا ہوا ہے
تو یہ تیری اپنی خطا ہے!
عجب ماجرا ہے
اندھیرے کی ننگی نگاہیں مجھے گھورتی ہیں
بجھی بانجھ دھرتی کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہوں!!

وزیر آغا

کچھ ضرب المثل کی مخالفت میں

عام دستور تو یہ ہے کہ ادھر قیامت کا ذکر چھڑا اور ادھر کھٹ سے بات ان کی جوانی تک پہنچی لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ بات جوانی کی چھڑی اور پھر گویا قیامت ہی آگئی۔

اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

"ہائے ہائے" کا امید افزا اور دلکش نعرہ خاص طور پر اس لئے اہم ہے کہ اس سے جوانی کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلی صورت میں "جوانی" ان کی تھی اور قیامت کی جملہ صفات اپنی تھیں۔ دوسری صورت میں جوانی اپنی ہے اور قیامت کی تمام قیامت خیزیاں ان کی ہیں۔ پہلی صورت قدرے خطرناک ہے کہ اس میں مبتلا ہو کر آپ سب کچھ کر گزرنے پر تل جاتے ہیں۔ لیکن دوسری صورت میں بات یادوں کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی چندیا پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہیں اور وہاں آپ کو بالوں کے نشیب و فراز کی بجائے صحرا کی چٹیل سطح کا احساس ہوتا ہے یا آپ اپنے گالوں کو تھپتھپاتے ہیں اور آپ کی ہتھیلی میں رخسار کی نوکیلی ہڈی چبھ جاتی ہے تو آپ حسبِ قاعدہ "ہائے ہائے" کا دلفگار نعرہ لگا کر صبر شکر کر لیتے اور پھر سے اپنی ذات کے خول میں سمٹ جاتے ہیں۔ لیکن

جوانی کا ذکر ہمیشہ اس قدر سطحی نہیں ہوتا۔ مثلاً میرے دوست جناب ع۔ج جب ان ایام کا ذکر کرتے ہیں۔ جب آتش جوان تھا (اور حق یہ ہے کہ ان کے ہاں آتش کچھ ضرورت سے زیادہ ہی جوان تھا)، تو کبھی کبھی جوانی کی "لذت کوشیوں" اور جسم کی کیف سامانیوں سے دامن چھڑا کر جوان کی آتش بغاوت اور گرمیٔ گفتار کا بھی ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ اور دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر وہ خلق خدا کی عام سطح سے اوپر اٹھ آتے ہیں جناب ع۔ج کے ہاں جوانی کے ذکر کی ابتدا بڑے روائتی انداز میں ہوتی ہے۔ وہ اپنے پاؤں اٹھا کر مونڈھے کے کنارے پر رکھ لیتے ہیں اور بات بڑھا کر ان پر جمی ہوئی صدیوں کی میل کو بڑی چابکدستی سے اتارتے، لمبی لمبی موم بتیوں میں ڈھالتے اور اپنے اس عمل کے ساتھ ساتھ وقت کے دبیز پردوں کو نوچ کر الگ کرتے اور ان کے نیچے سے پوٹلیوں میں بندھی ہوئی جوانی کی یادوں کو نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ "جوانی کے دن بھی کیا دن تھے۔ پتھر کی مورتی کو بھی پیار کرنے کو جی چاہتا تھا" خوفزدہ ہو کر چاروں طرف دیکھتے ہیں اور پھر "بڑی کڑیل جوانی تھی ہماری! جو کھاتے تھے فی الفور ہضم ہو جاتا تھا۔ آم کے موسم میں تو کپڑے اتار کر زمین پر بیٹھ جاتے تھے اور اس قدر آم کھاتے تھے کہ گٹھلیوں کا انبار ٹھوڑی کو چھونے لگتا تھا —— دو دو من وزنی مگدر اٹھا کر شعر کہتے تھے" وغیرہ وغیرہ لیکن کبھی کبھی ان روائتی باتوں کے عین درمیان وہ کوئی بڑی گہری بات بھی کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً کل شام اپنی جوانی کا ذکر کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھے "واہ کیا جوانی تھی ہماری بھی! قسم لے لو جو کبھی کسی بزرگ کی نصیحت پر ہم نے عمل کیا ہو" ان کی اس بات پر میں چونک اٹھا اور پہلی بار مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ حضرت ع۔ج تو خاصے ذہین آدمی ہیں اور یہ کہ انہیں فلسفے سے ایک فطری لگاؤ بھی ہے —— نصیحتاً جوانی کے ایام میں کون کسی کی سنتا ہے۔ لیکن یہی "کون" جب جوانی کے لالہ زاروں کو عبور کر آتا ہے تو بڑے فخر سے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہتا ہے —— برخوردار ہم تو اپنے بزرگوں کی ہر بات سنتے تھے۔ سبحان اللہ کیا دن تھے!" دراصل نصیحت یا ضرب المثل کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ ہر قسم کی رکاوٹ یا ردعمل

کو پسِ پشت ڈال کر بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہو جاتی ہے۔ جوانی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ اس نے اس عارضے کی نفی کر دی لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس کے جراثیم بڑی آہستگی سے اس کے خون میں داخل ہوتے اور وہاں بڑی خاموشی سے اپنی جڑیں مضبوط کرتے رہتے ہیں۔ ادھر جوانی کا خون سرد پڑا، چند یا پر سے بال اڑے دانتوں نے لڑکھڑا کر الوداع کہی اور ادھر جسم کے اندر چھپا ہوا یہ عفریت مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا برآمد ہو گیا۔ تاریخ اپنے اوراق الٹتی ہے۔ نسلیں ابھرتی اور ڈوبتی ہیں، افراد پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں۔ لیکن نصیحت یا ضرب المثل کا علم ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ اسے کبھی فنا نہیں :-

نصیحت کو تو میں پھر بھی قابلِ عفو سمجھتا ہوں۔ لیکن ضرب المثل سے مجھے چڑ ہے۔ نصیحت میں کم از کم وہ زہر خند نہیں ہوتا۔ جو ضرب المثل سے خاص ہے۔ نصیحت کرنے والا ایک بے حد معصوم انسان ہوتا ہے جو نصیحت کرنے کے دوران اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرتا کہ اس کا یہ عمل از سرتا پا ایک سعیٔ لاحاصل ہے خود اپنی جوانی کے ایام میں اس نے کب کسی کی نصیحت کو کوئی اہمیت دی تھی کہ اب اس کے برخوردار اسے اہمیت دینے لگیں؟ تاہم چونکہ رسمًا اور اخلاقًا اسے اس عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس لئے با دلِ نخواستہ وہ گزرتا ہے اور نصیحت وصول کرنے والا سپورٹس مین شپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی عقیدت سے اس نصیحت کو وصول کر کے سرخرو ہو جاتا ہے۔ اور بس! اس سے نہ تو آج تک نصیحت کرنے والے کو کوئی صدمہ پہنچا اور نہ نصیحت سننے والے کو! صدمے کے فقدان کی بڑی وجہ بھی یہ ہے کہ اس کھیل کے دونوں اداکار کھیل کے مزاج سے واقف ہیں اور اس سے کوئی ایسی توقع وابستہ نہیں کرتے جس کے فسخ ہونے پر انہیں کوئی صدمہ پہنچے۔ گویا نصیحت کے عمل میں نیک نیتی، مروّت اور روایت کا تحفظ مقصود ہوتا ہے۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ نصیحت اثر کرے اور نصیحت وصول کرنے والا اس پر عمل کرنے کی حماقت کا مرتکب بھی ہو۔ نصیحت تو وزن کے ٹکٹ کے مانند ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر دوسرا ٹکٹ آپ کو نہ صرف مختلف وزن بتائے گا بلکہ آپ کی تقدیر کے سلسلے میں بھی ہر بار مختلف قیاس

آرائی کا مرتکب ہوگا۔ لیکن ریل کے سفر کی روایات کے احترام میں آپ بڑی عقیدت سے لوہے کے ایک مختصر سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اپنے وزن کا ٹکٹ حاصل کرنے کا ایک مضحکہ خیز فریضہ سر انجام دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے۔ بالکل اسی طرح کسی بزرگ کے پوپلے منہ سے نصیحت کے چند بے ضرر جملے سن لینے میں کیا ہرج ہے؟ مجھے وہ نوجوان ایک آنکھ نہیں بھاتے جو نصیحت کی انسٹی ٹیوشن سے عدم واقفیت کی بنا پر جھلاہٹ اور برہمی کا مظاہرہ کرتے اور نصیحتوں کی یلغار کی صورت میں اپنے بزرگوں سے الجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے!۔

نصیحت ایک قطعاً بے ضرر اور معصوم سا عمل ہے۔ جب کوئی کہتا ہے ؎

نانک ننھے ہو رہو جیسی ننھی دوب
یا
"بیٹا" ایسی پریت کر جیسی برچھ کرے
اپنے اوپر دھوپ سہے اوروں کو چھاؤں دے

تو اس سے یہ مراد لینا بالکل غلط ہے کہ کہنے والے نے بڑی سنجیدگی سے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ صبح اٹھتے ہی چوراہے میں جا کر لیٹ جائیں اور جب ٹریفک کا سپاہی آپ کو اٹھانے کی کوشش کرے تو مسکرا کر

نانک ننھے ہو رہو جیسی ننھی دوب

کے ورد سے اس کا سواگت کریں۔ یا پھر درختوں کی قطار میں جو جگہ آپ کو خالی نظر آئے وہاں نقلی چوکیدار کی طرح کھڑے ہو کر اپنے سائے سے خلقِ خدا کو آرام بہم پہنچانے کی احمقانہ حرکت کے مرتکب ہوں۔ نصیحت کا جذبہ اگر واقعتاً سنجیدہ ہوتا اور یہ "خود اعمال" کا قافلہ اس پر اسی سنجیدگی سے عمل پیرا ہوتا تو آج چوراہے کا سارا ٹریفک معطل اور صنعت شجرکاری کی ساری روایت ختم ہوگئی ہوتی۔ لیکن شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور ابھی اس جہانِ رنگ و بو میں کچھ رنگ اور بو باقی ہے۔ تاہم نصیحت کا سارا عمل جذبے کی معصومانہ ذہنیت کا غماز ضرور ہے اور اسی لئے میں نصیحت کو کچھ زیادہ برا نہیں سمجھتا لیکن ضرب المثل!

ضرب المثل کے تو ذکر ہی سے میرا سانس رکنے لگتا ہے۔ غور کیجئے کہ ضرب المثل کا مقصد دوسروں کا تمسخر اڑانے اور ان کی آواز کو دبانے کے علاوہ اور کیا ہے؟ ضرب المثل کی ترکیب میں "ضرب" کا بولتا ہوا لفظ بجائے خود اس کی تشدد پسند ذہنیت کا غماز ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں خدا نے چار الہامی کتابیں نازل کیں وہاں ایک "ڈنڈا" بھی اتارا۔ ڈنڈا —— جو ہزاروں برس کے استعمال کے بعد گھس پٹ کر "ضرب المثل" میں ڈھل گیا۔ چنانچہ بظاہر تو ضرب المثل پھولوں سے لدی شاخ کے مانند ہے۔ لیکن پھولوں کو اتار دیجئے تو نیچے سے ایک بے رحم ننگی سی چھری برآمد ہو جاتی ہے۔ چھری —— جس کی مدد سے سماج کا گلہ بان ہر بھٹکی ہوئی بھیڑ کو ہانک کر دوبارہ گلے میں شامل کر لیتا ہے۔ ضرب المثل کا ورد کرنے والے کی آنکھوں میں جو شدید سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے، اس کے لہجے میں جو تمسخر اور تحکم جنم لیتا ہے اور اس کے الفاظ میں جو خفگی، تہدیدی انداز اور احساس برتری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ میں تو اس کے تصور ہی سے کانپ اٹھتا ہوں :-

لوک گیت کی طرح ضرب المثل کے خالق کا بھی آج تک کسی کو حسب نسب معلوم نہیں ہو سکا۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ جب ساون کی گھنگھور گھٹائیں امڈ امڈ کر آتی ہیں۔ پپیہے درختوں میں اور شاعر مشاعروں میں شور مچاتے ہیں، جب عاشق عمل کے کرتے کے ازلی و ابدی چاک کو رزی کے مشورے سے بڑا کر لیتے ہیں اور اکسپورٹ امپورٹ کے کاروبار میں مندے کا رجحان پھیل جاتا ہے تو شہر کے شور و غل سے بہت دور کسی پہاڑ کے دامن یا ندی کے کنارے، یا کپاس کے کھیت میں پیر فرتوت اپنے تخیل کو مہمیز لگا کر یا اجتماعی ذہن کو ٹٹول کر ضرب المثل کا ایک پرانا کرم خوردہ نسخہ نکالتا ہے۔ پھر آناً فاناً پھول کی خوشبو کی طرح یہ ضرب المثل چہار اکناف میں پھیل جاتی اور ہر ٹیکسی ڈرائیور کے ہونٹوں پہ تھرکنے لگتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بوڑھا بھی تو کوئی گوشت پوست کی ہستی نہیں بلکہ سوسائٹی کا وہ عمر رسیدہ ذہن ہے جو فرد کی انفرادیت کے عمل کو ہمیشہ بڑی حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ ادھر کسی ذہین نوجوان نے

تخلیق دباؤ کے تحت کوئی نیا دھندا شروع کیا، وزن اور بحر سے بے نیاز کوئی آزاد نظم لکھی، کسے کسائے لباس میں کوئی نئی پگڈنڈی اختیار کی یا خیال کا کوئی نیا پیکر تراشا اور ادھر سوسائٹی کا بابا ضرب المثل کا ڈھنڈا انات میں لئے آدھمکا اور نوجوان کو تمسخر، تحکم اور رجاحت سے پسپا کرنے لگا۔ میں کہتا ہوں ضرب المثل تو وہ مائیکروفون ہے جس کی مدد سے سوسائٹی اپنی آواز کو دس گنا بڑھا کر پیش کرتی اور یوں ان بہت سی ننھی منی ہنسی اور شیریں آوازوں کو دبا دیتی ہے جو اس کے پروں کے نیچے سے نکلے ہوئے چوزے پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ضرب المثل کی ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ بے شک اس کی آواز، بہت بلند پرشکوہ اور گمبھیر ہے۔ تاہم سوسائٹی کے عمر رسیدہ ذہن نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ یہ آواز اس کے علاوہ مسحور کن بھی ہو اور اس میں نغماتی لوچ بھی پیدا ہو کہ ہر سننے والا اس کی طرف پروانہ وار کھنچا چلا آئے۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ ہر ضرب المثل میں ایک صوتی حسن ہوتا ہے اور اس کی شعری کیفیت اور نغماتی زیر و بم سننے والے کی حسیات کو تھپک تھپک کر میٹھی نیند سلا دیتا ہے مجھے ذاتی طور پر تو مرغی کی آواز نے کبھی متاثر نہیں کیا۔ لیکن جب وہ ایک خاص انداز سے "کڑاک کڑاک" کا دلکش نغمہ بلند کرتی ہے تو صحن میں بکھرے ہوئے چوزے برق رفتاری سے لپک کر اس کے قدموں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال ضرب المثل کا ہے کہ یہ سوسائٹی کے باغیوں کو ایک ایسے نغماتی زیر و بم میں اسیر کر دیتی ہے کہ وہ کچے دھاگے سے بندھے اس کی جانب کھینچے چلے آتے ہیں۔ چنانچہ آپ شاید حیران ہوں کہ ضرب المثل کی کڑاک کڑاک سنتے ہی میری تمام فلسفیانہ موشگافیوں اور راز بہ کئے ہوئے دلائل کو گویا سانپ سونگھ جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ضرب المثل تو ایک دلکش لوری ہے اور اس کے ہوتے ہوئے میری ذہنی اپج یا اضطراری کیفیت قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتی اسی لئے مجھے ضرب المثل سے چڑ ہے کہ یہ میری ذات میری انفرادیت کی نفی کر کے مجھے انبوہ کا ایک جزو بننے پر مجبور کرتی ہے اور آپ جانتے ہیں۔ میں بھٹکی ہوئی

بھیڑ تو کہلا سکتا ہوں لیکن "گلے" کی ایک اندھی بہری بھیڑ کا منصب —— مجھے کسی صورت بھی قبول نہیں۔ کیا آپ کو قبول ہے ؟ ——

ہاجرہ مسرور

اسٹینڈرڈ

خانساماں صاحب نے باہر سے آ کر خبر دی "جناب ادھر پانی ٹھنڈا کرنے کی اتنی بڑی مشین بھی ہے مزے سے کھانا پکایا اس میں رکھ دیا۔ اب چاہو آٹھ دن بعد کھاؤ کوئی چیز نہیں سڑے بسے گی۔ جناب عجیب چیز ہے"

"ہاں معلوم ہے تمہیں کیا فکر پڑ گئی اس کی" بیگم ریاض نے کتاب پر سے آنکھیں اٹھائے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔

"بڑا آرام رہتا ہے حضور۔ ان کے خانساماں نے اکٹھا تین دن کا سبزی ابھی خریدی ہے میری آنکھوں کے سامنے۔ اور جناب اتنا بہت سا ہی اور دو مرغیاں" خانساماں صاحب بدستور انہیں مرعوب کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

"اچھا اچھا! اب کچھ پکاؤ گے بھی یا یہیں کھڑے رہو گے" بیگم ریاض جھلا کر بولیں اور خانساماں اس موٹی کھال کی مالکن پر دل ہی دل میں افسوس کرتے کمرے سے نکل گئے بیگم ریاض نے پھر کتاب میں جی لگانے کی کوشش کی۔ لیکن ویرو جمعدارنی جھاڑو اٹھائے کمرے میں داخل ہوئیں تو پوری بتیسی کھلی ہوئی تھی۔

"بیگم صاحب اُدھر ایسی گچھو گچھے (صوفے) والی کرسیاں ہیں۔ اور شیشے والی چھ میزیں۔ اور بیگم صاحب ادھر پورے کمرے کا کالین (قالین) بھی ہے" ویرو جمعدارنی

بھی پڑوس سے آئی تھیں۔
بیگم ریاض نے اپنے ذرا سے قالین کے ٹکڑے پر ایک نظر ڈالی۔ اور تیوری چڑھا کر بولیں۔ "اری تو باتیں بنا رہی ہے۔ اور ابھی تک کام کا ہوش نہیں۔ اور دیکھ آج تو میں نے نیا پڑوس سمجھ کر تجھے ان کے ہاں بھیج دیا۔ آئندہ ادھر کام نہیں کرے گی۔ کہہ دینا اپنا انتظام کر لیں۔ میں نے اپنے آرام کے لئے تجھے کو اٹھا رکھا ہے۔ اور گھر کرے گی تو ہمارا کام پڑا رہے گا۔"
دیر و جمعدارنی نے دیوان کے نیچے سے برش نکالا۔ اور پرانے قالین کو بیدردی سے رگڑنے لگی۔ بیگم ریاض برآمدے میں پڑی ڈھیلے بید کی کرسی پر پڑ کر دو بارہ کتاب پڑھنے لگیں۔ لیکن قرار تو عنقا تھا۔ مائی جانو منے کو اٹھا کر آ بیٹھ تو وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئیں۔ اور زور زور سے جھنجنا بجانے لگیں۔ بیگم منہ سخت کئے کتاب پر نظر گڑوئے رہیں۔ وہ مائی جانو کے باتونی پن سے سخت عاجز تھیں۔ اسی وقت مائی جانو نے منے کو گود سے اتارنے کی کوشش کی۔ اور وہ اترنے پر راضی نہ ہوا۔
"اے مار کے تھکائے دیتے ہو منے بابو" مائی جانو بولیں۔ پھر بھی بیگم ریاض نے نظر نہ اٹھائی تو مائی جانو بڑبڑانے لگیں۔ "پڑوس کی آیا پچاس روپیہ لیوے ہے۔ اور شام کو چھ بجے چھٹی کر کے اپنے گھر چلی جاوے ہے۔ ایک ہم ہیں کہ تیس روپیہ پہ پڑے ہوئے ہیں پانچ سال سے۔"
بیگم ریاض کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ مگر انہوں نے مائی جانو پر صرف آنکھیں نکالیں زبان سے ایک لفظ نہ بولیں۔ کمبخت آیائیں ملتی نہیں اور ڈیڑھ ہزار میں کوڑی نہیں بچتی جو ہنگی آیا رکھیں۔ مائی جانو کے طعنے کے سامنے کچھ بن نہ پڑا تو منہ تھتھا کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں۔ جہاں فرش پر بچھا ہوا اونی گبھا انہیں بہت پرانا اور بدرنگ نظر آیا۔ اور اس میں بھی قصور نوکروں کا دکھائی دیا۔ خانساماں جوتے پہن کر اس کمرے میں حساب دینے آتا ہے آیا باہر کے مٹی بھرے پاؤں صاف کئے بغیر اندر لاتی اور جمعدارنی ٹھیک سے برش نہ کرتی بیگم ریاض کا دم مارے غصے کے گھٹنے لگا۔

بکمبخت لالچی بڑھیا! نام تیس روپے کا لیتی ہے۔ اور میں جتنا دیتی ہوں۔ حساب کرو تو ساٹھ روپیہ مہینہ بنتا ہے۔ ایک خود، ایک اس کا بڈھا اور ایک پوتا۔ تین کا کھانا پینا اس پر کوارٹر مفت، کہنے کو پوتا بچہ ہے۔ پیٹ میں یہ لمبے لمبے کینچوے۔ دو کی خوراک تو وہی ننھا کھاتا ہے۔ کینچوے مرنے کی دوائیں الگ منگواؤ۔ عید بقرعید جوڑا الگ دو پھر بھی پڑوس کی آیا کی تنخواہ پر آنکھیں پھٹتی ہیں بڑھیا کی۔

بیگم ریاض منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہیں اور پھر جانے کب اونگھ گئیں۔ جاگیں تو دوپہر ہو چلی تھی۔ سورج کا رخ مڑ جانے سے بیڈ روم میں روشنی کم ہو چلی تھی۔ اس لئے انہیں زمین پر بچھے ہوئے گبھے کا رنگ خاصا اچھا لگا۔ ہلکی سبز دیواروں اور ہرے پردوں نے ان کے ذہن پر پھر ہمیشہ جیسی پر امن مطمئن زندگی کی جھلک ڈالی۔ زندگی جو ان کی تھی۔ گھر جو انہیں کبھی برا نہیں معلوم ہوا تھا۔ جہاں بیٹھ کر وہ کتابوں میں مگن ہو جاتیں۔ اور دنیا کے حسین مستقبل کے خواب دیکھا کرتیں۔ اس وقت بھی وہ اسی موڈ میں اٹھ کر کھانے کی میز پر گئیں۔ میز پوش اتنا صاف نہ تھا۔ لیکن انہیں ضرورت سے زیادہ صاف میز پوش دیکھ کر ہوٹل یاد آتا تھا۔ اور ہوٹل گھر نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ مزے سے کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔ اور پلیٹ میں سے تلی ہوئی مرچ اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگیں۔ اور انہیں وہ دن یاد آئے جب ان کے ابا جان چل بسے اور ساری شان و شوکت اڑا اڑا دھم ہو گئی چند ہی برسوں میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ محض نمک لگا کر تلی ہوئی مرچ کے ساتھ روکھی کھانا بھی نعمت معلوم ہونے لگا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بیگم ریاض اب سب کچھ پا کر بھی دنیا کی ٹیم ٹام کی طرف سے قطعی لاپرواہ ہو گئی تھیں۔

مگر خانساماں صاحب کو بیگم ریاض کی یہ لاپرواہی کھل رہی تھی۔

"جناب صبوں (صبح) سے اب تک کئی موٹر والے ملاقاتی آ چکے ہیں۔ دیو لمبی موٹر۔ ایک سے ایک بڑھیا" خانساماں صاحب نے تازہ ترین خبر سنائی۔

بیگم ریاض کو لگا جیسے خانساماں صاف کہہ رہا ہو۔ کہ کیا خاک افسر اب آپ کے صاحب ہفتوں میں کوئی موٹر والا ملاقاتی کوٹھی میں نہیں آیا۔

"ہوں !" بیگم ریاض اپنی 'ہوں' کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہوگئیں۔ کہ واقعی ان کے میاں کی دوستی "بے موڑے" لوگوں سے زیادہ ہے۔ اب وہ خانساماں کو کیا سمجھاتیں کہ یہ ان کے ملنے والے کتنے بڑے، کتنے اچھے اور کتنے مشہور لوگ تھے۔

پھر بھی جانے کیوں پڑوس کے ذکر پر کھانا ان کے لئے زہر ہوگیا۔ ویسے سب چیزیں تھیں بھی بدمزہ۔ آلو کے کباب جلے ہوئے تھے۔ مٹر بہت کم گھی میں تلے گئے تھے اور دال میں پانی زیادہ تھا۔ دو چار نوالے مار کر بیگم ریاض نے پھلوں کی طشتری اٹھائی ایک آدھ ناشپاتی کا ٹکڑا اٹھایا تھا کہ خانساماں صاحب بولے۔

"حضور! آپ کی صحت ٹھیک نہیں۔ جناب پھلوں کی مشین میں رکھ کر ٹھنڈا کر لو اور پھر کھاؤ تو پھل بڑا طاقت ور ہو جاتا ہے۔"

اور بیگم کا چڑھتا ہوا غصہ "طاقت ور پھل" کے تصور پر مرکوز ہو گیا۔ طاقتور پھل جو ہو بہو ماء اللحم کے اشتہار والی تصویر تھا" یہ موٹے موٹے رگ اور پٹھے والی ناشپاتی اور بیگم ریاض اسی تصور پر ایک دم بے قابو ہو کر ہنس پڑیں۔ اگر وہ اس وقت ہنس نہ پڑتیں تو ڈر تھا کہ رو پڑتیں۔ اب یہ کیا مصیبت تھی کہ اچانک ان کا مقابلہ نئے پڑوس سے ہونے لگا۔ مقابلہ بھی شان و شوکت کا ؟ اور یہ ڈنگل منعقد کرا رہے تھے ان کے نوکر۔

"سچ ہے ذہنیت اس طرح نہیں بدلتی جب تک سارا ماحول ہی نہ بدل جائے" بیگم ریاض نے سوچا۔ وہ اپنے نوکروں کو برابری سے بات کرنے کا موقع دیتی ہیں۔ اسی لئے تو وہ نئے پڑوس کے مقابلہ میں انہیں کمتر سمجھ رہے ہیں۔

پھر ایک چور لہر ان کے دماغ میں سے گزری۔ شاید وہ ہیں ہی کمتر۔ جب شادی ہوئی ان کے میاں کی آمدنی سات سو تھی۔ اس وقت وہ کوئی کپڑا خریدنے لگتیں۔ تو دس بار سوچتیں کہ اس ماہ کون کون سے خرچ گھٹانا پڑیں گے۔ بارہ سال بعد ان کے ہاں کی آمدنی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ مگر اب بھی ایک فالتو خرچ کے لئے دوسرے کئی ضروری خرچ کم کرنا پڑتے۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ کچھ جمع کرنے کا شوق ہو۔ بچتا تو کچھ

کرتیں بلکہ کئی برسوں سے خود بھی کالج میں فلاسفی پڑھاتیں اور وہاں سے جو ملتا وہ بھی خرچ ہو جاتا۔ ان کے نزدیک روپے سے اچھا تو گھر کا کوڑا تھا جو روز اٹھا لیا جاتا تو ہفتے کے ہفتے کوڑے کے ڈرم سے ابل پڑتا مگر روپیہ بارہ سال پہلے کے بنے ہوئے پرانے معیار کو قائم رکھنے ہی میں بھسم ہو جاتا۔

پرانی پڑوسن کبھی ان کے گھر آتیں تو یہ پوچھے باز نہ رہ سکتیں کہ "کہئے آپ نے ریفریجریٹر لیا یا نہیں؟" اور بیگم ریاض ہمیشہ سعادت مندی سے یہی جواب دیتیں کہ "ابھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔"

نے لیجیے۔ بڑا آرام ہو جاتا ہے اور یہ نہیں تو موٹر ضرور خرید لیجیے۔ روزانہ ٹیکسی میں آپ لوگوں کے کتنے روپے اٹھ جاتے ہوں گے؟" پرانی پڑوسن ہمیشہ محبت سے یہ مشورہ دیتیں۔ گویا دو ہزار نہیں خرچ کرنا چاہتیں۔ تو بہتر ہے کہ پندرہ ہزار خرچ کر ڈالو۔

اب بیگم ریاض بے چاری مروت کی ماری بھلا یہ کیسے کہہ سکتی تھیں کہ ہاں اگر پانچ دس روپیہ روز کی قسط پہ کوئی موٹر مل سکے تو ضرور دلوا دیجیے۔ مگر وہ زبان سے صرف یہی جواب دیتیں۔

"ارے زندگی صرف موٹر کا نام تو نہیں، ہمارے ملک کے کروڑوں لوگ بس کا کرایہ بھی نہیں خرچ سکتے اور پھر انسان خود کو مشینوں کا اتنا محتاج کیوں بنائے۔"

اور بے چاری پرانی پڑوسن بڑی ہمدردی سے سر ہلا کر ٹھنڈی سانس لیتیں۔ ویسے پرانی پڑوسن نے سب میں ڈٹ کر مشہور کر رکھا تھا کہ کمبخت بیگم ریاض بڑی کنجوس ہے زیور ان کے پاس نہیں دیکھا۔ گھر میں وہی بارہ سال پرانا فرنیچر۔ موٹر وہ نہیں۔ زمین انھوں نے خریدی نہیں بینک بھرتی ہیں۔

اور بیگم ریاض نے اس بھرم کو بھی نہ رہنے دیا۔ ہر ملنے جلنے والے کو معلوم تھا کہ ان کا بینک بیلنس میاں کی چند تنخواہوں سے زیادہ نہیں بڑھتا۔

لیکن اس کے باوجود بیگم ریاض کے گھر میں آمد اماں تھا۔ ان کا خانساماں پرانی

پڑوسن کے خانساماں سے پانچ روپیہ زیادہ تنخواہ پاتا۔ اور کام کم کرتا۔ آیا پڑوس کی آیا سے خود کو خوش قسمت سمجھتی۔ جمعدارنی تنخواہ کے ساتھ مفت کوارٹر پا کر پھولے نہ سماتی کیونکہ پرانی پڑوسن کوارٹر کا کرایہ جمعدارنی کی تنخواہ سے کاٹ لیتی تھیں۔ اور مالی بیگم ریاض کی خوش ذوقی اور نرم مزاجی سے خوش ہو کر بیس روپیہ ماہوار پر بھی گھنٹہ آدھ گھنٹہ جی لگا کر ان کے باغ کی دیکھ بھال کرتا۔

لیکن نئی پڑوسن نے پڑوس میں قدم رکھتے ہی ان کے گھریلو امن و امان کو تلپٹ کر دیا۔ یہ بالکل عملی شکل تھی۔ کہ جب گھر کے نوکر پڑوس کی خوش حالی سے اتنے متاثر ہو جائیں تو کام کیسے چلے! بیگم ریاض اپنے خانساماں کے سامنے ریفریجریٹر سے نکلی معدنی ماء اللحم کے اشتہار جیسی پہلوان ناشپاتی پر ہنستے ہنستے خود کو بڑا بے بس محسوس کر رہی تھیں۔

آخر انہوں نے سنجیدہ ہونا مناسب سمجھا۔ "دیکھو میاں، دنیا میں موٹر اور ریفریجریٹر ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔" بیگم ریاض نے خانساماں کو سمجھانا چاہا۔

"جی جناب! پھر اور کیا کیا ہوتا ہے"۔ خانساماں نے بڑے ادب سے پوچھا اور اپنے کندھے سے جھاڑن اتار لیا۔ لیکن خدا جانے کیوں اس سادہ سے سوال پر بیگم ریاض کا فلسفیانہ موڈ ایک دم بدل گیا۔

"تمہارا سر۔ وہ غصہ دباتے دباتے بھی بول پڑیں۔

"جی جناب"! خانساماں نے کچھ سننا چاہا۔

"میں کہہ رہی تھی کہ تمہارے پاس بنگلہ نہیں۔ نوکر نہیں۔ پھر بھی تم اپنی ذات کے کتنے اچھے، کتنے شریف آدمی ہو۔ دنیا میں اصل چیز انسان کی ذات ہے۔ باقی —"

ہاں جناب کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ میری ذات شیخ قریشی ہے۔ اچھی کیوں نہیں ہوگی"۔ خانساماں صاحب جلدی سے بیگم ریاض کی بات کاٹ کر بولے اور شکر ہے کہ بیگم ریاض پھر ہنس پڑیں۔ اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال گفت و شنید بند کی جائے۔ وہ میز سے اٹھنے لگیں تو مائی جان منے کو لئے کھانے کے کمرے میں داخل ہوئیں منے کے ہاتھ میں مرغی کی